اردو غزل

انتخاب

۱۹۷۶—۷۷ء

اکادمی ادبیات پاکستان

اسلام آباد

اہتمام اشاعت	اکادمی ادبیات پاکستان
بحوالہ نمبر	پی اے ایل / ایس - ۱ / ۷۹
ناشر	میسح الدین احمد صدیقی
	ڈائرکٹر جنرل اکادمی ادبیات پاکستان
سرورق	اسلم کمال
طباعت	پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان پریس اسلام آباد
سن اشاعت	اگست ۱۹۸۰ء
تعداد	
	۱۵۰۰
قیمت	

اظہارِ تشکّر

اکادمی پاکستان کے قومی کمیشن برائے یونیسکو کی شکر گزار ہے کہ
جس کی اعانت سے یہ انتخاب شائع ہوا۔

اُردو غزل

انتخاب: ۷۶-۱۹۷۵ء

ترتیب

پیش لفظ

غزلوں کا یہ مجموعہ حاضر ہے کوشش کی گئی ہے کہ عہدِ حاضر کی غزل گوئی کے جتنے رخ ہیں وہ اس مجموعے کے مطالعے سے آپ کے سامنے آجائیں اور آج کی غزل کا مزاج سمجھنے میں مدد مل سکے۔ غزلوں کا انتخاب انتہائی دشوار اور نازک کام ہے۔ اس میں انتخاب کرنے والے کا مزاج، مذاق اور پسند بھی شامل ہو سکتی ہے اور اس طرح بعض اچھی غزلیں نظر انداز ہو سکتی ہیں اور بری غزلیں مجموعے میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ پھر بھی انتخاب کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

انتخاب کی ذمہ داری اور دشواری کے پیش نظر اس مجموعے کو مرتب کرتے وقت ہماری دقتوں کا تصوّر بھی آسان نہیں ہے ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ انتخاب ایسا ہو کہ پڑھنے والے کو عہدِ حاضر کی غزل گوئی کی ایک مجموعی فضا میں پہنچا سکے۔

اس انتخاب کی غزلوں کی فضا اپنے عہد کے انفرادی اور اجتماعی رجحانات سے متعین ہوئی ہے اس میں ابہام اور تشکیک کا دھندلکا بھی ہے اور واضح خیالات کی پھیلتی ہوئی کرنیں بھی ہیں۔ اس میں امید اور ناامیدی، خوشی اور غم، بے دلی اور حوصلہ مندی، آنسو اور مسکراہٹ اضطراب اور سکون، خود فراموشی اور خود شناسی، بے جہتی اور جہت طلبی، راہ، راہرو، راہبر اور منزل سب کی داستان موجود ہے۔

ہماری قدیم غزل گوئی تصوّف، حسن وعشق اور اخلاقیات سے زیادہ مانوس تھی یہ روایات آج بھی زندہ ہیں۔ ان روایات نے غزل کو شیرینی، نرمی، دلسوزی اور دلنوازی عطا کی ہے۔ البتہ آج کی غزل کے محاوروں اور استعارات میں کچھ تبدیلی ہوگئی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم اور قیام پاکستان نے اردو شاعری کو نئی وسعتوں، خیالات، محسوسات اور زاویوں سے آشنا کیا۔ تصوف جو پہلے "برائے شعر گفتن خوب است" سمجھا جاتا تھا۔ اب ایک نئے قالب میں ڈھل چکا ہے۔ یہ ذات سے صفات اور صفات سے ذات تک کا سفر بن گیا ہے یہ ذات تنہائی ہے۔ جسم اور خون کی سرگوشی ہے آلامِ روزگار سے پناہ ہے۔ خاموشی کی گفتگو اور گفتگو کی خاموشی ہے۔ یہ اس چیز کی جستجو ہے جس کو حقیقت کبریٰ کہہ سکتے ہیں۔ دراصل یہ ایک قسم کے تصوّف کی آواز ہے، اس آواز میں اضطراب اور تشنّج ہے۔ دکھ ہے زخم ہے اور مرہم کی تلاش ہے۔

ایک اور نمایاں رجحان ہماری غزل میں آچکا ہے سیاست تصوّف کی جگہ لیتی جارہی ہے نئی غزل بظاہر ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اخلاقیات سے رشتہ توڑ کر اس نئے اخلاقی پروگرام کو اپنا رہی ہے جو سیاست کے تحت آہستہ آہستہ سامنے آرہا ہے غزل میں سیاسی اخلاقیات کی آمد کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہمارے قدما نے ظلم سے نفرت دلانے اور ظالم کو عبرت کا سبق سکھانے کے ہزاروں شعر کہے ہیں۔ اسی نوع کی کوشش ہماری جدید غزلوں میں نظر آتی ہے۔ البتہ اس کوشش پر عہدِ نو کے اندازِ فکر کی چھاپ موجود ہے۔

اسی قسم کے مختلف انفرادی اور اجتماعی رجحانات ہم کو عہد حاضر کی غزل میں نظر آئیں گے لیکن غزل کی وہ امتیازی خصوصیت جس کی وجہ سے وہ عوام وخواص سب کے دلوں کی دھڑکن بن گئی ہے آج بھی برقرار ہے بلکہ اس میں ایک لحاظ سے زیادہ گہرائی اور گیرائی آگئی ہے یہ خصوصیت اس کی عشق پروری اور حسن پرستی ہے۔ ہر دور کی غزل "حکایت مہر و وفا" سناتی رہی ہے۔ یہ حکایتِ مہر و وفا بڑی لذیذ ہے اسی لئے یہ بڑی دراز ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

غزل یادوں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے یہ بیتے ہوئے دنوں، جاگتے شبستانوں، بجھتی شمعوں، جلتے پروانوں کی یاد ہے۔ یہ ملاپ اور جدائی کے کبھی نہ فراموش ہونے والے لمحوں کی یاد ہے اس میں ایک لمحہ کبھی صدیوں میں بدل جاتا ہے کبھی صدیاں سمٹ کر ایک لمحہ بن جاتی ہیں یوں تو غزل بڑی نازک لطیف اور حساس صنف ہے مگر یہ سخت جان بھی بہت ہے۔ اس نے نظموں کی یلغار سہہ لی۔ نقادوں کی تلخ نوائی برداشت کرلی۔ تہی دامنی، پریشاں فکری اور تنگ ظرفی کے طعنے سکون سے سنتی رہی ہے۔ مگر اپنی تمام نزاکتوں، لطافتوں اور بظاہر محدود گنجائش کے باوجود اس کی بلاغت، رمزیت اور گیرائی زمانے کے سرد و گرم کا ساتھ دیتی رہی غزل نے ہر عہد میں اپنی وضع داری کو قائم بھی رکھا ہے اور اس کے مطالبات کا ساتھ بھی دیا ہے۔ صنفی اعتبار سے اس کی گفتگو کا انداز بالکل مختلف ہے...... یہ محبت سے زندہ ہے محبت کو زندہ رکھتی ہے اور محبت کی ہی زبان میں گفتگو کرتی ہے..... یہ انسان پر فریفتہ ہے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

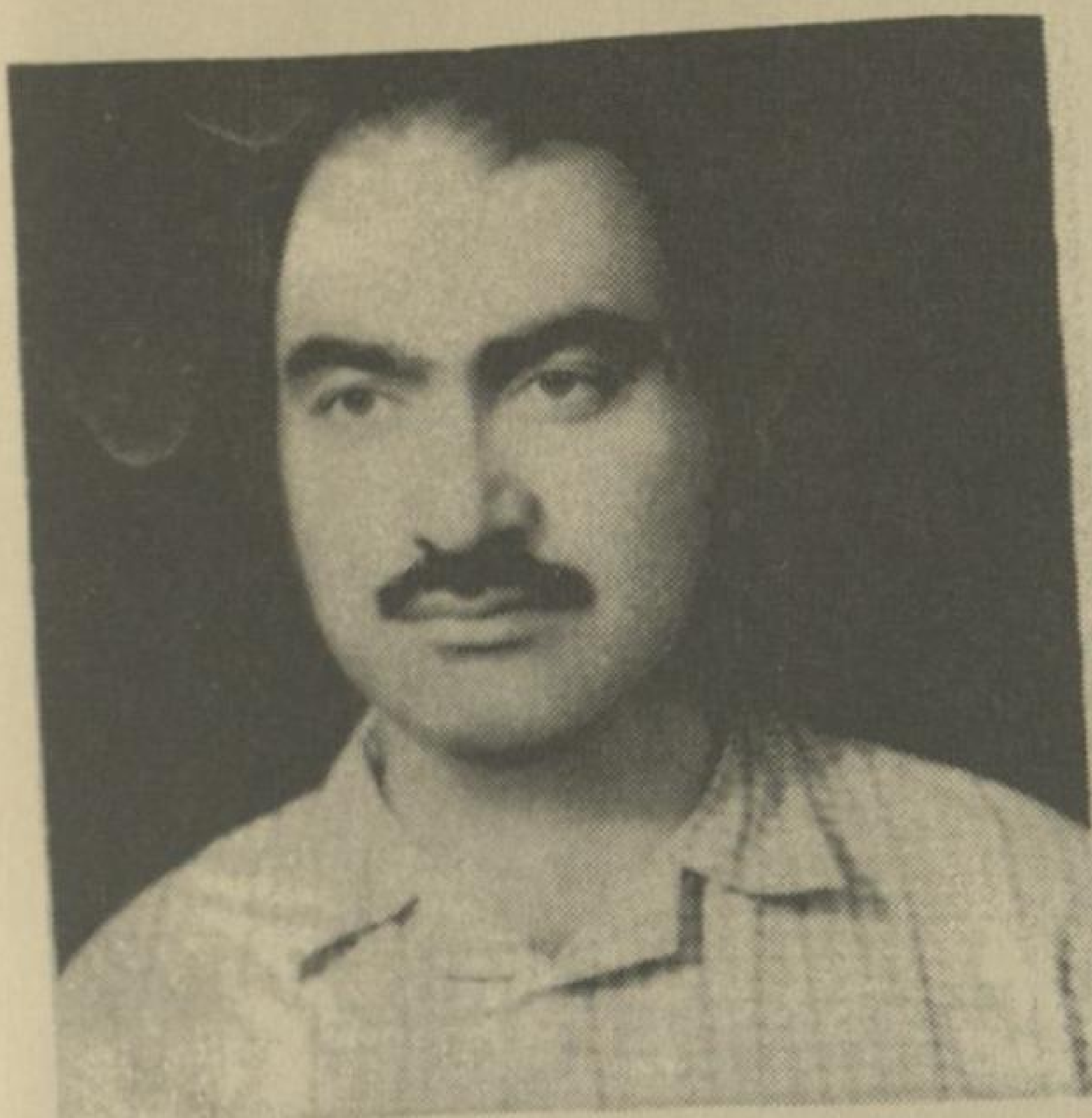
آج بھی یہ انسان ہی پر فریفتہ ہے اس لئے آج بھی زندہ اور توانا ہے نظموں اور غزلوں میں کوئی صنفی مقابلہ نہیں ہے۔ دونوں کی راہیں اور طریقۂ کار جدا جدا ہیں۔ نظم کی تفصیل اور غزل کے اجمال نے مل کر ہماری اردو شاعری کو وسعت اور گہرائی دونوں بخش دی ہیں۔ نظم کی قوتِ گویائی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ لیکن غزل کی کم سخنی کچھ کم اثر انگیز اور دل پذیر نہیں ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آج کے دور کے

ممتاز نظم گو شعراء غزل کی وجہ سے بھی جانے پہچانے اور مانے جاتے ہیں۔

یہ مجموعہ ممکن ہے آپ کے واسطے ایک ایسا "رفیق" ثابت ہو سکے۔ جو "خالی از خلل" ہو۔ اگر ایسا ہوا تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی۔ اسے گل صد برگ سمجھیے ..... ایسا پھول جس کی ہر پنکھڑی ایک الگ رنگ رکھتی ہے مگر ہر پنکھڑی کی مہک ایک ہی ہے۔ یہی مہک آج کی غزل ہے۔

غزلوں کا انتخاب ایک کٹھن اور محنت طلب کام تھا لیکن محترمہ ادا جعفری، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی اور مسیح الدین احمد صدیقی نے میرا ساتھ دیا۔ ڈاکٹر کشفی نے بعض ایسے شعرا کا اضافہ کیا جن کی شرکت اس انتخاب کو نمائندہ بنانے کے لئے ضروری تھی۔ اور یہ کام مکمل ہوا اب انتخاب کی اس رسوائی میں یہ بھی برابر کے شریک ہیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں اور ساتھ ہی ساتھ پروفیسر توصیف تبسّم اور اکادمی کے عملے کا بھی جنہوں نے مسوّدہ کی تیاری اور ترتیب و تدوین میں بے مثال تعاون کیا۔

منیر نیازی



آصف ثاقب

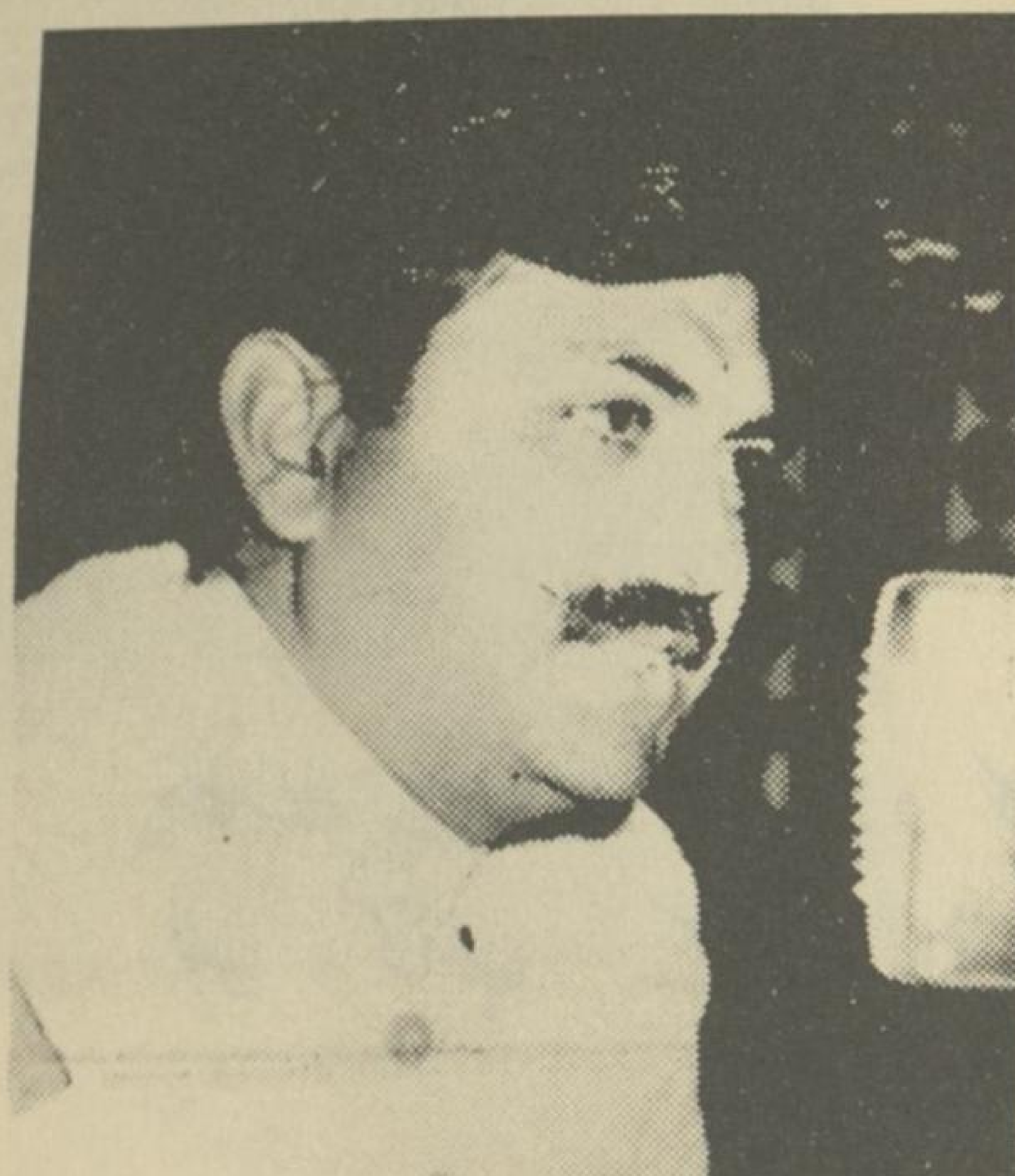
نام محمد آصف خان، ادبی نام آصف ثاقب۔ آپ کا تعلق ہزارہ کے دور افتادہ علاقہ بوئی سے ہے۔ تعلیم گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں مکمل کی۔ اب اسی کالج کے شعبۂ نباتات میں ڈمانسٹریٹر ہیں۔ اردو میں ایم اے بعد میں کیا۔

شاعری کی ابتدا اسکول ہی کے زمانہ سے ہوئی۔ بعض احباب کبھی کبھار آپ کے کلام پر عدم موزونیت کا الزام عائد کرتے تھے، چنانچہ انہی الزامات نے آپ کو علمِ عروض کے باقاعدہ مطالعہ پر آمادہ کیا۔ اس سلسلہ میں کئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا۔

آصف ثاقب، غزل، نظم، قطعہ اور رباعی سب ہی اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ آپ کی تخلیقاتِ نظم و نثر ملک کے معیاری ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مجموعۂ کلام ابھی طبع نہیں ہوا ہے۔

آصف ثاقب

مطالعے میں جہاں درد کا اثر آیا
لہو کتاب کے اوراق پر اتر آیا
پلک جھپکتے ہی نقشہ بدل گیا کتنا
نظر کے سامنے گھر کی جگہ کھنڈر آیا
بڑھوں جو تھک کے تو شاخیں سمیٹ لے اپنی
کڑے سفر میں جہاں بھی کوئی شجر آیا
رواج نکلا ہے ذلّت پہ جشن کرنے کا
پر احتجاج کا الزام میرے سر آیا
فنِ سپاس گزاری سے نابلد ہی رہا
منافقت کا نہ کوئی مجھے ہنر آیا
بدن پہ موج کی تلوار پہلے چلتی رہی
کٹے جو ہاتھ تو یلغار کو بھنور آیا
تمام عمر مرادوں کی جستجو میں کٹی
تھکے جو پاؤں تو پھر موت کا سفر آیا
تمام شب مرے آنسو نہیں تھمے ثاقبؔ
وہ کون تھے کہ میں جن سے بچھڑ کے گھر آیا



آغاز برنی

آغاز برنی ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ شمعون عالم خان آپ کا اصل نام ہے۔ کچھ مدت حیدرآباد میں قیام رہا۔ جس کے بعد آپ لاہور تشریف لائے یہاں آپ کی خوش نصیبی کہ آپ کو حضرت احسان دانش جیسے استاد کا نیاز حاصل ہوا۔ آپ آج کل لاہور ہی میں مقیم ہیں۔ آغاز برنی نے غزل، نظم، گیت، رباعی اور قطعہ تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کی غیر مطبوعہ تصانیف یہ ہیں۔ یادوں کے سائے (گیتوں کا مجموعہ) شین۔ عین۔ را (غزلوں کا مجموعہ) مدینۃ النبیؐ (نعتوں کا مجموعہ) ہندی اردو مترادفات (تحقیق)۔

آغاز برنی

اسلوب تو اچھا ہے غمِ دل کے بیاں کا
آنکھوں سے لیا جائے اگر کام زباں کا

فطرت نے سمجھ سوچ کے سینے میں رکھا دل
درد اور سمانا بھی کہاں سارے جہاں کا!

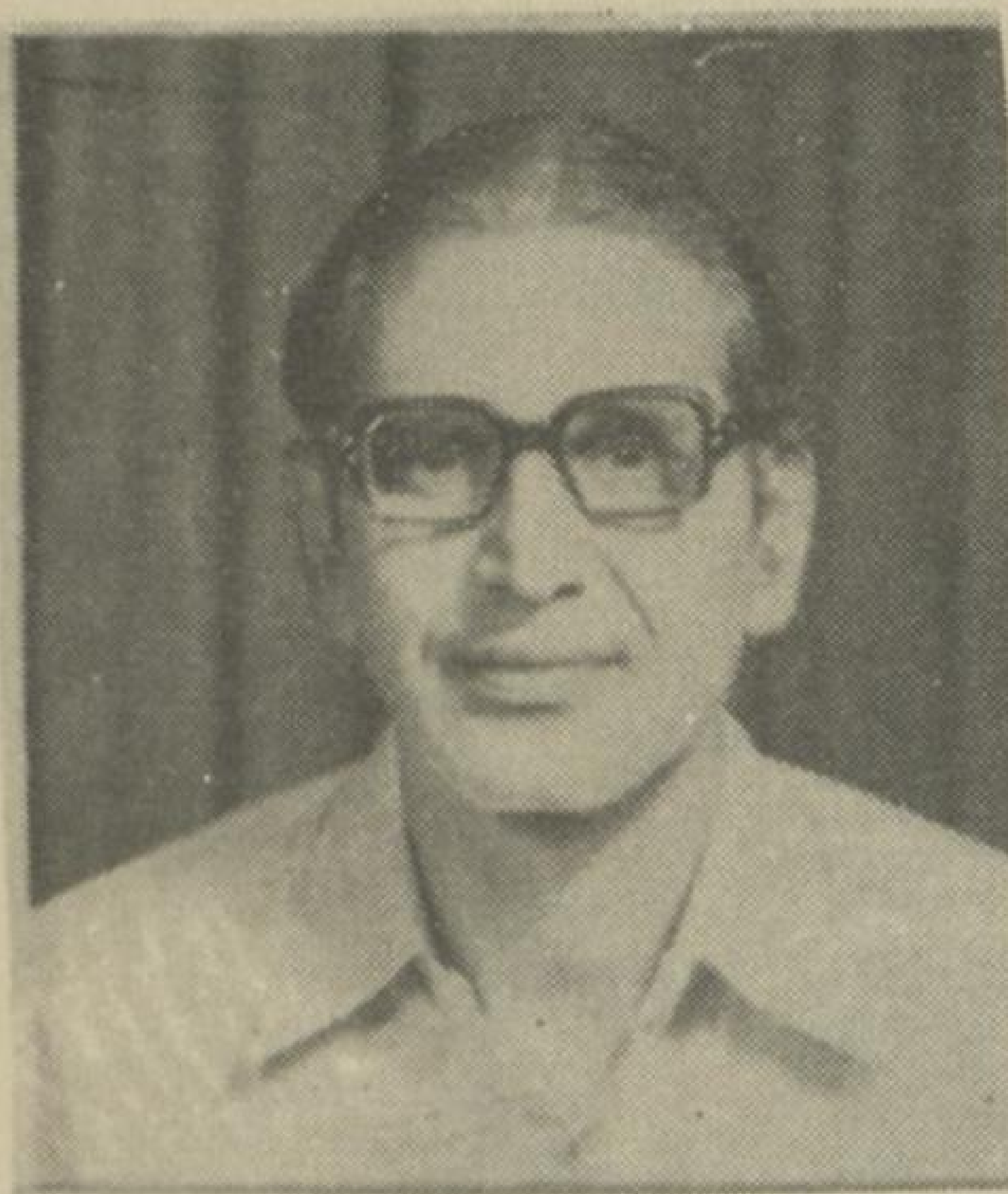
سورج وہ ابھرتے کہ جھلس جاتیں نگاہیں
اچھا ہی ہوا تم نے مرے دل میں نہ جھانکا

صحرا کا سفر دھوپ کڑی پیاس کی شدّت
عالم تھا سمندر کی طرح ریگِ رواں کا

بازار میں لفظوں کے خریدار بہت ہیں
رخ کرتا نہیں کوئی معانی کی دکاں کا

انسان اگر بارِ ہنر دوش پٹک دے
شیرازہ بکھر جائے ترے دونوں جہاں کا

آغاز یہاں دادِ وفا کس سے ملے گی
اس دیس میں کچھ مول نہیں ہے دل وجاں کا



آفاق صدیقی

محمد آفاق صدیقی پورا نام ہے۔ والد کا نام محمد اسحاق صدیقی، آپ ۴ مئی ۱۹۲۸ء کو شیخوپور ضلع فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔

قیام پاکستان کے ۔۔ فوراً بعد، آپ یہاں آ گئے۔ ان دنوں گورنمنٹ ماڈل کالج، میرپور خاص میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔

آفاق صدیقی کی اب تک کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ جن میں کچھ کے نام یہ ہیں:-

قومی و ملّی ترانے، سندھ کی عوامی کہانیاں، تاثرات (تنقیدی مضامین) بابائے اردو وادیٔ مہران میں، ریگزار کے موتی، شاہ عبداللطیف بھٹائی کے منظوم تراجم، عکسِ لطیف (شاہ لطیف کی شخصیت اور شاعری پر تحقیق)، جدید سندھی ادب کے تراجم،

شعری مجموعہ "قلبِ سراپا" کے نام سے طبع ہوا ہے۔

آفاق صدیقی کو ان کی چند تصانیف پر ادبی انعامات اور ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔

آفاق صدیقی

جب تک ترے جمال کی رعنائیاں رہیں
کیا کیا نہ میری حوصلہ افزائیاں رہیں

نظّارہ درمیاں تھا تجھے کیسے دیکھتے
آنکھوں میں کچھ عجیب سی پرچھائیاں رہیں

تجھ سے بچھڑ گئے تو ہمیں جلوتوں میں بھی
سب سے قریب تر تری تنہائیاں رہیں

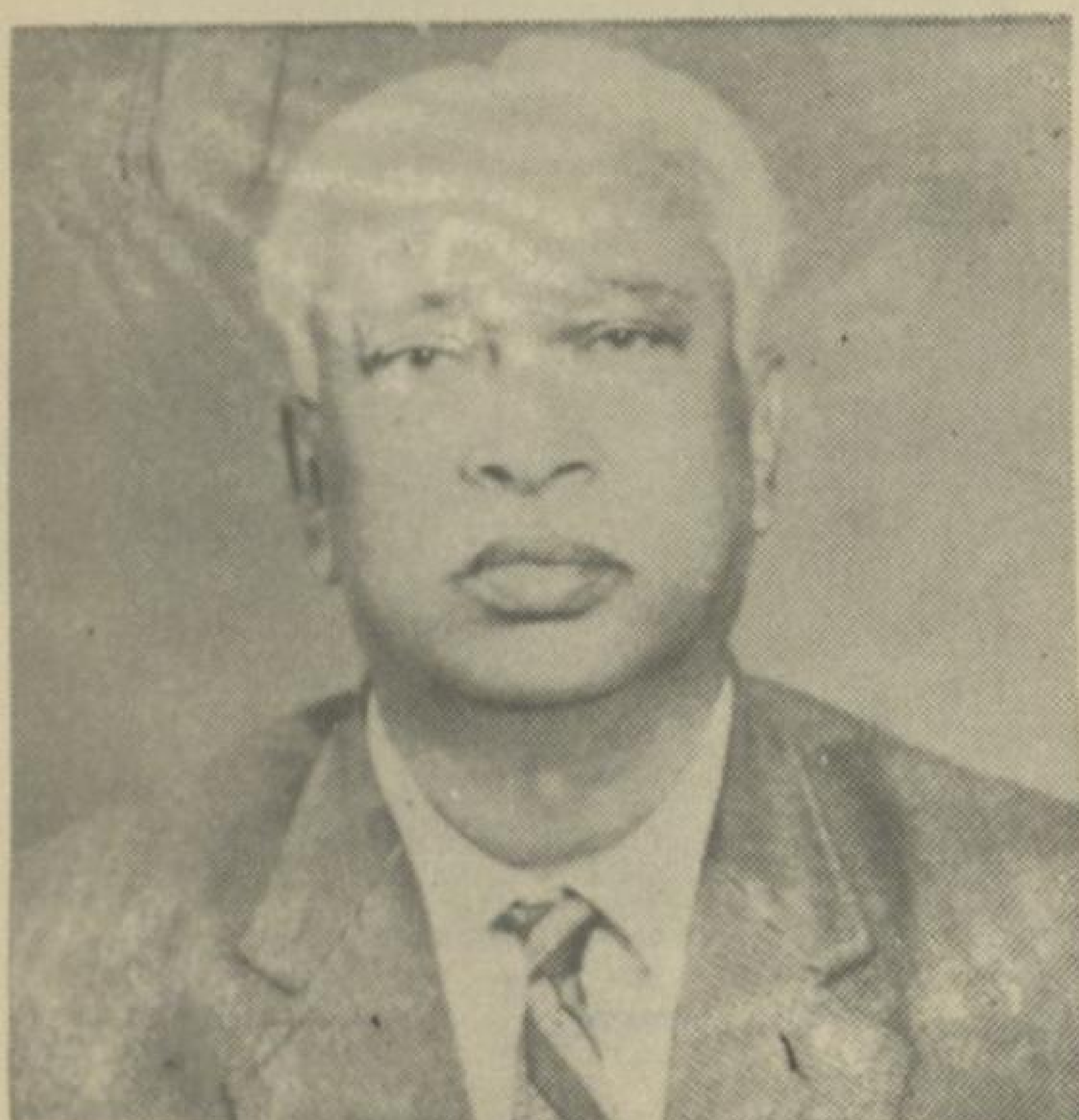
یاد آئی جب کبھی ترے لہجے کی نغمگی
دھیمے سروں میں گونجتی شہنائیاں رہیں

پانی پہ جب بکھر سا گیا چودھویں کا چاند
میری نگاہ میں تری انگڑائیاں رہیں

ممکن ہے خود کو بیچ کے بھی کچھ نہ مل سکے
بازار میں اگر یہی مہنگائیاں رہیں

دنیائے حسن و عشق کا معیار بن گئیں
اہلِ جنوں کے نام جو رسوائیاں رہیں

آفاقؔ وہ نہیں ہے تو کیا رونقِ حیات
کہنے کو لاکھ انجمن آرائیاں رہیں



ابراہیم خلیل

اصل نام شیخ محمد ابراہیم اور تخلص خلیلؔ ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے آپ ڈاکٹر ہیں۔ ابراہیم خلیل کے والد کا نام شیخ محمد یوسف تھا۔ ان کی پیدائش دسمبر ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں میٹرک اور ۱۹۲۵ء میں ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔ ڈاکٹر ابراہیم خلیل کی مادری زبان سندھی ہے۔ چنانچہ اس زبان کے معروف ادیبوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ نظم ونثر دونوں پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کی ہوئی بیشتر کتابیں سندھی زبان کے نصاب میں شامل ہیں۔

شعروسخن سے لگاؤ لڑکپن ہی سے تھا۔ کم و بیش تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ سندھی کے علاوہ اردو میں بھی غزل کہتے ہیں۔

ابراہیم خلیل

ایسی زمین ڈھونڈھ کے لائیں کہاں سے ہم
جاکر جہاں چھپیں ستمِ آسماں سے ہم
رسوا کریں گے عشق کو آہ وفغاں سے ہم؟
دے دینگے جان اف نہ کریں گے زباں سے ہم
جائیں کہاں قفس سے اسیرانِ نیم جاں
واقف نہیں ہیں اب تو کسی آشیاں سے ہم
وارفتۂ جمال بہاراں تو ہو گئے
واقف مگر نہیں تھے مآلِ خزاں سے ہم
دائم نشاطِ دہر کے کھاتے رہے فریب
نالاں نہ تھے ذرا بھی غمِ جاوداں سے ہم
جو کچھ برا بھلا تھا وہ قربان کر چکے
دل اب ادا کے واسطے لائیں کہاں سے ہم
لاکھوں نہاں ہیں خاک میں جب مہر و ماہتاب
قدرِ زمیں کو پوچھتے کیا آسماں سے ہم
مدت سے تیغِ یار کا مشتاق ہے گلو
کیونکر ڈریں خلیلؔ کسی امتحاں سے ہم



ابن الحسن

پورا نام محمد ابن الحسن ہے۔ پیدائش جولائی ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔ آبائی وطن بھاگل پور (بھارت) تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں بھاگل پور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکرٹری کی حیثیت سے تحریک پاکستان میں حصّہ لیا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں کراچی (پاکستان) آئے۔ بعد میں اسسٹنٹ کنٹرولر ملٹری اکاؤنٹس لاہور مقرر ہوئے۔ آج کل اپنے محکمہ کے سربراہ ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ فریضۂ حج ادا کیا۔

۱۹۷۴ء میں پہلا مجموعۂ کلام "جوئے تشنہ" شائع ہوا۔ ان دنوں دوسرا مجموعہ "آبگینہ رنگ" ترتیب دے رہے ہیں۔

ابن الحسن

کھڑکی کھولو کچھ تو یہاں بھی تازہ نرم ہوا آئے
منظر صحنِ چمن کا ابھرے بوٹے درد ربا آئے
بیجاں تن میں جان سی آئے زخمِ تمنّا تازہ ہو
یاد میں رنگ حنا کا لپکے رقص میں بادِ صبا آئے
ماہ گزیدہ رات ہے ساکت جیسے کوئی آئینہ
اوس کے سبزے پر گرنے کی سنّاٹے میں صدا آئے
فصلِ خزاں کے سوکھے پتّے ہانپ رہے ہیں سائے میں
سایہ اپنے تہہ خانوں میں جائے انہیں پہنچا آئے
پہروں دل سے باتیں کر کے چین سے بیٹھے ہیں ایسے
جیسے جو کچھ بھی کہنا تھا دنیا بھر کو سنا آئے
نہر پہ سایہ بار شجر کے جال سے موجیں الجھی ہیں
کوئی حسنؔ اس الجھاوے کو جائے ذرا سلجھا آئے



ابوالاثر حفیظ جالندھری

ملک الشعراء نواب حسّان الملک بہادر ابوالاثر حفیظ جالندھری ہلالِ امتیاز ـــــ کا اصل نام محمد حفیظ رانا ہے، آپ ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو بمقام جالندھر پیدا ہوئے۔ خاندانی لحاظ سے آپ کا تعلق ایک چوہان مسلمان راجپوت گھرانے سے ہے، آپ کی تعلیم کا آغاز مسجد سے ہوا۔ جہاں آپ نے قرآن حکیم ناظرہ پڑھا۔ اسی زمانے میں آپ کو نعت خوانی کا شوق بھی تھا۔ شعر گوئی کا آغاز اسکول ہی کے زمانہ سے ہو گیا تھا۔ باقاعدہ تعلیم صرف ساتویں جماعت تک حاصل کی۔ ابھی آپ کی عمر صرف سترہ برس کی تھی کہ بیت المقدس پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، اس خبر سے متاثر ہو کر حفیظ نے ایک زوردار نظم لکھی جس کی پاداش میں آپ کو حوالات میں رہنا پڑا، اس دوران انکے اہلِ خانہ بھی حکومت کے عتاب کا نشانہ بنتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں حفیظ صاحب نے اپنا ادبی رسالہ "اعجاز" نکالا، ان ہی ایام میں آپ نے ملک الشعرا مولانا گرامی کی شاگردی اختیار کی۔ آپ کو بارہا علامہ اقبال کی حضوری کا شرف بھی حاصل ہوا۔ آپ متعدد علمی و ادبی رسائل کے مدیر بھی رہے۔ جن میں "شبابِ اردو"، ہفت روزہ "تبلیغ"۔ "ہزار داستان"۔ "نونہال"۔ "پھول"۔ "تہذیبِ نسواں"۔ "مخزن" "حمایتِ اسلام" اور "کارزار" کے نام سرفہرست ہیں۔

حفیظ صاحب نے مسلسل اور بے تکان لکھا ہے، شاہنامۂ اسلام اور پاکستان کا قومی ترانہ آپ کے عظیم ادبی شاہکار ہیں۔ قوم نے آپ کو، آپ کی ادبی خدمات کے عوض "شاعرِ اسلام" کا باوقار لقب دیا جو ان کے دوسرے تمام القابات و خطابات سے کہیں بڑھ کر ہے۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

نہ پُوچھو کہ انسان کیا چاہتا ہے
سمجھ لو کہ شیطان کیا چاہتا ہے

نہ جینے سے خوش ہے نہ مرنے پہ راضی
بالآخر مسلمان کیا چاہتا ہے

کوئی ایک ارماں کوئی ایک حسرت
یہ دل ہم سے ہر آن کیا چاہتا ہے

زمیں کا تو پیوند ہوں۔ اس سے آگے
مِرے دوست۔ شیطان۔ کیا چاہتا ہے؟

سمجھ میں نہیں آئیں۔ دانا کی باتیں
نہ جانے یہ نادان۔ کیا چاہتا ہے

حفیظؔ آخری دور ہے غور کرلے
مِری جان۔ ایمان کیا چاہتا ہے



ابوالفطرت میر زیدی

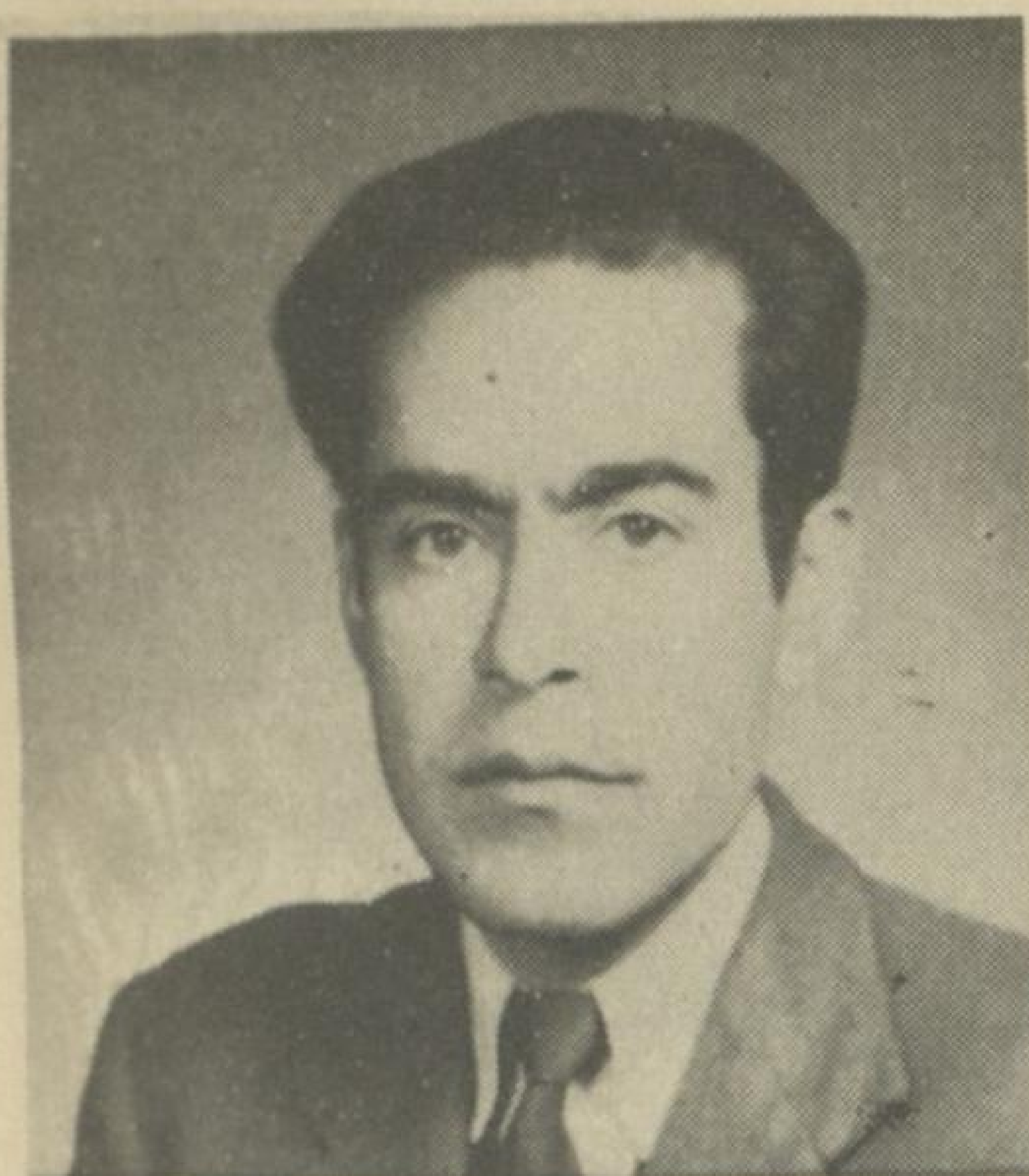
نام سید میر وزارت حسین زیدی، ادبی نام ابوالفطرت میر زیدی۔ بزرگ سادات بارہہ ضلع مظفر نگر (یو۔ پی)، سے آکر تبلیغِ اسلام اور عربی فارسی درس و تدریس کے سلسلہ میں خیرپور میرس میں آکر آباد ہوئے۔ خیرپور ہی میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر کے بعد ناز ہائی اسکول خیرپور میں حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں ہز ہائی نیس سر میر علی نواز خاں ناز، والئ ریاست خیرپور کے ساتھ لاہور آ گئے۔

پہلی ملازمت لاہور کے ایک روزنامے میں مدیر "حصہ نظم" کی حیثیت سے کی۔ ۱۹۴۲ء میں آرمڈ فورسز میڈیکل اسٹور ڈپو میں ملازمت اختیار کی۔ آج کل نوشہرہ میں مقیم ہیں مگر خیرپور سے خاندانی سلسلہ اب تک قائم ہے۔

شاعری کی ابتدا دربارِ خیرپور سے ہوئی۔ خیرپور میں مولانا سہا بھوپالی اور لاہور میں علامہ تاجور نجیب آبادی سے مشورۂ سخن کیا۔ آپ کی پہلی کتاب ۱۹۳۸ء میں "بادۂ فطرت" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

ابوالفطرت میر زیدی

میں نے کہا جناب ابھی جاگتے رہو
پیارے ہیں محوِ خواب، ابھی جاگتے رہو
پھولوں کے رنگ و بو کی، نہ خوشبو کی بات ہے
سر پر ہے احتساب ابھی جاگتے رہو
انسانیت کے نام پہ کچھ زلزلوں کے بعد
آئے گا انقلاب ابھی جاگتے رہو
ہم سو گئے ہزار تقاضوں کے باوجود
کہتی رہی کتاب، ابھی جاگتے رہو
میں نے کہا کہ ہونے کو آئی ہے نصف شب
کہنے لگے، جناب ابھی جاگتے رہو
دنیا خود اپنی بات پہ قائم نہیں رہی
حالات ہیں خراب ابھی جاگتے رہو
ہم سے بھی کہہ رہا ہے گئے وقت کا عتاب
نازل نہ ہو عذاب، ابھی جاگتے رہو
سن کر وہ میری بات بہت دیر چپ رہے
آخر ملا جواب، ابھی جاگتے رہو
زیدی وہ دل سے دردِ محبت کے باب میں
شاید کریں حساب، ابھی جاگتے رہو



اثر جلیلی

آپ کا اصل نام سید عبدالاحد اور اثرؔ تخلص ہے۔ جانشین امیر مینائی جناب جلیل مانکپوری سے سلسلۂ تلمذ کے باعث آپ جلیلی کہلاتے ہیں۔ اثر جلیلی کا آبائی وطن اجمیر ہے آپ ۱۹۲۲ء میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ جوناگڑھ میں مروجہ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۰ء میں ادیب فاضل اور ۱۹۴۱ء میں منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ ابتداً جدّی جاگیر پر بسر اوقات تھی۔ پھر کچھ عرصہ تجارت کی اور اب ملازمت کرتے ہیں۔

آپ نے شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۳ء سے کیا۔ مذہب، فلسفہ اور علم الکلام سے آپ کو خاص دلچسپی ہے۔ نظم و نثر دونوں لکھتے ہیں۔ اصنافِ شعر میں غزل، نعت سلام، رباعی اور مرثیہ سب میں طبع آزمائی کی ہے۔

مجموعۂ کلام تا حال شائع نہیں ہوا ہے۔

اثرؔ جلیلی

کیوں لبِ لعلیں کو تیرے میں نے پیمانہ کہا
اس خطا پر میکدہ والوں نے دیوانہ کہا

بڑھ گیا کچھ اور زنداں میں جنوں کا اعتبار
ہر قدم کو وحشیوں نے ایک ویرانہ کہا

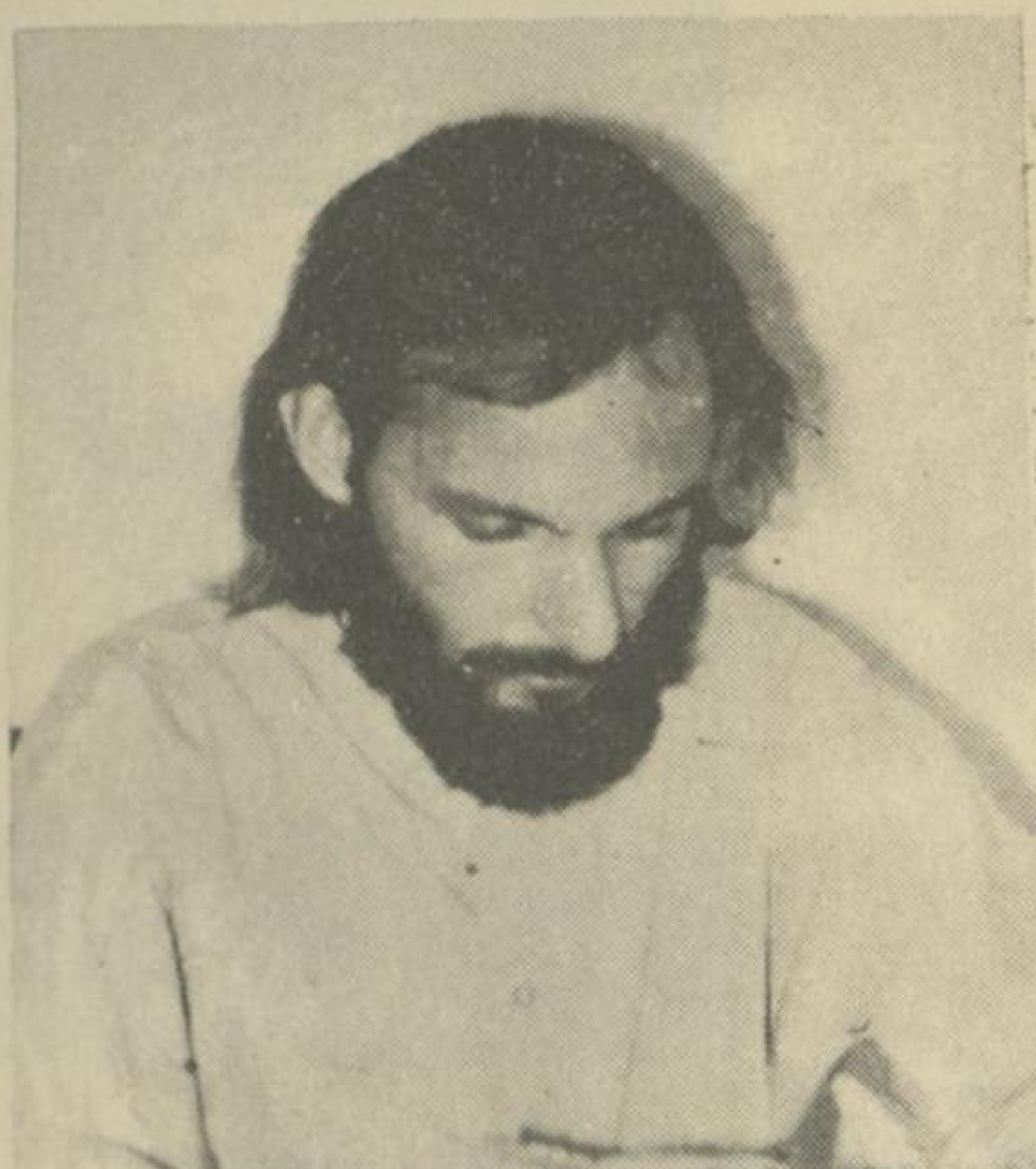
عظمتِ دار و رسن اک استعارہ بن گئی
ہم نے یوں بھی قامت و گیسو کا افسانہ کہا

مشورے ترکِ وفا کے تھے بہ عنوانِ خلوص
دشمنی کو ان جہاں والوں نے یارانہ کہا

کم نگاہی اس کی کتنی معتبر تھی دوستو
جس نے نرگس کو حریفِ چشمِ جانانہ کہا

زندگی بھر جو جلے ان کی نہ کی دنیا نے قدر
جل مرے جو رات بھر میں ان کو پروانہ کہا

مختصر یہ ہے اثرؔ میری وفا کی داستاں !
دوستوں نے دشمن اور اپنوں نے بیگانہ کہا



اجمل نیازی

۱۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ضلع میانوالی کے گاؤں موسیٰ خیل میں پیدا ہوئے۔ پورا نام محمد اجمل خان نیازی ہے۔ والد کا نام کریم داد خاں تھا۔ ۱۹۶۹ء میں ادبیات اردو میں ایم اے کیا۔ تعلیم کے دوران مختلف مقامی ادبی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد تقریباً ایک سال تک ہفت روزہ "قندیل" کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے تاآنکہ فروری ۱۹۷۲ء میں گارڈن کالج راولپنڈی میں لیکچرر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ یہاں ان کا قیام تقریباً چار برس رہا۔ والد کی وفات پر گورنمنٹ کالج میانوالی چلے گئے۔ تاکہ گھریلو مسائل سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ابھی تک اسی کالج میں پڑھا رہے ہیں۔

اجمل نیازی اردو اور پنجابی دونوں میں لکھتے ہیں۔ شاعری، افسانہ، تحقیق اور طنز و مزاح سب ہی سے لگاؤ ہے۔ نظم و نثر کے مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔ جن میں میانوالی کے نمائندہ شاعروں کا انتخاب بھی شامل ہے۔

اجمل نیازی

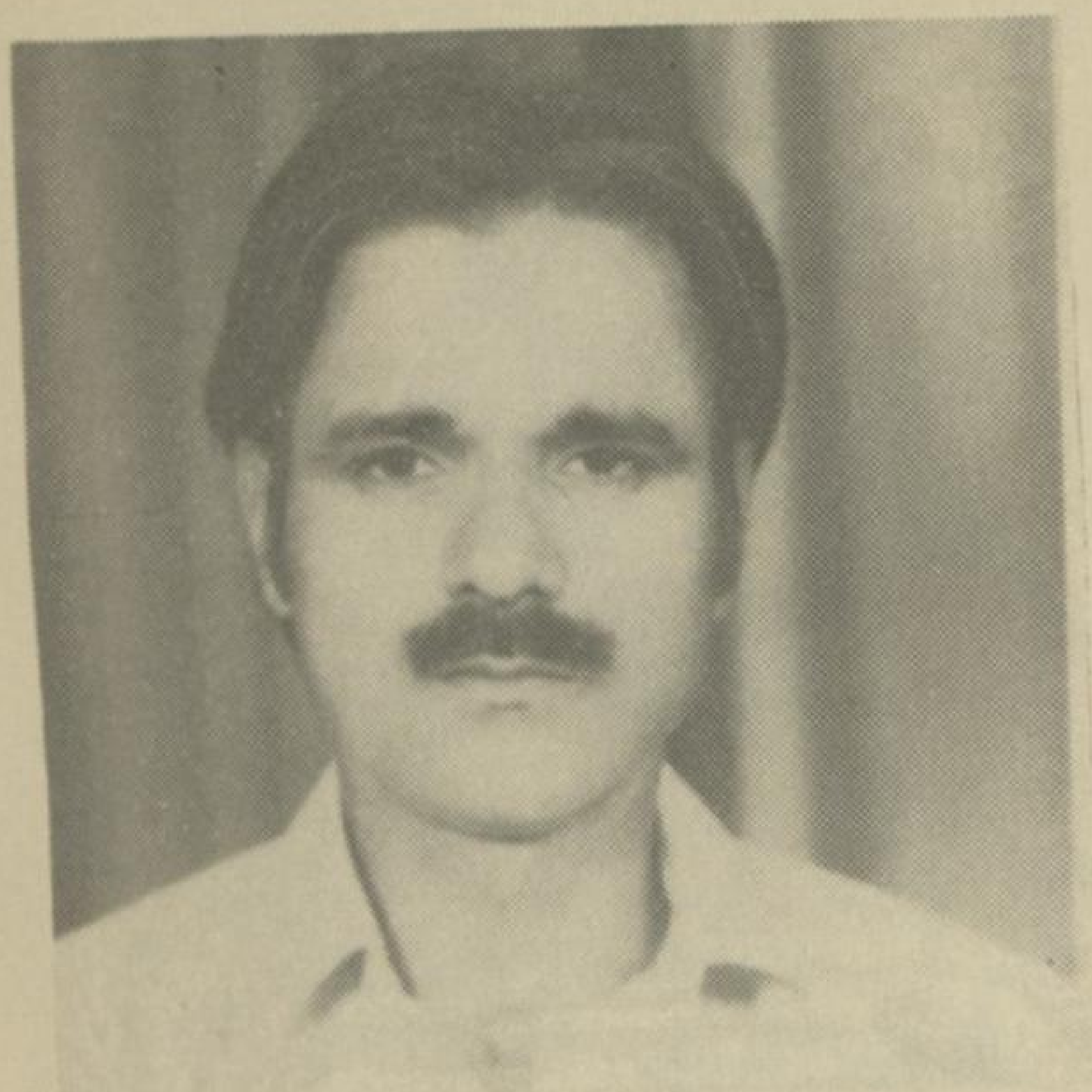
دل دریا میں کھوج ملا ہے کچھ آباد جزیروں کا
درد کی تہ میں پایا میں نے کشف تری تصویروں کا

اک معصوم سحر آئینہ فطرت کی تسخیروں کا
چڑیوں کی چہکار خلاصہ حمد کی سب تفسیروں کا

اک مستی ناخفتہ آنکھ میں لامحدود زمانوں کی
ایک نشہ خوابوں سے پہلے خوابوں کی تعبیروں کا

یادوں کے اخلاص میں پنہاں راز جمیل جہانوں کا
خون کے نور سے ظاہر ہو گا عہد نئی تقدیروں کا

اُس محبوب صدا کے وصل سے میرے لفظ چمکتے ہیں
دیکھ ہوا کی آنکھ میں اجملؔ رقص مری تحریروں کا



احسان اکبر

احسان اکبر ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن نوشہرہ خواجگان ضلع گجرات تھا جہاں سے ترکِ سکونت کر کے عرصہ پچیس سال سے ان کے اہلِ خانہ فیصل آباد میں ہیں۔ ان کا ذریعۂ معاش درس و تدریس ہے۔ میانوالی، چکوال اور راولپنڈی کے مختلف سرکاری کالجوں میں پڑھاتے رہے ہیں۔

احسان اکبر نے شعر گوئی کا آغاز اس وقت کیا جب وہ پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ گویا خود کو شاعر تسلیم کرانے میں کئی دہائیاں لگیں۔

"دریچے" اور "سبزۂ بیگانہ" کے نام سے دو شعری انتخاب شائع ہو چکے ہیں۔

احسان اکبر

پھر مجھے کون و مکاں دشت و بیاباں سے لگے
رو برو کون تھا جو آئنے حیراں سے لگے

کچھ تھی کم حوصلگی اپنی، تھی کچھ بے بصری
کچھ ہمیں عشق کے ہنگامے بھی آساں سے لگے

زیست! ہم ہار کے بھی ہاتھ ملائیں تجھ سے
اپنے یہ حوصلے شاید تجھے بے جاں سے لگے

زندگی! میرے اضافے مجھے واپس کر دے
جھاڑ دے خار جو ناحق ترے داماں سے لگے

وقت کٹتا رہا، تھا عہدِ حضوری کہ فراق
زخم لگتے رہے چاہے کسی عنواں سے لگے



احسان دانش

نام احسان الحق، قلمی نام احسان دانش۔ ۱۹۱۳ء میں کاندھلہ ضلع مظفر نگر (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ حافظ سید مصطفیٰ سے عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ تحصیلی اسکول سے چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ تلاشِ معاش کے سلسلے میں مستقل طور پر لاہور آکر آباد ہوئے۔ نامہ نویسی اور کتب فروشی کی، مزدوری، معماری، باغبانی اور چوکیداری کے علاوہ "انک مین" کے طور پر بھی کام کیا۔ آپ کو حسنِ کارکردگی کا صدارتی اعزاز ستارۂ امتیاز بھی مل چکا ہے۔

شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا نظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کی۔ آپ کی نظم و نثر کی متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

شعری مجموعے : حدیثِ ادب، دردِ زندگی، تفیرِ فطرت، نوائے کارگر، چراغاں، آتشِ خاموش، مقالات، شیرازہ، جادۂ نو، زخم و مرہم، گورستان، میراثِ مومن۔

نثری ادب : روشنیاں (اقوال)، طبقات (یادداشتیں)، خضرِ عروض (علمِ عروض)، دستورِ اردو (علمِ زبان) لغات الاصلاح (اصلاح زبان) اردو مترادفات (جدید لغت) اردو تذکیر و تانیث (اصول زبان) رموزِ غالب (شرح غالب) جہانِ دانش (خود نوشت پہلی جلد)

احسان دانش

جو اہلِ عشق ہیں نایاب ہوتے جاتے ہیں
یہ زندگی کے چلن خواب ہوتے جاتے ہیں

نشے کی جھانجھ میں پیرِ مغاں کے منصوبے
جواریوں کے حسین خواب ہوتے جاتے ہیں

وہ ذرّے جن پہ نہ سورج کی پڑ سکیں کرنیں
تمام کرمکِ شب تاب ہوتے جاتے ہیں

ابھی تو صاحبِ ظرف و ضمیر ہیں کچھ لوگ
مگر یہ لوگ بھی کمیاب ہوتے جاتے ہیں

تھا جس کی گونج سے آبادیوں میں واویلا
زمیں میں جذب وہ سیلاب ہوتے جاتے ہیں

گزر رہے ہیں جو شام و سحر کے ہنگامے
کتابِ وقت کا اک باب ہوتے جاتے ہیں

حلال رزق سے جن کے ضمیر زندہ تھے
وہ اس زمانے میں نایاب ہوتے جاتے ہیں

فضا کو سونپ رہے ہیں معانی و تاثیر
وہ نقش، گم جو سرِ آب ہوتے جاتے ہیں

جھلس گئے تھے لوؤں سے جو غنچۂ نورس
سحر کے لمس سے شاداب ہوتے جاتے ہیں

پہنچ چکا ہے ستاروں کے مرحلوں میں بشر
جہاز آج بھی غرقاب ہوتے جاتے ہیں

زباں میں شعلۂ دل سے پہنچ رہی ہے جو آگ
یہ ہاتھ کس لئے برفاب ہوتے جاتے ہیں

بروزِ حشر خدا جانے کیا ہو اے دانشؔ
ابھی سے شل مرے اعصاب ہوتے جاتے ہیں



احسن زیدی

آپ کا اصل نام احسن مہدی ہے مگر احسن زیدی کے نام سے آپ ادبی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں شعبۂ تدریس سے منسلک ہیں۔ شاعری کے علاوہ آپ نے تنقید بھی لکھی ہے۔ "تفہیم غالب" کے نام سے آپ کی تصنیف شائع ہو چکی ہے۔ ملک کے متقدر ادبی جرائد میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

"دریا دریا چہرہ" کے نام سے مجموعۂ کلام زیر طبع ہے۔

احسن زیدی

کوئی نہ دیکھے کہ پیڑ ہے سایہ دار کتنا
ہر اک اسے کاٹنے کو ہے بے قرار کتنا

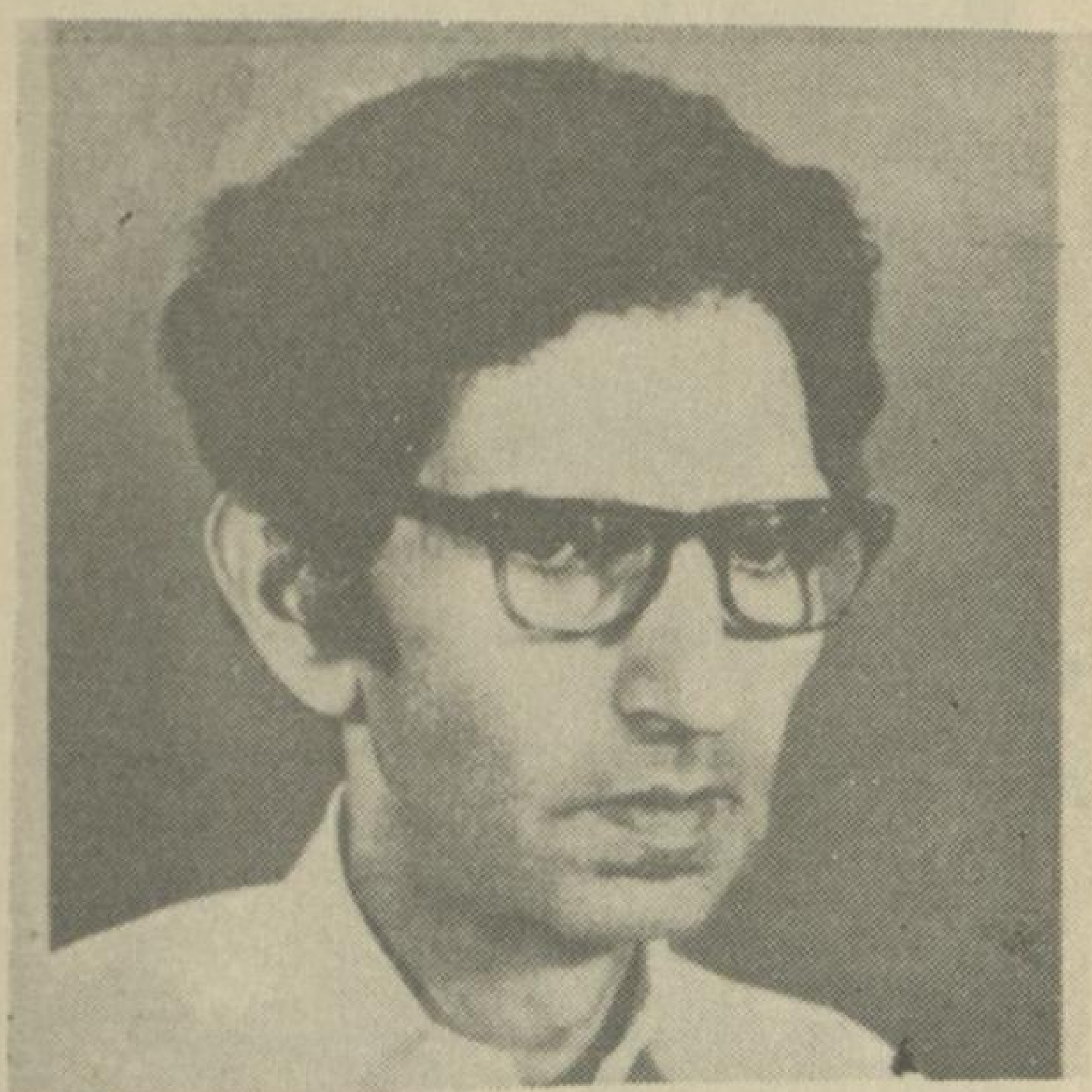
اتر گئے ہیں، تو پاؤں رُکتے نہیں کہیں پر
ہمیں خبر ہی نہ تھی کہ گہرا ہے غار کتنا

وہ آگئی ہیں، تو تختہ تختہ جُدا ہے ان کا
تجھے گئی کشتیوں کا تھا انتظار کتنا

پرندے کل بے لباس پیڑوں سے کہہ رہے تھے
ہمیں ہے موسم بدلنے پر اختیار کتنا

تھکن کی گٹھڑی ہے سر پہ اور راستہ ہے ویراں
یہ کس سے پوچھیں یہاں سے ہے کوئے یار کتنا

رفاقتوں کی شکست ہے دلخراش احسنؔ
جو برف پگھلی، اداس تھا کوہسار کتنا



احسن علی خاں

ریاست بھوپال کے قصبہ بریلی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت یکم فروری ۱۹۲۲ء ہے۔ آپ کے والد محکمہ جنگلات میں افسر تھے۔ ابتدائی تعلیم دیہات میں پائی۔ میٹرک تک بھوپال میں اور پھر ایم اے تک اندور میں تعلیم حاصل کی۔ ملازمت کا آغاز ۱۹۴۵ء میں منشور دہلی میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کیا مگر خرابیٔ صحت کے سبب وطن واپس آنا پڑا۔ بھوپال میں کچھ عرصہ ہفتہ وار ترجمان کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں حمیدیہ کالج بھوپال میں لیکچرار ہو گئے۔ پاکستان آکر جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ اور اس کے بعد زمیندار کالج گجرات میں لیکچرار رہے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۷ء تک پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں بین الاقوامی تعلقات اور سیاسیات کا درس دیتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں وزارتِ خارجہ سے منسلک ہو گئے اور آج بھی اس کے شعبۂ تحقیق سے وابستہ ہیں۔

شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا جس کو بھوپال کے شاعرانہ ماحول نے جلا بخشی۔ ابتدا میں معین احسن جذبی، سُہا مجددی اور باسط بھوپالی سے مشورۂ سخن کیا۔ بھوپال میں اگرچہ غزل کا دور دورہ تھا مگر انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز نظم گوئی سے کیا۔ آج بھی ان کی پہچان اُن کی نظموں ہی سے ہوتی ہے۔

۱۹۷۷ء میں احسن کا منتخب کلام "میں محسوس کرتا ہوں، میں سوچتا ہوں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے دو تراجم بھی ہیں۔ (۱) ہاورڈ فاسٹ کے ناول فریڈم روڈ کا ترجمہ (زیر طبع) اور (۲) طلعت سعید حلمان کی کتاب YUNUS OMRE'S HUMANISM کا ترجمہ جس میں یونس امرے کی چالیس نظموں اور غزلوں کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ ترجمہ آر سی ڈی کے ادارۂ ثقافت نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا ہے۔

احسن علی خاں

جب تک اتنے قرب سے دیکھا نہ تھا
فاصلوں کے حسن کو سمجھا نہ تھا

زیست تو کیا موت کا یارا نہ تھا
قبر مہنگی تھی، کفن سستا نہ تھا

تجھ سے کیا شکوہ کہ ایسی تھی فضا
تو ہی کیا، ہر آشنا، بیگانہ تھا

سینکڑوں غم ہائے دنیا، کس لیے؟
کیا ترا غم حاصلِ دنیا نہ تھا؟

تو ہی کیا، میں خود نہیں ہوں اپنے پاس
تھا، مگر اتنا کبھی تنہا نہ تھا

بک گئے بازار میں جسم و دماغ
دل وہ باغی تھا کہ بک سکتا نہ تھا

کس نے خیمے کی طنابیں کاٹ دیں
دشت میں تو کوئی ہمسایہ نہ تھا

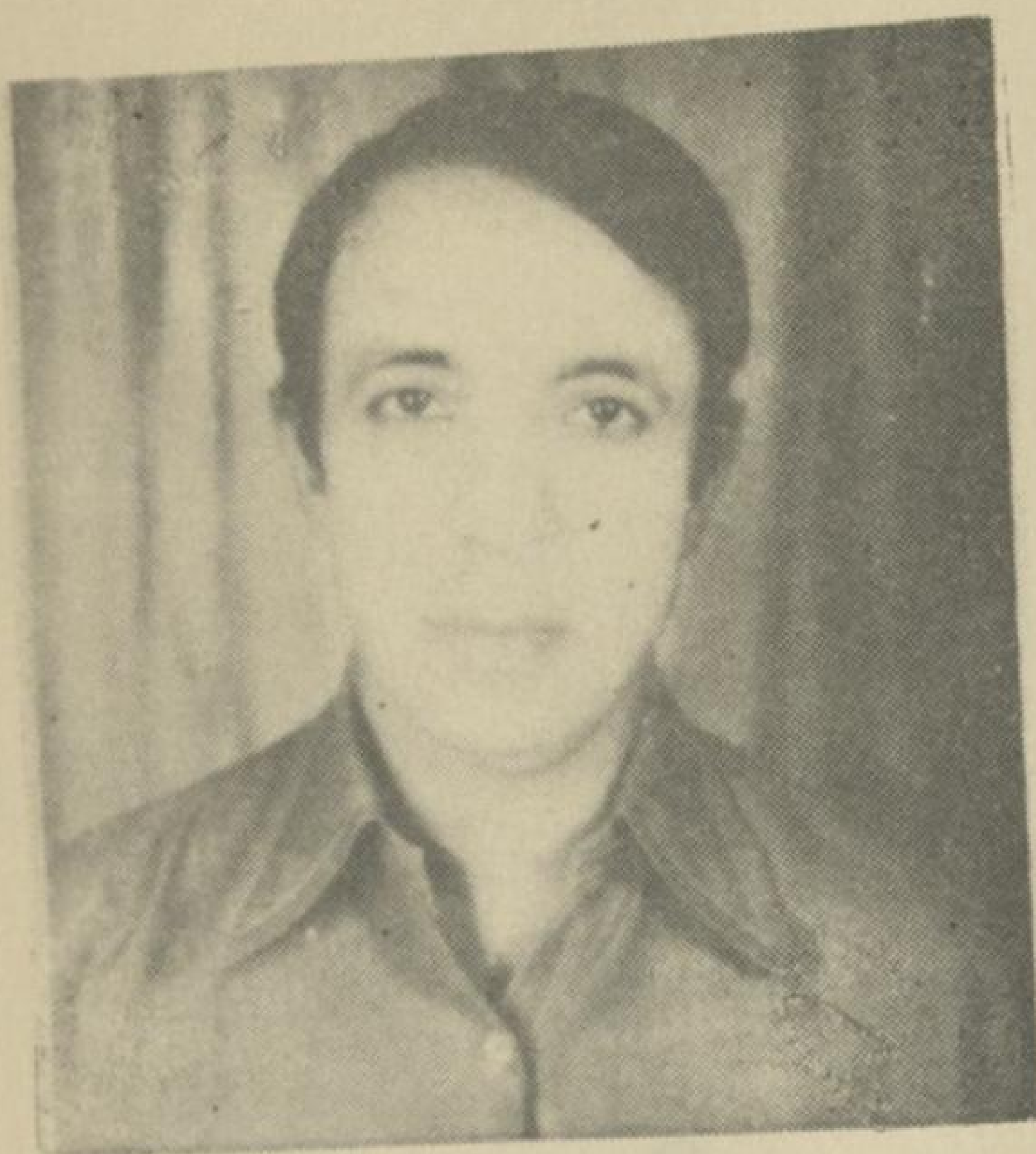
راہرو چونکے اور آگے بڑھ گئے
میرے گرنے پر کوئی ٹھہرا نہ تھا

بات سچ تھی پر ہنسی میں اُڑ گئی
کہنے والا شخص اک دیوانہ تھا

ہم بھی احسنؔ کا اڑاتے تھے مذاق
جب تک اپنے آپ میں جھانکا نہ تھا

مستثنیات سے قطع نظر ہماری غزل انسان کے علاوہ کائنات کی کسی اور چیز سے تعلق نہیں رکھتی۔ اگر چیزوں کو استعمال بھی کرتی ہے تو انسانی جذبات اور تصوّرات کے نائب کی حیثیت سے۔ یا یوں کہئے کہ غزل چیزوں کو دیکھتی نہیں، انہیں استعمال کرتی ہے۔ مثنویوں اور قصے کہانیوں میں البتہ چیزوں کو دیکھا جاتا ہے لیکن یہاں بھی چیزوں کا الگ اور مستقل وجود تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان کا شمار صرف انسانی زندگی کے مناسبات میں ہوتا ہے۔

(محمد حسن عسکری)



احمد تنویر

احمد تنویر، اب سے اڑتیس برس قبل، پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید سردار علی ہے۔ نامساعد گھریلو حالات کے سبب تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ احمد تنویر نے اپنے ذوق اور مطالعہ ہی کو اپنا رہنما بنایا اور یوں اپنے شعری سفر کو جاری رکھا۔

ابتدا میں احمد تنویر، کلیم برنی سے مشورۂ سخن کرتے رہے جو سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ میں سے تھے۔ مگر قابل استاد نے یہ کہہ کر کہ تم اچھی اور صاف غزل کہہ رہے ہو، میں اگر اپنے رنگ میں اصلاح دوں گا تو یہ ادبی بددیانتی ہوگی، اصلاح کا سلسلہ ختم کر دیا۔

احمد تنویر، ان دنوں جھنگ میں مقیم ہیں۔

احمد تنویر کی قومی نظموں پر مشتمل شعری مجموعہ "کچے پکے گھروندوں کا سورج"۔ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

مجموعۂ غزلیات "لفظوں کا سفر" کے نام سے طباعت کے مراحل میں ہے۔

احمد تنویر

نگری نگری گھومے، چنچل مست ہوا
جانے کس کو ڈھونڈے پاگل مست ہوا

جھرنا جھرنا، شام سلونی، قوسِ قزح
ہائے یہ مہکا مہکا جنگل مست ہوا

کان میں کتنی یادوں کے رس گھول گئی
صُبح سویرے نیند سے بوجھل مست ہوا

پتا پتا لہرایا، شاخیں جھومیں
تیز چلی جب آنکھ سے اوجھل مست ہوا

رات کے سائے روشنیوں میں ڈوب گئے
اُلٹ رہی ہے دھُوپ کا آنچل مست ہوا

جانے کس کی غزلیں لکھنے کو تنویرؔ
پنسل لے کر آئی نٹ کھٹ مست ہوا



احمد فراز

آپ ۱۹۳۱ء کو، کوہاٹ (سرحد) میں پیدا ہوئے، آپ کے والد آغا برق کوہاٹی اردو اور فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ آپ نے ایم اے اردو اور ایم اے فارسی میں کامیابی حاصل کی۔ آپ ریڈیو پاکستان اور اسلامیہ کالج سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں آپ پاکستان نیشنل سنٹر میں آ گئے، اس کے بعد اکادمی ادبیات پاکستان میں آپ نے بحیثیت پروجیکٹ ڈائریکٹر فرائض سرانجام دیئے۔ آج کل آپ پاکستان نیشنل سنٹر میں ڈائریکٹر (پروگرامز) ہیں۔

اردو غزل گو شعرا میں آپ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

تنہا تنہا، دردِ آشوب، نایافت، مرے خواب ریزہ ریزہ، شب خون اور جاناں جاناں، آپ کی مطبوعہ تصانیف ہیں۔

احمد فراز

برسوں کے بعد دیکھا اک شخص دلربا سا
اب ذہن میں نہیں ہے، پر نام تھا بھلا سا

ابرو کھچے کھچے سے، آنکھیں جھکی جھکی سی
باتیں رکی رکی سی، لہجہ تھکا تھکا سا

الفاظ تھے کہ جگنو، آواز کے سفر میں
بن جائے جنگلوں میں جس طرح راستا سا

خوابوں میں خواب اس کے، یادوں میں یاد اس کی
نیندوں میں گھل گیا ہو، جیسے کہ رتجگا سا

پہلے بھی لوگ آئے، کتنے ہی زندگی میں
وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جدا سا

اگلی محبتوں نے، وہ نامرادیاں دیں
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ڈرا ڈرا سا

کچھ یہ کہ مدّتوں سے ہم بھی نہیں تھے روئے
کچھ زہر میں بجھا تھا احباب کا دلاسا

پھر یوں ہوا کہ ساون آنکھوں میں آ بسے تھے
پھر یوں ہوا کہ جیسے دل بھی تھا آبلہ سا

اب سچ کہیں تو یارو، ہم کو خبر نہیں تھی
بن جائے گا قیامت اک واقعہ ذرا سا

تیور تھے بے رخی کے، انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا

ہم دشت تھے کہ دریا، ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو، جب وہ نہیں تھا پیاسا

ہم نے بھی اس کو دیکھا کل شام اتفاقاً
اپنا بھی حال ہے اب لوگو! فراز کا سا

غزل کے آپ جتنے دور چاہیں قائم کریں لیکن ولی اور میر کے زمانے سے لے کر اب سے چند سال پہلے تک "حسن و جمال" کا ذکر، خالص عشق و محبت کی زبان میں کم و بیش ہر دور میں غرض مشترک کی حیثیت سے پایا جاتا تھا، لیکن اب کچھ زمانے سے "حُسن اس پری وش" کا ختم ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن "بیاں اپنا" ضرور بدلتا جا رہا ہے۔ یقیناً یہ تبدیلی دفعتاً نہیں ہوئی بلکہ وقت اور زمانہ کے لحاظ سے آہستہ آہستہ ہر دور میں کچھ تغیر ہوا اور اس تغیر کا اثر چونکہ موضوعِ شاعری پر بھی پڑا، اس لئے غزل کی زبان اور اس کا اسلوب بھی بدلتا رہا۔

(نیاز فتح پوری)



احمد مشتاق

احمد مشتاق، ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ عمر کا بیشتر حصہ لاہور میں گذرا، آپ بنکنگ کے پیشہ سے وابستہ ہیں۔ ان دنوں لاہور ہی میں چارٹرڈ بنک میں ملازم ہیں۔

احمد مشتاق کا ایک مجموعۂ غزلیات طبع ہو چکا ہے، اور دوسرا مجموعۂ کلام ترتیب و تشکیل کے مرحلے میں ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے ناصر کاظمی کے بارے میں ایک کتاب "ہجر کی رات کا ستارہ" کے نام سے بھی مرتّب کی ہے۔

احمد مشتاق

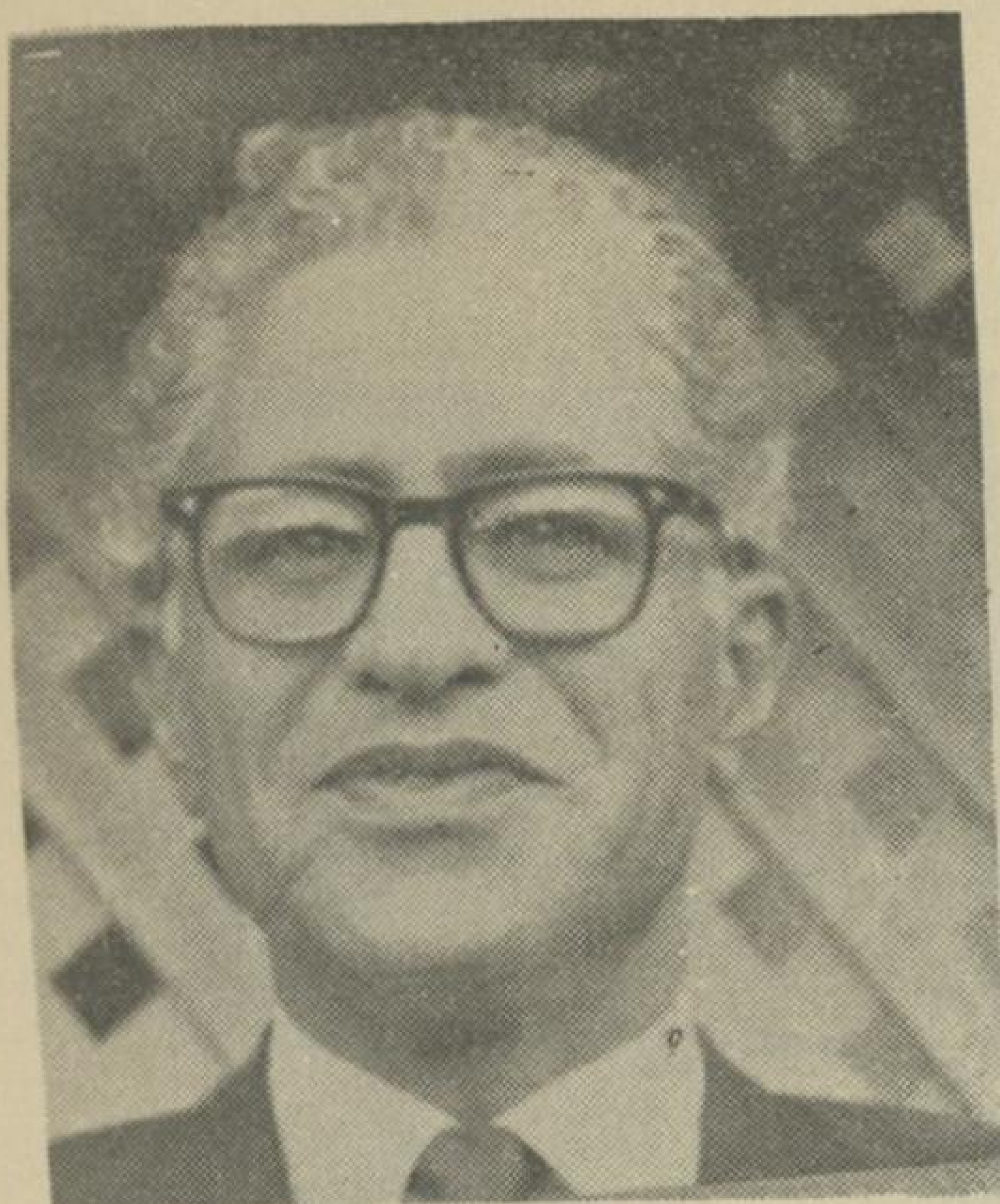
بھاتا ہے اگرچہ حُسنِ دریا ڈر رہا ہوں میں
سبب یہ ہے کہ اک مدت کنارے پر رہا ہوں میں

ترے آنے کا دن ہے تیرے رستے میں بچھانے کو
چمکتی دھوپ میں سائے اکٹھے کر رہا ہوں میں

یہ جھونکے جن سے دل میں تازگی آنکھوں میں ٹھنڈک ہے
انہی جھونکوں سے مُرجھایا ہُوا شب بھر رہا ہوں میں

کوئی کمرہ ہے جس کے طاق میں اک شمع جلتی ہے
اندھیری رات ہے اور سانس لیتے ڈر رہا ہوں میں

مجھے معلوم ہے اہلِ وفا پر کیا گزرتی ہے
سمجھ کر سوچ کر تجھ سے محبت کر رہا ہوں



احمد ندیم قاسمی

اصل نام پیرزادہ احمد شاہ ہے۔ آپ ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ بی، اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ برصغیر پاک و ہند کے نامور شاعر، افسانہ نگار اور صحافی ہیں۔ محکمہ ایکسائز میں سب انسپکٹر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ متعدد ادبی رسائل اور روزانہ اخبارات کے مدیر رہ چکے ہیں۔ آج کل مجلسِ ترقی ادب لاہور کے ناظمِ اعلیٰ اور ادبی مجلّہ " فنون" کے مدیر ہیں۔

آپ کی تصانیف ہیں "رم جھم" (قطعات) " جلال و جمال" ــــ " شعلۂ گل" ــــ " دشتِ وفا" ــــ "محیط" ــــ " دوام" (شعری مجموعے) "چوپال" ــــ " بگولے" ــــ " طلوع و غروب" ــــ "گرداب و سیلاب" ــــ " آنچل" ــــ " آبلے" ــــ "آس پاس" ــــ " در و دیوار" ــــ " برگِ حنا" ــــ " بازارِ حیات" ــــ " گھر سے گھر تک" ــــ "کپاس کا پھول" (افسانے) اور "تہذیب و فن" (مضامین) وغیرہ شامل ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

درِ کسریٰ پہ صدا کیا کرتا!
اک کھنڈر مجھ کو عطا کیا کرتا!

جس اندھیرے میں ستارے نہ جلے
ایک مٹّی کا دیئے کیا کرتا!

ریت بھی ہاتھ میں جس کے نہ رکی
وہ تہی دست، دعا کیا کرتا!

ڈھب سے جینا بھی نہ آیا جس کو
اپنے مرنے کا گلہ کیا کرتا!

اس کا ہونا ہے مرے ہونے سے
میں نہ ہوتا تو خدا کیا کرتا!

تو نے کب مجھ کو دیئے میرے حقوق
میں ترا فرض ادا کیا کرتا!

ایک دھتکار تو جھولی میں پڑی
تو نہ ہوتا تو گدا کیا کرتا!

تشنہ لب آئے، مگر ڈوب گئے
چشمۂ آبِ بقا کیا کرتا!

نکہت و رنگ کا پیاسا تھا ندیمؔ
صرف اک لمسِ ہوا کیا کرتا!



احمد ہمدانی

محمد احمد ہمدانی نام، ادبی نام احمد ہمدانی۔ میرٹھ (یوپی) میں یکم جولائی ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ بسلسلہ ملازمت ریڈیو پاکستان سے منسلک ہیں۔

شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ پہلی غزل اُس وقت کہی جب آپ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے، یوں مشقِ سخن کی عمر چالیس برس قرار پاتی ہے۔ باقاعدہ شعر لکھتے ہوئے تیس سال سے زائد ہو چکے ہیں۔

"پیاسی زمین" (مجموعۂ کلام) اور "قصّہ نئی شاعری کا" (تنقیدی مضامین) شائع ہو چکے ہیں۔

احمد ہمدانی

ہر اک جھونکے پہ منہ کیوں فق ہوا ہے
ہوا نے کان میں کیا کہہ دیا ہے

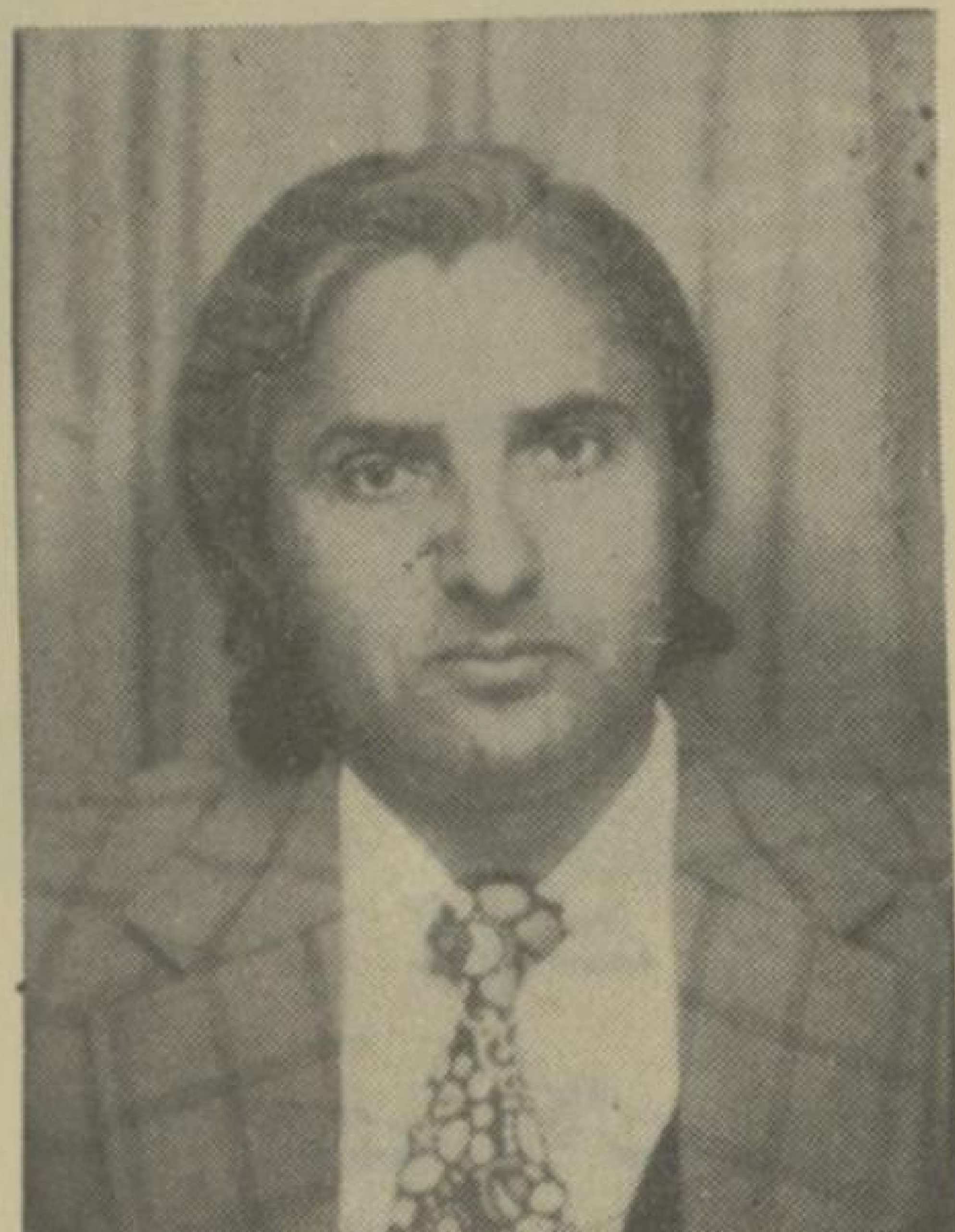
یہ سوتے جاگتے کیوں مدّتوں سے
تعاقب ایک سایہ کر رہا ہے

مبارک تیرے گھر کے رنگ تجھ کو
پسِ دیوار کوئی سو گیا ہے

جہاں کے یہ حسیں منظر کسی نے
دکھوں کا ان پہ کیوں غازہ ملا ہے

غنیمت تھا ہمارے دل کا دیپک
عجب لو دے کے جو اب بجھ چلا ہے

مرے دل میں تمنّاؤں کا میلہ
کسی دریا میں اک کچّا گھڑا ہے



اختر امان

اصل نام امان اللہ ملک۔ ادبی حلقوں میں اختر امان کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۳ء کو پیدا ہوئے، سکونت کا تعلق ضلع سرگودھا سے ہے۔ ایم، اے (انگریزی) تک تعلیم حاصل کرکے صحافت کے پیشہ سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۵ء تک روزنامہ "نوائے وقت" لاہور سے منسلک رہے۔ اور روزنامہ "امروز" لاہور اور انگریزی اخبار "مسلم" اسلام آباد میں بھی کالم لکھتے رہے ہیں۔ ان دنوں پاپولیشن ڈویژن اسلام آباد میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔

تصانیف یہ ہیں: پاکستان اینڈ دی چیلنج آف ہسٹری، نیو ٹرینڈز اِن فارن پالیسی زیڈ، اے، بھٹو۔ دی پولیٹیکل تھنکر (شریک مصنف)

شاعری کے علاوہ افسانہ اور تنقید بھی لکھتے ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ "خوابوں کے بے نام جزیرے" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

اختر امان

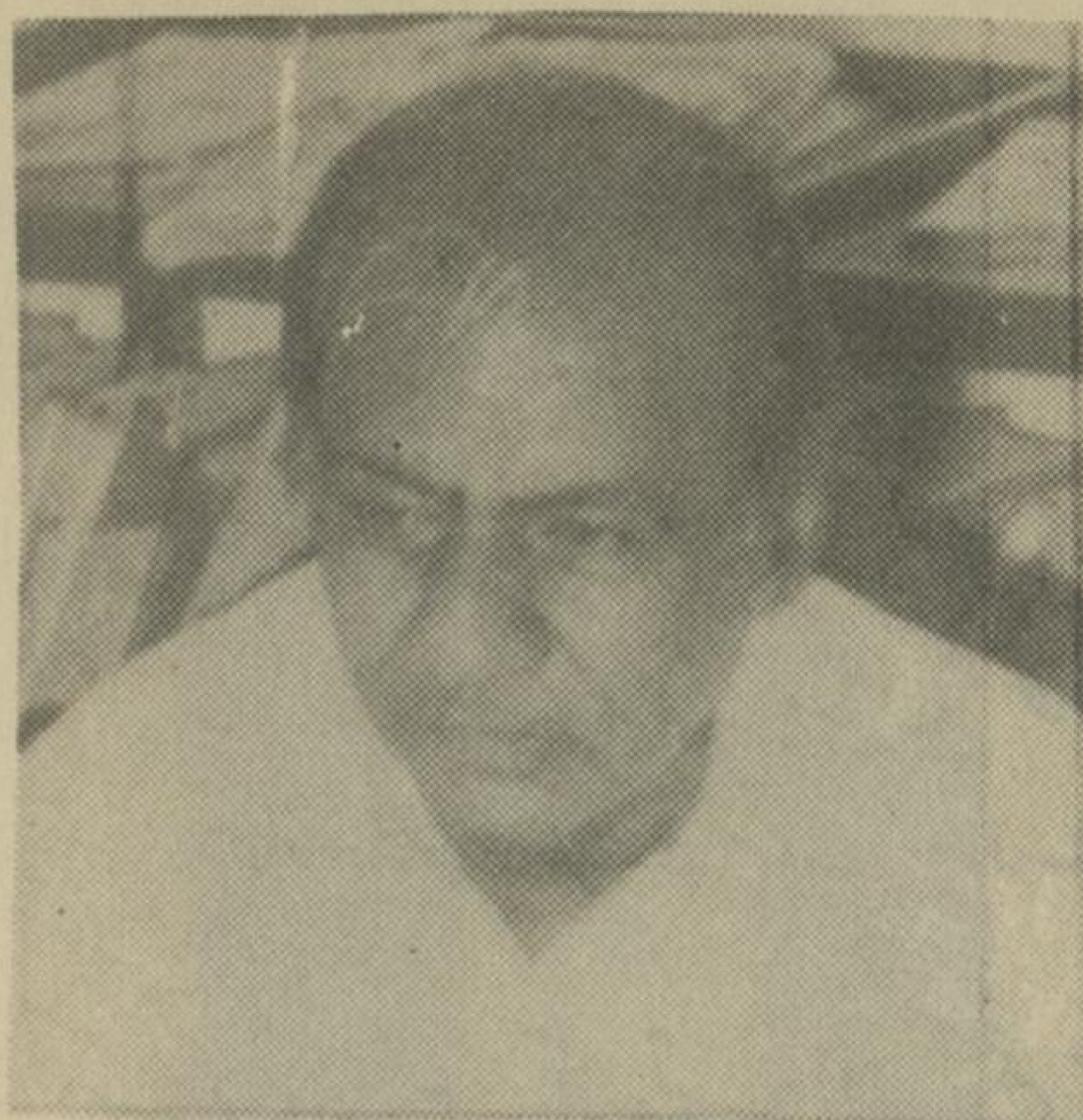
یہاں موسم بھی بدلیں تو نظارے ایک جیسے ہیں
ہمارے روز و شب سارے کے سارے ایک جیسے ہیں

ہمیں ہر آنے والا زخم تازہ دے کے جاتا ہے
ہمارے چاند، سورج اور ستارے ایک جیسے ہیں

خدایا تیرے دم سے اپنا گھر اب تک سلامت ہے
وگرنہ دوست اور دشمن ہمارے ایک جیسے ہیں

کہیں گر فرق نکلے گا تو بس شدّت کا کچھ، ورنہ
یہاں پر غم ہمارے اور تمہارے ایک جیسے ہیں

میں کس امید پر دامن کسی کا تھام لوں اخترؔ
کہ سب سے دوستی میں اب خسارے ایک جیسے ہیں



اختر انصاری اکبر آبادی

پیدائش ۱۹۲۱ء کے قریب۔ تمام عمر شعر و ادب سے وابستگی میں گذری۔ اٹھارہ برس کی عمر سے شعر گوئی اختیار کی۔ آپ کی نگارشاتِ نظم و نثر برصغیر کے مقتدر ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں آج کل (دہلی) محشرِ خیال (دہلی)، شاہراہ (دہلی) بیسویں صدی (دہلی) اوراق (لاہور) نقوش (لاہور) ماہِ نو (کراچی، لاہور) فنون اور سب رس (بھارت) کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اختر انصاری اکبر آبادی نے مختلف ادبی رسائل کی ادارت بھی کی ہے۔ مثلاً مشرب، نشیمن، بربط اور نئی قدریں وغیرہ۔ موخرالذکر رسالہ کی سلور جوبلی ہونے والی ہے۔

اختر انصاری اب تک نظم و نثر کی کم و بیش اٹھارہ کتابیں تصنیف و تالیف کر چکے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:-

شاعری: کیف و رنگ، نالہ پابندِ نے، دلِ رسوا، نئی رہگذر، نئی کہکشاں، غمِ فردا، لب گفتار۔

نثر: نظریات، جمالِ آگہی، فردوسِ مغلیہ، ان کتابوں کے علاوہ متعدد کتابیں سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری اور حیات کے بارے میں لکھی ہیں۔

اختر انصاری اکبر آبادی

جو تم نے دی ہے اذیت خوشی سی لگتی ہے
یہ دشمنی ہے مگر دوستی سی لگتی ہے

ہزار صبحیں اندھیروں سے پھوٹ نکلیں گی
یہ تیرگی تو ہمیں روشنی سی لگتی ہے

لبوں پہ ان کے تبسّم کی موج ہے شاید
دلوں میں آج نئی زندگی سی لگتی ہے

تمہاری بزم سے اُٹھ کر عجیب حال ہوا
ہر ایک شکل مجھے اجنبی سی لگتی ہے

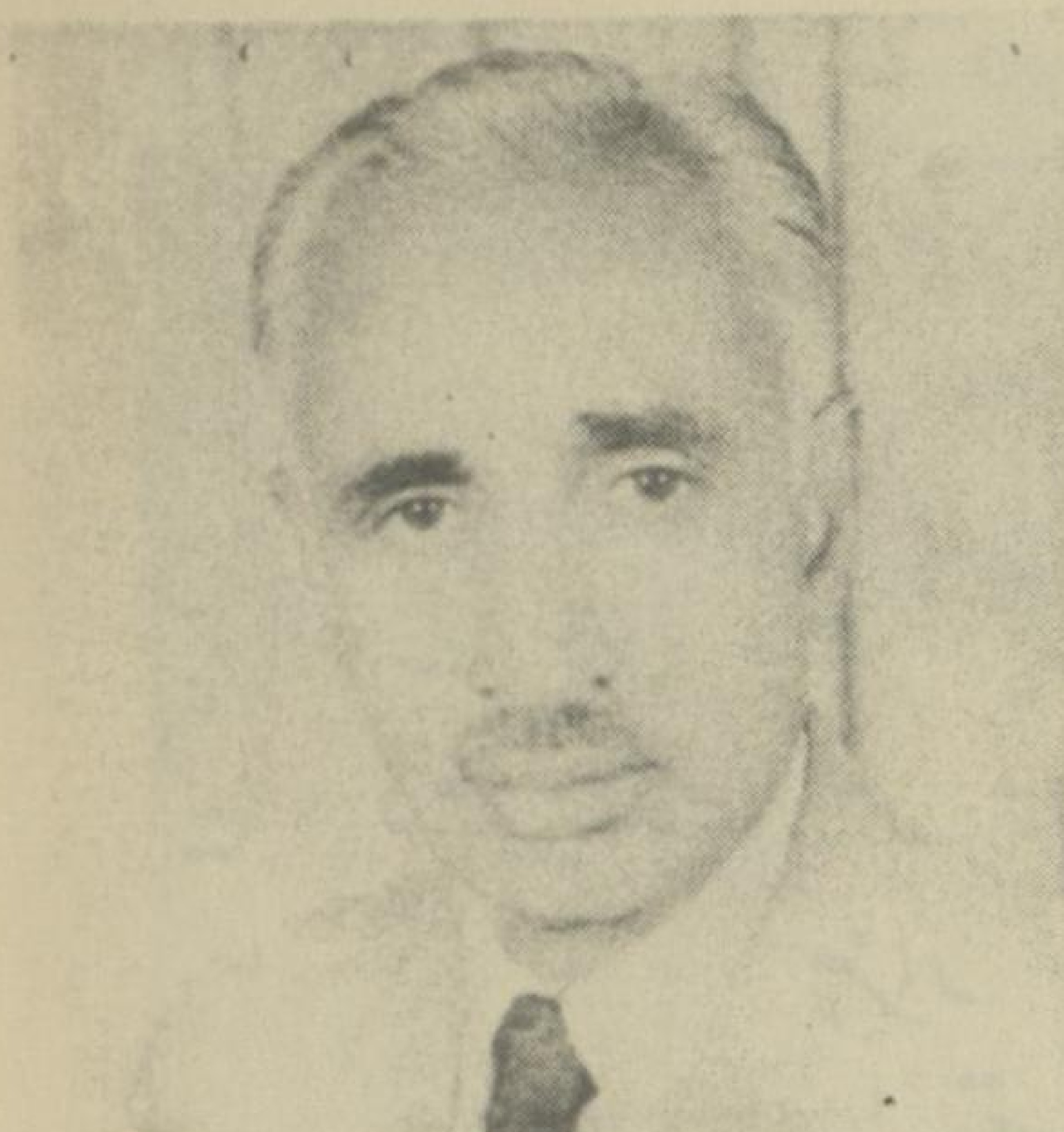
ہر اک ستم پہ میں شکرِ ستم ہی کرتا ہوں
کہ دوستوں سے شکایت بُری سی لگتی ہے

مری وفا میں اضافہ سا ہوتا جاتا ہے
نوازشوں میں تمہاری کمی سی لگتی ہے

لگن جو دل میں لگی ہے وہ عارضی تو نہیں
مجھے تو اب یہ خلش دائمی سی لگتی ہے

بہار کہیئے جسے آپ کا سا جلوہ ہے
کلی کے لب پہ ہنسی آپ کی سی لگتی ہے

وہ کہہ رہے تھے محبت سے کل یہ اے اختر
ہر ایک بات تری شاعری سی لگتی ہے



اختر ہوشیارپوری

عبدالسلام نام، اختر تخلص۔ آپ ۲۰ اپریل ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے راولپنڈی میں مستقل سکونت اختیار کی۔

اختر ہوشیارپوری پیشہ کے لحاظ سے ایڈووکیٹ ہیں۔

شعروادب سے وابستگی ۱۹۳۴ء کے لگ بھگ پیدا ہوئی، ان دنوں آپ کالج میں ایف اے کے طالب علم تھے۔

اختر ہوشیارپوری کی منتخب غزلیں "علامت" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔

اختر ہوشیارپوری

اندر کا حال روزنِ دیوار میں کھُلا
دروازہ میرے صحن کا بازار میں کھُلا

میں ساتویں سفر پہ جو نکلا تو صبح تھی
پھر آفتاب گرمئ رفتار میں کھُلا

اک دشتِ بے گیاہ تھا لیکن یہ حرفِ اسم
شہرِ طلسم زار سمن زار میں کھُلا

میں دھُوپ کے سفر میں فصیلوں میں بند تھا
پرچم ہوا کا وادئ گلزار میں کھُلا

ہر اینٹ میرے نام پہ رکھی گئی مگر
دیوار کا جو حال تھا دیوار میں کھُلا

بندِ نقاب کھلتے گئے فصلِ گل کے ساتھ
ایک ایک چہرہ انجمنِ یار میں کھُلا

منظر سمندروں کا بڑا دلفریب تھا
لیکن تہوں کا راز جو منجدھار میں کھُلا

زنجیرِ پا ہی راہگذاروں کا حسن ہے
کیا پیچ تھا کہ طرۂ دستار میں کھُلا

اختؔر مرے نصیب کا عقدہ ہوا کی طرح
اُلجھی لٹوں کی منزلِ دشوار میں کھُلا



ادا جعفری

اصل نام عزیز جہاں ہے، ۲۲۔ اگست ۱۹۲۴ء کو بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ پہلے ادا بدایونی کے نام سے شعر کہتی تھیں۔ شادی کے بعد اداؔ جعفری ہو گئیں۔ بچپن ہی سے آپ کو شعر و شاعری سے شغف تھا۔ ہر چند آپ کے خاندان میں کوئی شاعر نہ تھا لیکن ادبی ذوق سبھی کو تھا۔ اداؔ کی پہلی غزل ۱۹۴۵ء میں اختر شیرانی کے رسالہ "رومان" میں شائع ہوئی۔ اداؔ کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ صرف تین برس کی تھیں مگر والدہ نے اس طرح پرورش کی کہ بچوں میں کوئی احساسِ محرومی پیدا نہ ہو۔ ان کو شاعرہ بنانے میں دراصل ان کی والدہ کی حوصلہ افزائی کو بڑا دخل ہے۔

اداؔ جعفری نے بارہ تیرہ برس کی عمر سے باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا اور اختر شیرانی اور نواب مرزا جعفر علی خان اثرؔ سے اصلاح لی۔ ان دنوں آزاد نظم کا نیا نیا رواج ہوا تھا۔ اداؔ نے اس میں بھی طبع آزمائی کی۔

پہلا مجموعۂ کلام "میں ساز ڈھونڈتی رہی" ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ "شہرِ درد" شائع ہوا جس پر ادبی انعام بھی ملا۔ ۱۹۶۷ء میں تیسرا مجموعہ کلام "غزالاں تم تو واقف ہو" طبع ہوا۔ تازہ مجموعہ کلام "سازِ سخن بہانہ ہے" کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔

ادا جعفری

ہر اک دریچہ کرن کرن ہے ، جہاں سے آئے جدھر گئے ہیں
ہم اک دیا آرزو کا لے کر بطرزِ شمس و قمر گئے ہیں

ہماری پلکوں سے تھم نہ پائے جو شبنمی مہرباں اجالے
تمہاری آنکھوں میں آ گئے تو تمام رستے نکھر گئے ہیں

وہ دور کب تھا حریمِ جاں سے کہ لفظ و معنی کے ناز اٹھاتے
جو حرف ہونٹوں پہ آ نہ پائے وہ بن کے خوشبو بکھر گئے ہیں

جو دردِ عیسیٰ نفس نہ ہوتا تو دل پہ کیا اعتبار آتا
کچھ اور پیماں ، کچھ اور پیکاں کہ زخم جتنے تھے بھر گئے ہیں

خزینے جاں کے لٹانے والے دلوں میں بسنے کی آس لے کر
سنا ہے کچھ لوگ ایسے گزرے جو گھر سے آئے نہ گھر گئے ہیں

جو اک نگہ سے خراش آئی زمانے بھر سے گلہ ہوا ہے
جو دل دکھا ہے تو رنج سارے نہ جانے کس کس کے سر گئے ہیں

شکستِ دل تک نہ بات پہنچی مگر اداؔ کہہ سکو تو کہنا
کہ اب کے ساون ، دھنک سے آنچل کے رنگ سارے اتر گئے ہیں



ارشاد ارشی

نام ارشاد ارشی ۔ ۲ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو پیدا ہوئیں۔ صحافت میں ایم۔اے کیا جس کے بعد سے مختلف اخبارات اور رسائل میں ملازمت کر چکی ہیں، آئندہ بھی صحافت ہی کو ذریعۂ معاش بنانے کا ارادہ ہے۔

پہلا شعر بقول خود اس وقت کہا جب وہ چھٹی جماعت کی طالبہ تھیں۔ ملک کے ادبی رسائل میں ان کی شعری کاوشیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا ہے۔

ارشاد ارشی

برستی رہتی ہے وحشت سی بام و در سے ترے
گئی ہے جب سے کھنک چوڑیوں کی گھر سے ترے

ترے خلوص کے کل تک جو گیت گاتے تھے
پناہ مانگ رہے ہیں وہ آج شر سے ترے

تجھے یہ ڈر تھا کہ پاؤں نہ بھیگ جائیں کہیں
گزر گئے کئی سیلاب اب تو سر سے ترے

تمام عمر ہی بے کار رنجشوں میں کٹی
مگر بنی نہ کبھی تیری ہمسفر سے ترے

اسے کسی نے کہیں پر بھی بیٹھنے نہ دیا
چلا گیا تھا جو اک شخص اٹھ کے در سے ترے

کھلیں گلاب یہاں تتلیاں کریں شوخی!
عجیب سی مجھے وابستگی ہے گھر سے ترے

ڈھلی جو شام، بہت مضطرب ہوئے آرشی
کہ منتظر سے تھے کچھ لوگ جو سحر سے ترے

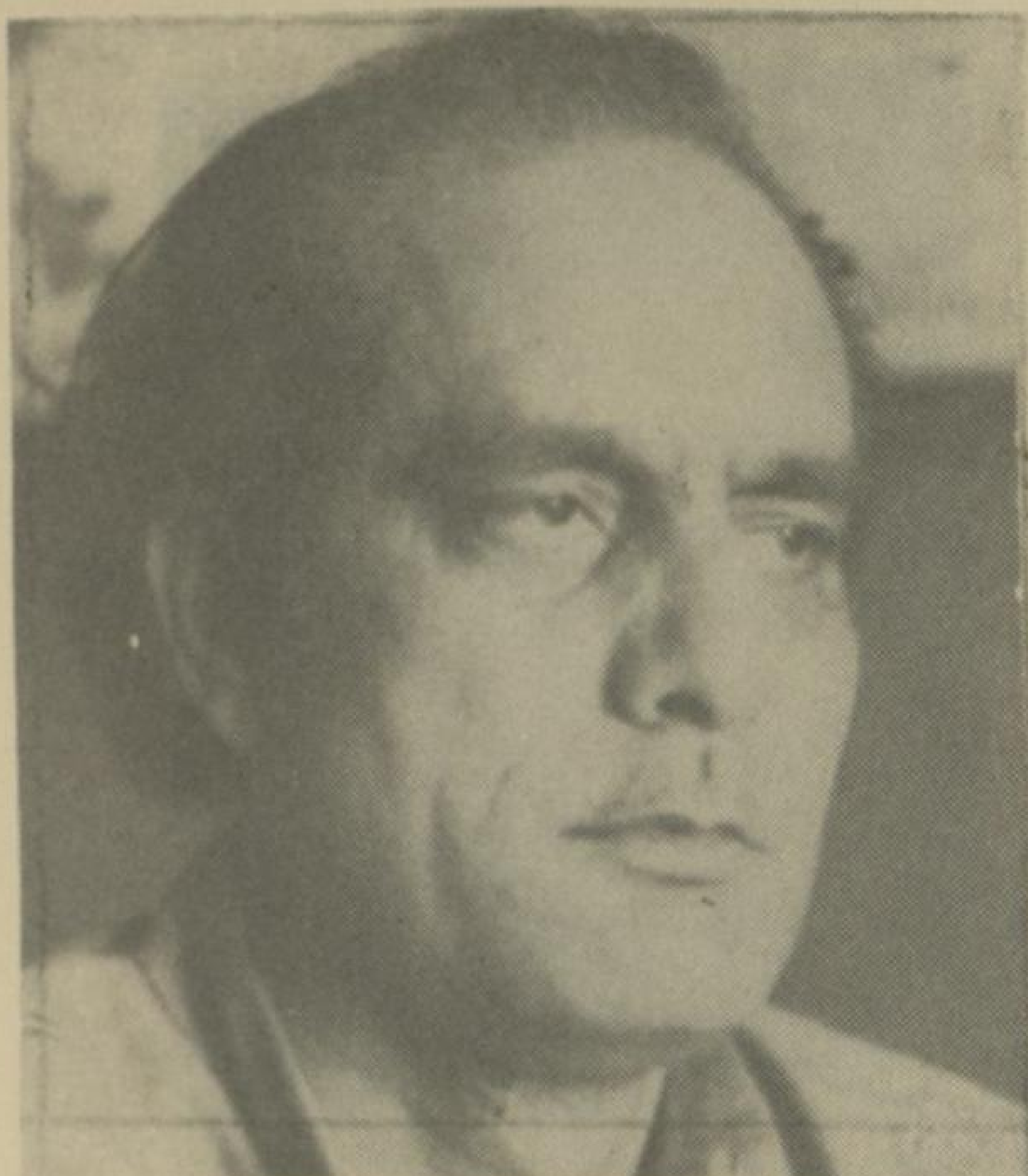


ارشد ملتانی

اصل نام رسول بخش ہے، ارشد تخلص کرتے ہیں۔ پیدائش ۱۹۲۴ء میں ملتان میں ہوئی اور وہیں رہائش پذیر ہیں۔ پیشہ کے اعتبار سے طب وجراحت سے منسلک ہیں۔ آپ اردو اور سرائیکی دونوں زبانوں کے ادیب ہیں اور نظم ونثر کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے ــــ غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے۔ ــــ ۱۹۴۵ء سے شعر گوئی میں مصروف ہیں مگر ابھی تک کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا ہے۔

ارشد ملتانی

فکر و احساس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے
سانحہ ذہن پہ جب کوئی گزر جاتا ہے
عشق کی قید نہیں، حسن کی تخصیص نہیں
کوئی نشّہ ہو بہر طور اتر جاتا ہے
خوف موقوف نہیں رات کی تاریکی پر
دل کبھی دن کے اجالے سے بھی ڈر جاتا ہے
اشک ان آنکھوں میں بھر آئے تو محسوس ہوا
روئے گل خنکیٔ شبنم سے نکھر جاتا ہے
یوں رہِ زیست پہ جاتا ہوں تھکا ہارا سا
جیسے مزدور کوئی شام کو گھر جاتا ہے
غم کی شدّت تو بہر حال ہے مہلک ارشدؔ
آدمی فرطِ مسرت سے بھی مر جاتا ہے



اطہر نفیس

ماں باپ نے کنور اطہر علی خاں نام تجویز کیا تھا مگر شاعری کے حوالے سے تقدیر نے اطہر نفیس بنا دیا۔ اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کنور اطہر علی خاں سے اطہر نفیس بن جانا، یہی میری جزا ہے اور یہی میری سزا بھی ہے۔ بہر حال میں اس سلسلے میں بیحد مطمئن ہوں"۔

اطہر نفیس ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ (بھارت) کے ایک قصبہ ٹپل میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد چوہدری معصوم علی خان ایک بڑے زمیندار تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اطہر نفیس ۱۹۴۸ء میں کراچی آ گئے اور جب سے وہیں مقیم ہیں۔ یوں تو شعر گوئی کا آغاز علی گڑھ ہی میں ہو گیا تھا مگر سنجیدگی اور باقاعدگی کے ساتھ شعر کہنے کا سلسلہ کراچی آکر شروع ہوا۔ غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے۔ ایک مجموعۂ غزلیات "کلام" کے نام سے ۱۹۷۵ء میں مکتبہ فنون لاہور کے اہتمام سے طبع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔

اطہر نفیس

کیا وقت پڑا ہے، ترے آشفتہ سروں پر
اب دشت میں ملتے نہیں، ملتے ہیں گھروں پر

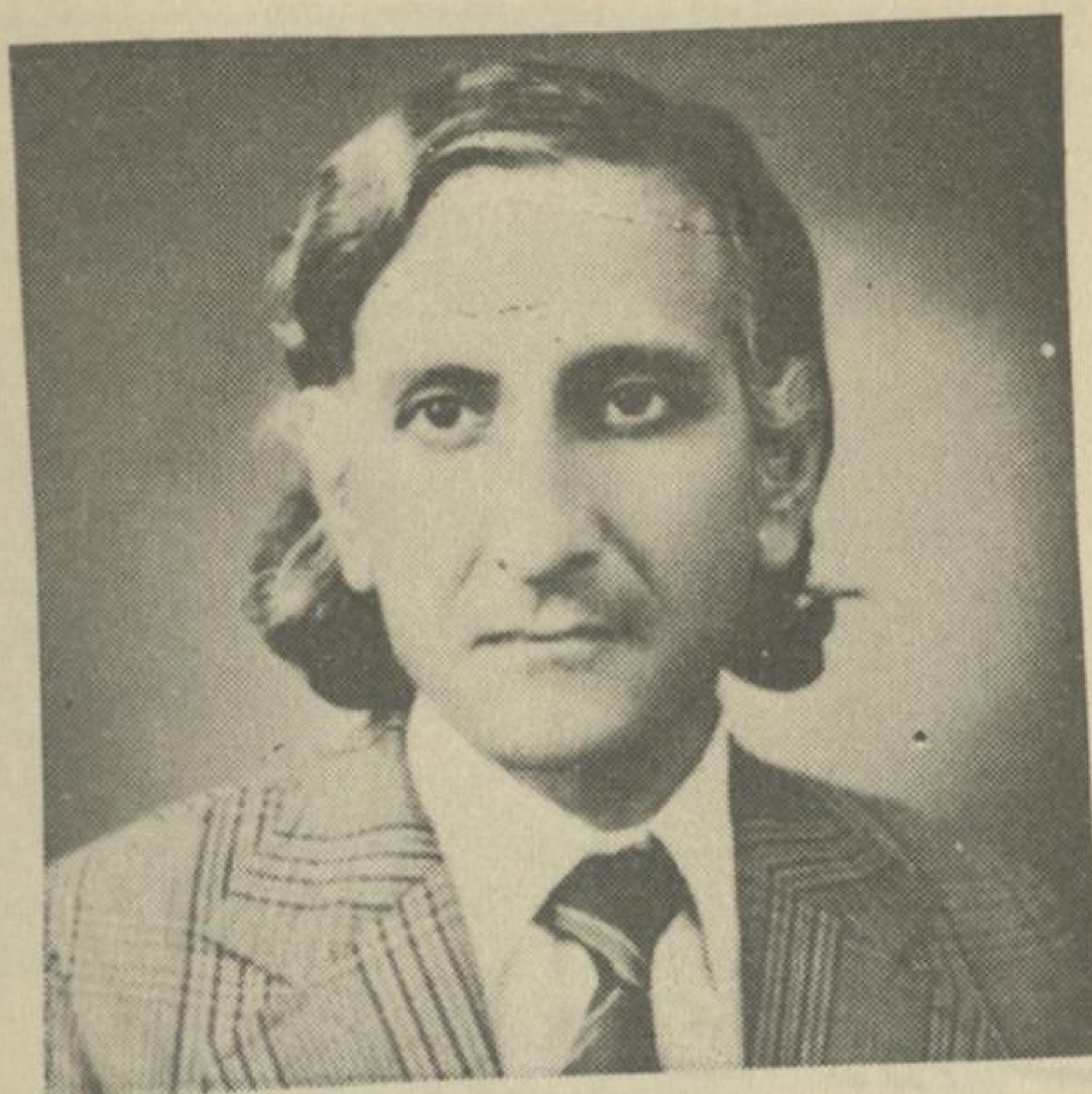
پہچان لو، اس خاکِ رہِ حرص و ہوا کو
قدموں سے یہ اٹھتی ہے تو گرتی ہے سروں پر

خود اپنے ہی باطن سے ابھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے، تتلی کے پروں پر

سوغات سمجھتے تھے جسے دشتِ وفا کی
وہ خاک بھی سجتی نہیں اب اپنے سروں پر

ابھرا نہ ترا حسنِ خدوخال ابھی تک
تصویر تری قرض ہے، تصویر گروں پر

کانٹے بھی چنے راہ کے پتھر بھی ہٹائے
منزل نہ ہوئی سہل، مگر ہمسفروں پر



اظہر جاوید

۴ جنوری ۱۹۳۸ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ سرگودھا سے دسویں کا امتحان اور لاہور سے بی اے پاس کیا، سرگودھا کے قیام کے دوران ہی شعر وشاعری کا آغاز ہوا۔ مختلف ملازمتیں کرنے کے بعد بالآخر صحافت کو اپنایا۔ آج کل اپنا رسالہ ماہنامہ "تخلیق" نکال رہے ہیں۔ روزنامہ "امروز" میں ادبی ایڈیشن کے نگران بھی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے روزناموں میں بھی کالم لکھتے ہیں۔ ایک کتاب بلغاریہ کے افسانوں کے تراجم پر مشتمل چھپ چکی ہے۔ کچھ اور ممالک کے افسانے بھی ترجمہ کئے ہیں، جو ابھی شائع نہیں ہوئے۔ شعری مجموعے "شہرِ غم" اور "خزاں کے پتّو، میرے رفیقو!" زیرِ طبع ہیں۔

اظہر جاوید

سرورِ قرب تو ہے نشّۂ وصال نہیں
بدن مہکتے ہیں، خوشبو کا احتمال نہیں

وہ میرے سامنے بیٹھی ہے اک غزل بن کر
مری گرفت میں لیکن مرا خیال نہیں

بچھڑ کے پھر جو ملے ہیں وفا کی راہوں میں
کسے یقیں کہ مقدّر کی یہ بھی چال نہیں

تمہاری آنکھوں میں لکھّا نہیں جواب کوئی
مرے لبوں پہ مچلتا کوئی سوال نہیں

تجھے میں یاد رکھوں، وقت کو نہیں منظور
تجھے میں دل سے بھلا دوں مری مجال نہیں

افق افق نئی صبحوں کے رنگ پھیلیں گے
جو ڈوبتا ہے یہ سورج اسے اچھال نہیں

تو اپنے طرزِ تغافل پہ کیوں پشیماں ہے
مجھے تو اپنی تباہی کا کچھ ملال نہیں

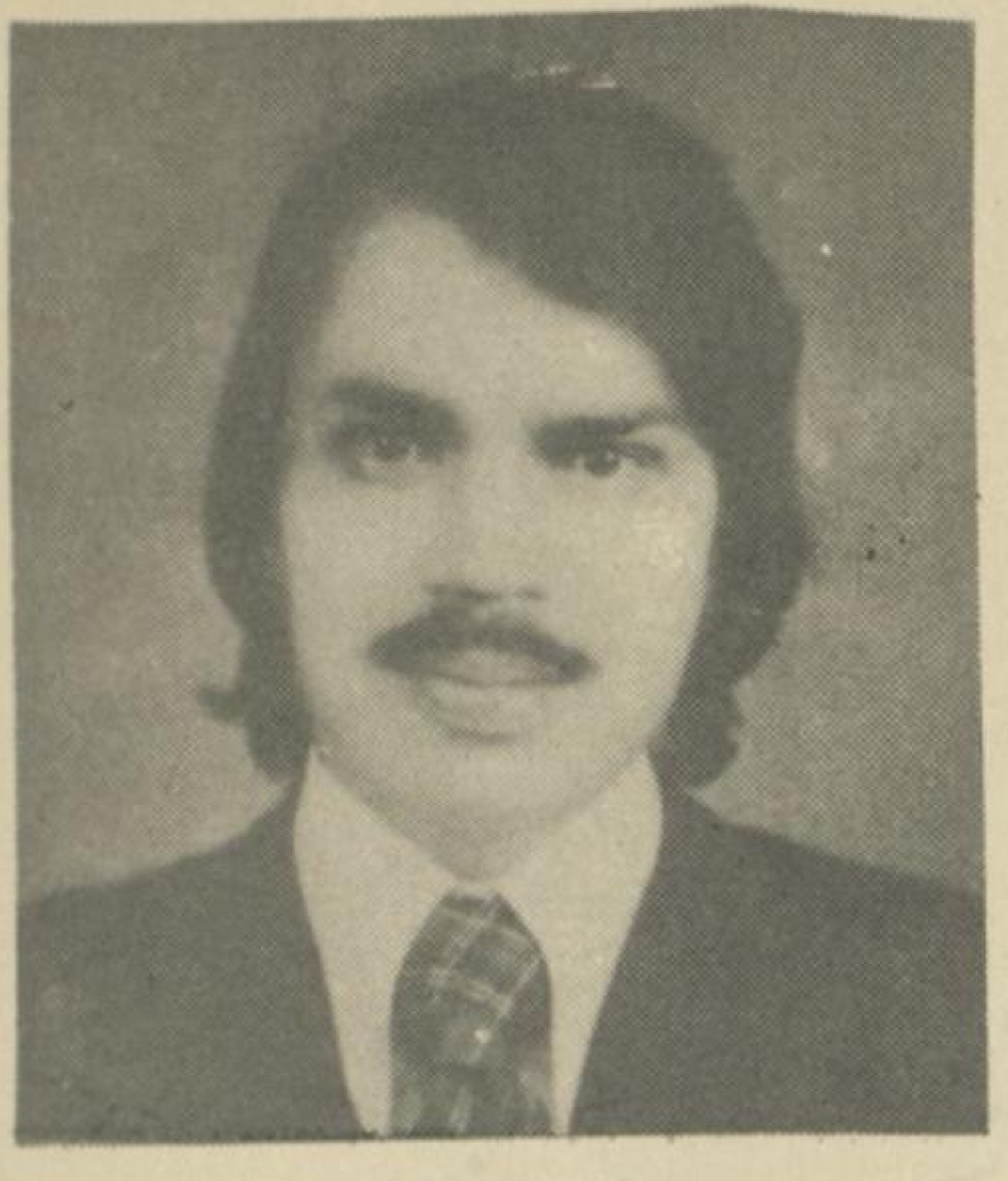
نقیبِ صبحِ ازل دیکھ تھک چکا ہوں میں
شبِ حیات کی افتادگی کو ٹال نہیں

یہی کہا تھا یہاں جبر کی حکومت ہے
تو اس خطا پہ ہمیں شہر سے نکال نہیں

میں کیسے روکوں گا اظہرؔ غموں کی تاریکی
کہ میرے ہاتھ میں اب چاندنی کی ڈھال نہیں

ہمارے متقدمین شعرأ کے یہاں مے نوشی پر فخر ہوتا تھا اور زاہدوں کو للکارا جاتا تھا۔ اس وقت ان باتوں میں سچائی تھی۔ رندوں اور زاہدوں کی ٹولیاں بنی ہوئی تھیں اور ان میں نوک جھونک رہتی تھی۔ آج یہ باتیں ثقہ اور متدین شعراء کو زیب نہیں دیتیں۔ اصول شاعری کے مطابق یہ مضامین غزل میں باندھنا صرف ان لوگوں کا حق ہے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہیں یا پھر ان کو بطور مجاز استعمال کرتے ہیں۔

(ڈاکٹر شوکت سبزواری)



اعتبار ساجد

پورا نام سیّد اعتبار ساجد ہے۔ آپ کی تاریخ پیدائش یکم جولائی ۱۹۴۸ء ہے۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کر کے آپ تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے، ان دنوں گورنمنٹ کالج نوشکی (بلوچستان) میں لیکچرار ہیں۔

اعتبار ساجد ۱۹۶۴ء سے لکھ رہے ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں آپ کا قلم روانی سے چلتا ہے، آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں :-

دستک بند کواڑوں پر (مجموعہ کلام ۱۹۷۷ء)

آمد (مجموعہ کلام ۱۹۸۰ء)

راجو کی سرگذشت، آدم پور کا راجہ، پھول سی اک شہزادی، مٹی کی اشرفیاں (بچوں کے لئے کتابیں)

ان کے علاوہ "ادبی مسائل" (مضامین) بدن کا لہجہ (ناولٹ) اور سندباد لاہور میں (مزاحیہ مضامین) اشاعت کے مراحل میں ہیں۔

اعتبار ساجد

جانتے ہو وہ سوختہ دل شاعر ہے خود کن حالوں میں
تم تو دیکھتے رہتے ہو گے اس کا نام رسالوں میں

شہرِ ہوا میں جلتے رہنا اندیشوں کی چوکھٹ پر
رات گئے تک اُلجھے رہنا بے مفہوم خیالوں میں

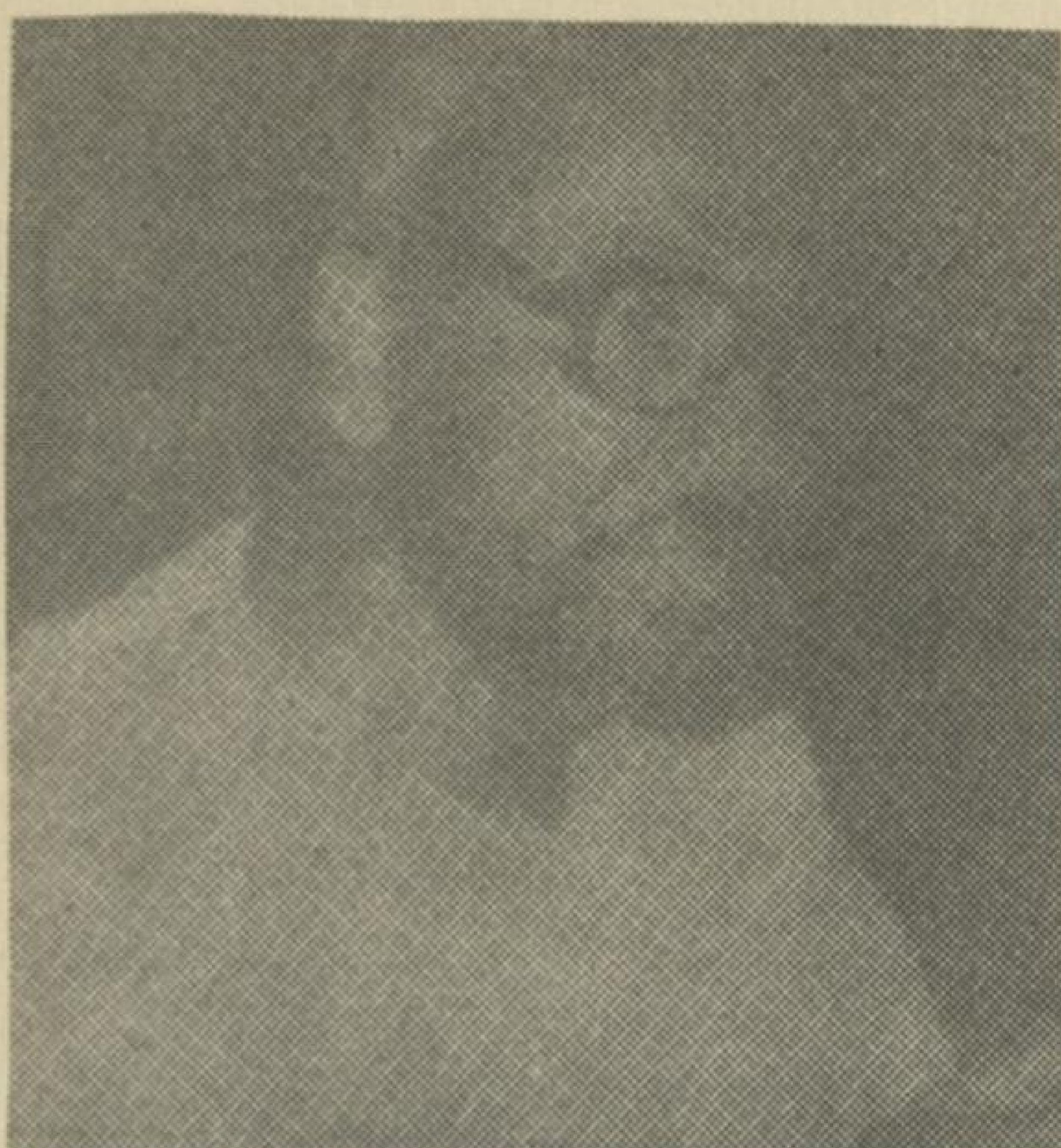
قصرِ عمر گواہی دے گا کیسے کیسے کرب سہے
کیسی کیسی رُت گذری ہے ہم پر اتنے سالوں میں

دوشِ خلاء سے خاکِ زمیں پر اُترے تو احساس ہوا
تارے بانٹنے والے راہی، پڑ گئے کن جنجالوں میں

لے آئی کس قریۂ شب میں اک جھوٹے مہتاب کی چاہ
سایہ سایہ بھٹک رہا ہوں بے تنویر اجالوں میں

موسم موسم یہی رہا گر خوشبو کی تحقیر کا رنگ
سیسے کی کلیاں پھوٹیں گی اب لوہے کی ڈالوں میں

ساجد اب تک بھگت رہے ہیں اِک بے انت سزا کی عمر
اپنا نام لکھا بیٹھے تھے اک دن جینے والوں میں



اعجاز رحمانی

آپ کا پورا نام سیّد اعجاز علی رحمانی ہے۔ آپ ۱۲ فروری ۱۹۳۶ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سیّد ایوب علی تھا۔ اعجاز رحمانی کی عمر ابھی نو برس کی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا، ان کی وفات کے تین برس بعد، والد بھی رخصت ہوئے، آپ کی دادی بڑی باہمت خاتون تھیں جنہوں نے مشکل حالات میں آپ کی پرورش کی۔ انہی حالات کے سبب آپ اسکول کی تعلیم بھی مکمل نہ کر سکے، مگر اپنے طور پر ادیب اور اردو فاضل کے امتحانات پاس کر لئے۔

اعجاز رحمانی ۱۹۵۴ء میں پاکستان آئے۔ کچھ مدّت میرپور خاص میں قیام رہا۔ پھر آپ کراچی آ گئے اور ابراہیم انڈسٹری عثمان آباد کراچی میں ملازمت کر لی۔ ان دنوں آپ پاکستان ٹوبیکو کمپنی سے منسلک ہیں۔

آپ کی منظومات پر مشتمل ایک مجموعہ "کاغذ کے سفینے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے ایک مجموعۂ نعت "اعجازِ مصطفےٰ" بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ ایک اور نعتیہ مجموعہ "پہلی کرن، آخری روشنی" اشاعت کے مراحل میں ہے۔ غزلوں کا مجموعہ بھی "جذبوں کی زبان" کے نام سے ترتیب دے چکے ہیں۔

اعجاز رحمانی

اب کرب کے طوفاں سے گزرنا ہی پڑے گا
سورج کو سمندر میں اترنا ہی پڑے گا

فطرت کے تقاضے کبھی بدلے نہیں جاتے
خوشبو ہے اگر وہ تو بکھرنا ہی پڑے گا

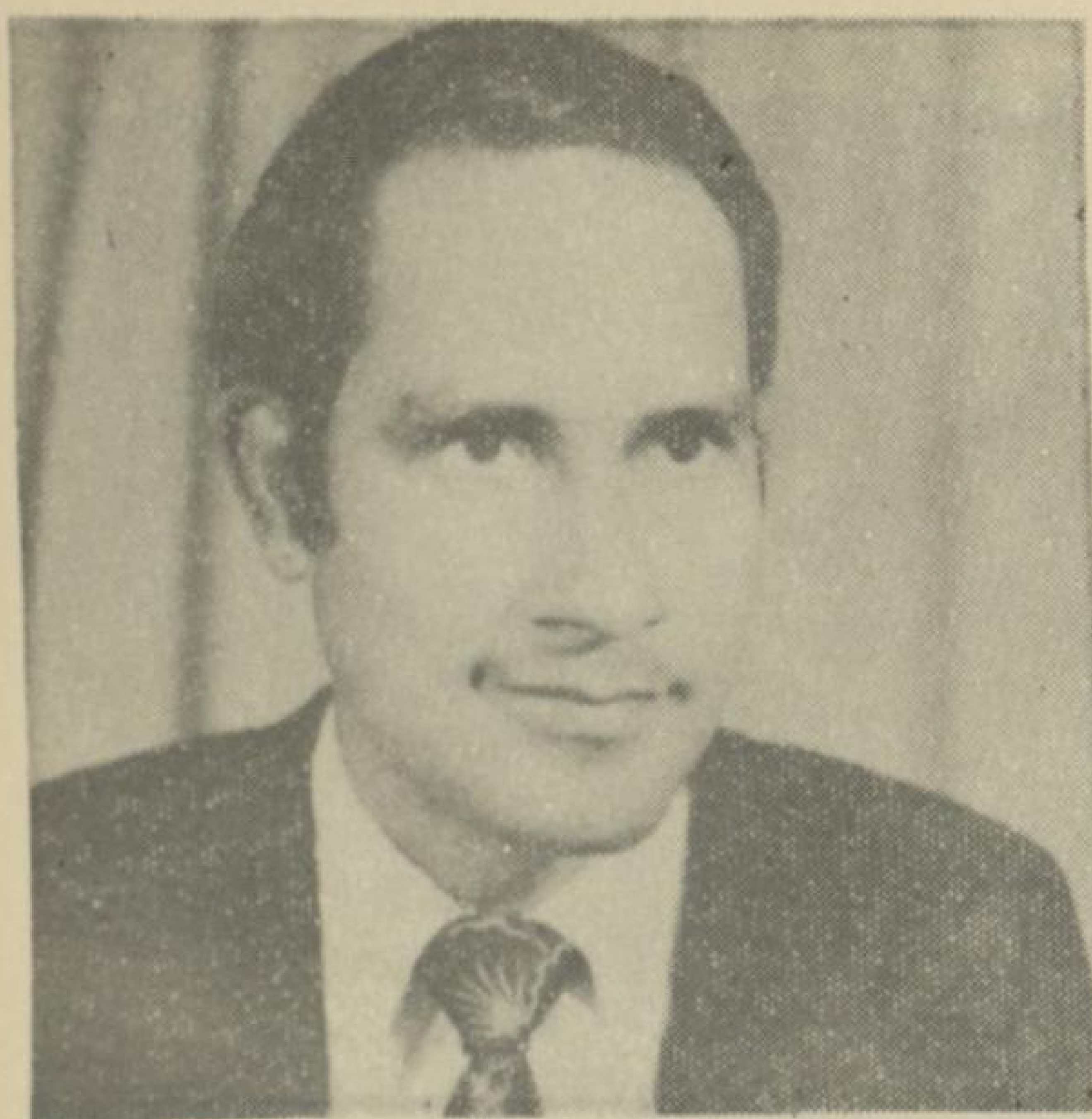
پڑتی ہے تو پڑ جائے شکن اس کی جبیں پر
سچائی کا اظہار تو کرنا ہی پڑے گا

ہر شخص کو آئیں گے نظر رنگ سحر کے
خورشید کی کرنوں کو بکھرنا ہی پڑے گا

میں سوچ رہا ہوں یہ سرِ شہرِ نگاراں!
یہ اس کی گلی ہے تو ٹھہرنا ہی پڑے گا

اب شانۂ تدبیر ہے ہاتھوں میں ہمارے
حالات کی زلفوں کو سنورنا ہی پڑے گا

اک عمر سے بے نور ہے یہ محفلِ ہستی
اعجازؔ کوئی رنگ تو بھرنا ہی پڑے گا



افتخار اجمل شاہین

افتخار اجمل نام اور شاہینؔ تخلص ہے۔ آپ کا سن ولادت ۱۹۴۲ء ہے۔ افتخار اجمل اردو اور فارسی کے ایم اے ہیں۔ آپ نے بنگلہ اکادمی سے بنگلہ سرٹیفکٹ اور خانۂ فرہنگ ایران سے جدید فارسی کا کورس مکمل کیا۔

آپ ۱۹۶۳ء میں پاکستان آئے اور بہ سلسلہ ملازمت چاٹگام اور ڈھاکہ میں مقیم رہے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد آپ کراچی آ گئے۔ ان دنوں آپ سراج الدولہ گورنمنٹ کالج میں شعبۂ اردو سے منسلک ہیں۔

افتخار اجمل نے ابتداً عطا کاکوی اور عندلیب شادانی سے مشورۂ سخن کیا۔ آپ اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی شعر لکھتے ہیں۔ کلام برصغیر کے مقتدر جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

مجموعہ کلام ابھی تک طبع نہیں ہوا ہے۔

افتخار اجمل شاہین

یہ ترا بانکپن یہ رعنائی
رشکِ مہتاب تیری زیبائی
حسن تیرا عجب کرشمہ ہے
ایک عالم بنا تماشائی

یاد آیا مجھے بدن تیرا
دُور قوسِ قزح جو لہرائی

جب سے شمعِ وفا جلائی ہے
انجمن بن گئی ہے تنہائی

یوں گذرتے ہیں دیکھ کر مجھ کو
جیسے مجھ سے نہیں شناسائی

دیپ یادوں کے جل ہی جاتے ہیں
چھیڑ دیتی ہے جب بھی پُروائی

نشترِ غم نہ جس کو راس آیا
زیست اس کو کبھی نہ راس آئی

ایک روئے حسیں نظر آیا
اب چراغوں میں روشنی آئی

عشق کی خود سپردگی دیکھی
خود تماشا بنا تماشائی

لوچ تیری صدا کا یوں ابھرا
دُور بجتی ہو جیسے شہنائی

جائیے ہیں ہی بے وفا ٹھہرا
آپ کو اور کہوں میں ہرجائی!

آرزو تیری دشمنِ جاں ہے
جاں سے گذرے ترے تمنّائی

اس نے توڑا یہ کہہ کے آئینہ
کیوں بنوں میں ترا تماشائی

میرے تینوں طرف فصلیں ہیں
اور آگے ہے اک بڑی کھائی

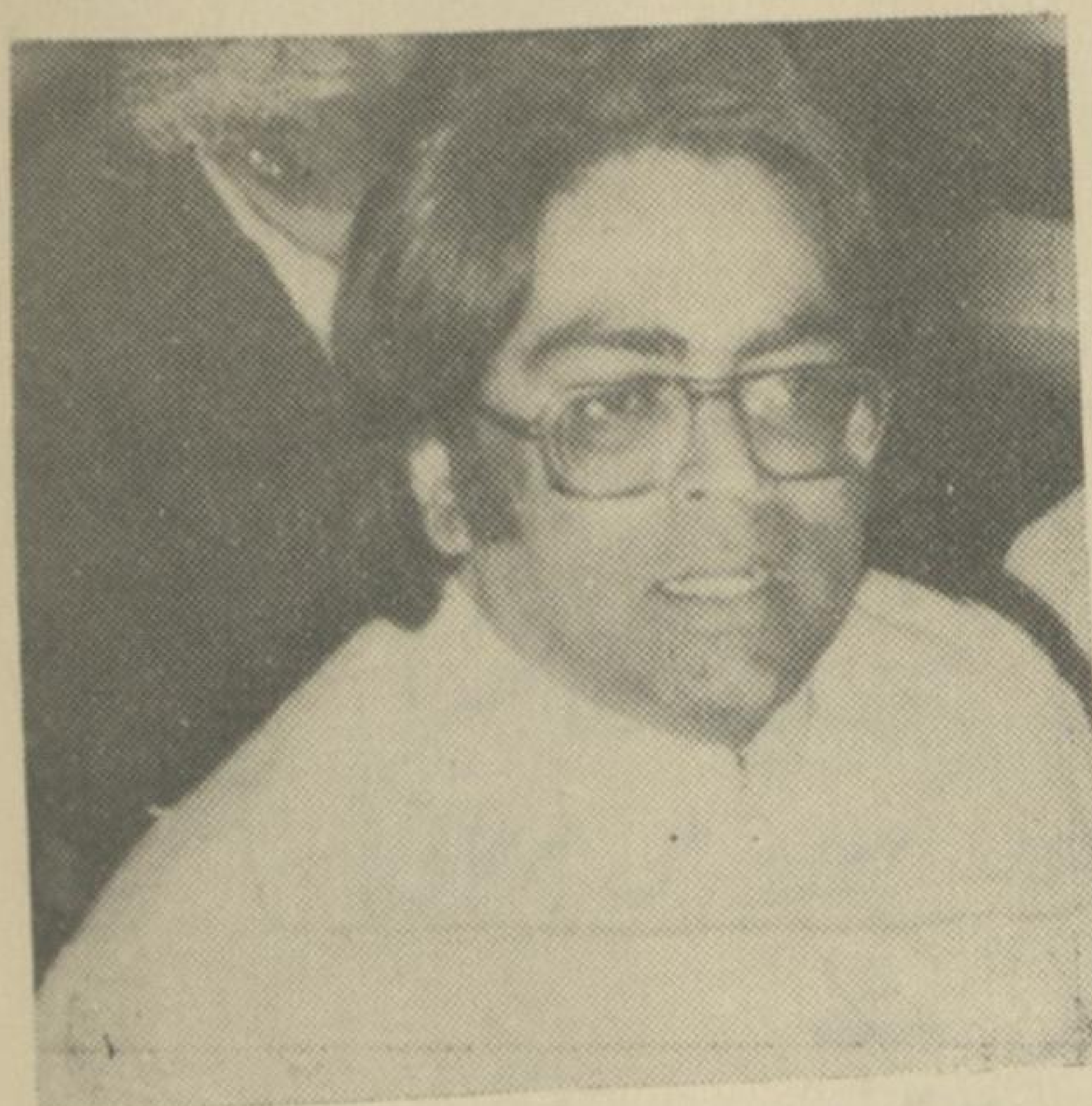
درد دل کا بڑھا دیا کچھ اور
خوب تم نے یہ کی مسیحائی

اُن کو دنیا نے آفتاب کہا
اپنے حصّے میں آئی رسوائی

چاند بن کر فضا میں لہراؤ
کتنی سونی پڑی ہے انگنائی

مبالغہ آمیز خیال بندی اور معنی آفرینی کبھی کبھی ایک جیتی جاگتی تصویر کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور چشمِ تصوّر کے سامنے ایسے واقعات آتے ہیں جن میں اور تو سب کچھ ہوتا ہے لیکن زندگی کی سچائی ہرگز نہیں ہوتی۔ ایسے موقعوں پر شاعر کا مبالغہ پسند تصوّر خیال کے دور دراز رشتوں کو جوڑ کر جو نقشے مرتّب کرتا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس کے واردات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

(سید وقار عظیم)



افتخار عارف

پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ ننہال ڈیوڑھی آغا میر اور ددھیال فرنگی محل میں ہے اسی لئے ابتدائی تعلیم مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں حاصل کی جس کے بعد ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ گورنمنٹ کالج لکھنؤ سے پاس کرنے کے بعد پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لئے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ جرنلزم کا ایک کورس کولمبیا یونیورسٹی سے بھی کیا ہے۔ ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن سے وابستگی کے دوران پروڈیوسر، سینئر پروڈیوسر، اسکرپٹ ایڈیٹر کے عہدوں پر کام کرتے رہے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن سے پروگرام بھی کئے اور خبریں بھی پڑھیں پھر استعفیٰ دے کر، بی سی سی آئی بنک میں ملازمت اختیار کی۔ وہاں سے ان کی خدمات اسی بنک کے ایک ذیلی ادارے کو منتقل کر دی گئیں۔

نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مجموعۂ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ توقع ہے کہ جلد ہی "گرد باد" کے نام سے شائع ہو جائے گا۔ البتہ آپ کی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ایک عدد لانگ پلے نکل چکا ہے۔

افتخار عارف

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

یہ روشنی کے تعاقب میں بھاگتا ہوا دن
جو تھک گیا ہے تو اب اس کو مختصر کر دے

میں زندگی کی دعا مانگنے لگا ہوں بہت
جو ہو سکے تو دعاؤں کو بے اثر کر دے

ہوا کا زہر جڑوں تک پہنچ چکا ہے تو پھر
مری ہری بھری شاخوں کو بے ثمر کر دے

ستارۂ سحری ڈوبنے کو آیا ہے
ذرا کوئی میرے سورج کو باخبر کر دے

قبیلہ وار کمانیں کڑکنے والی ہیں
مرے لہو کی گواہی مجھے نڈر کر دے

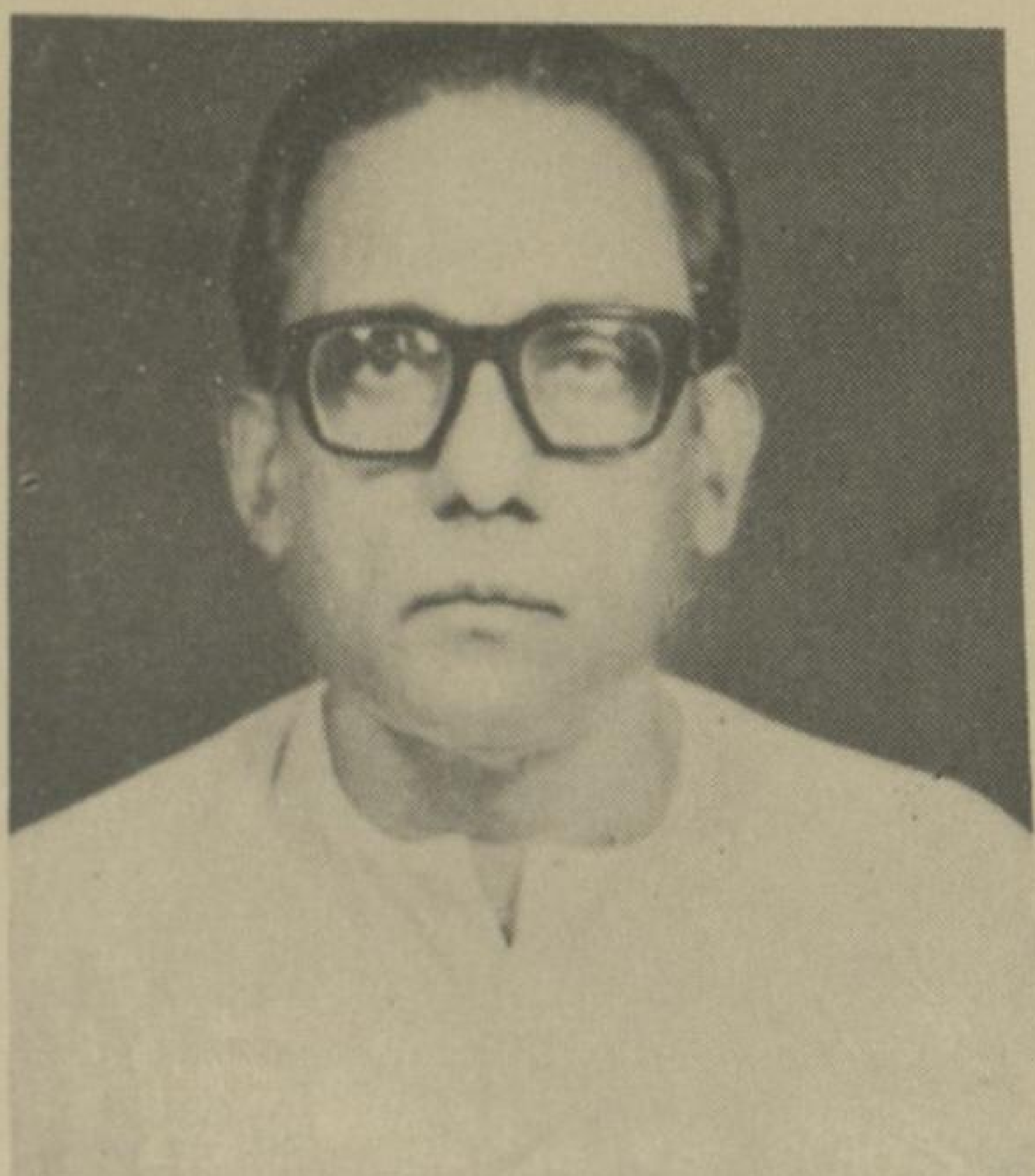
بچھڑ گئے ہیں جو مجھ سے انہیں امان میں رکھ
وہ چاہتے ہیں تو ان کو سپردِ زر کر دے

مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے

میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا
اجاڑ دے میری مٹّی کو در بدر کر دے

تشبیہ اور استعارے سے شعرا نے بڑے کام لئے ہیں۔ یہ اختصار کے ساتھ ساتھ محاکات کا حق بھی ادا کر دیتے ہیں، لیکن جن شعرا نے تشبیہ و استعارہ میں بھی نازک خیالی کو ملحوظ رکھا ہے، ان کے یہاں آپ کو یہ محاکاتی رنگ نظر نہیں آئے گا۔ ایسے اشعار یا تو چیستان بن جاتے ہیں یا محض ایک ذہنی مشق ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(پروفیسر عبدالسلام)



افسر ماہ پوری

افسر ماہ پوری کا اصل نام ظہیر عالم صدیقی ہے۔ آپ یکم دسمبر ۱۹۱۸ء کو ماہ پور میں پیدا ہوئے جو بہار (بھارت) میں واقع ہے۔

افسر ماہ پوری، مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت کے ملازم تھے۔ جہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد اب کراچی میں ریٹائرڈ زندگی گذار رہے ہیں۔

آپ نے قاضی نذر الاسلام کی پچیس ۲۵ اسلامی نظموں کا منظوم ترجمہ کیا جو بنگالی اکیڈمی ڈھاکہ کی طرف سے "جامِ کوثر" کے نام سے شائع ہوا۔

آپ کے افسانوں، مقالوں اور شاعری کے متعدد مجموعے ترتیب و اشاعت کے مراحل میں ہیں۔

افسر ماہ پوری

کیا بتائیں حالِ دل اُن کی شناسائی کے بعد
حَبس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے پُروائی کے بعد

ایک مدّت پر، خیال اُن کا کہاں سے آگیا
کتنی اچھی انجمن لگتی ہے تنہائی کے بعد

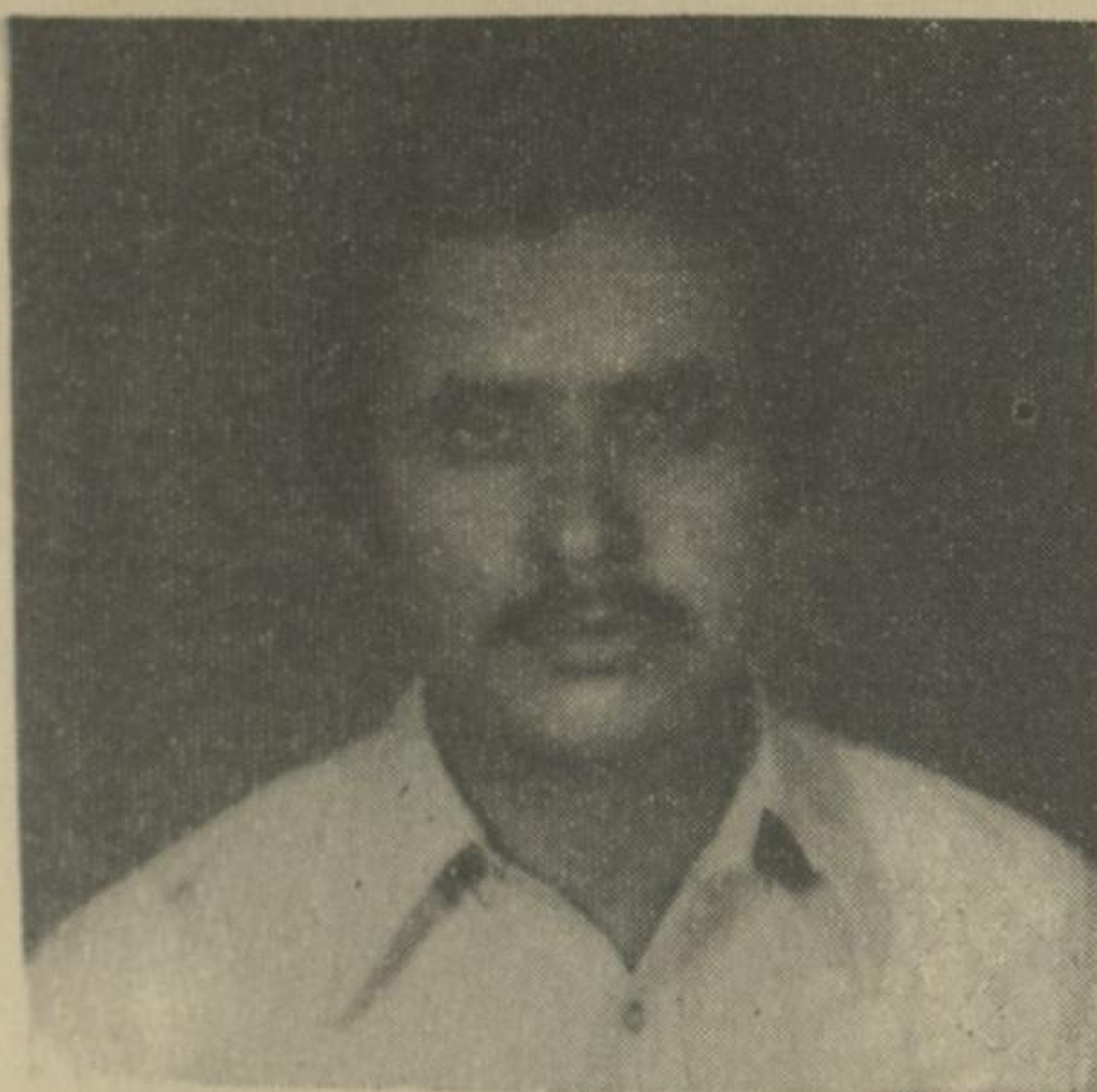
جب نظر آیا نہ ساحِل ان کی چشمِ ناز میں
کیا دکھائی دے گا وہ، دریا کی گہرائی کے بعد

دَر بدَر کی ٹھوکریں کھائیں محبت میں تو کیا
ہو گئے ہم محترم، کچھ اور رسوائی کے بعد

ہم کہاں ہوں گے، نہ جانے، اس تماشا گاہ میں
کس تماشائی سے پہلے، کس تماشائی کے بعد

اُن کے بارے میں فقط اتنا ہمیں معلوم ہے
اب وہ رہتے ہیں ہمارے دل کی انگنائی کے بعد

خوب ہے افسرؔ ہمیں اپنی حقیقت کی خبر
کیا ہمارا نالۂ دل، اُن کی شہنائی کے بعد



افضل آرش

آپ کا خاندانی نام محمد افضل اور قلمی نام افضل آرش ہے۔ آپ دسمبر ۱۹۵۲ء میں لاہور میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیمی مراحل طے کئے، ۱۹۷۸ء میں افضل آرش نے پنجاب یونیورسٹی سے بی، اے کا امتحان پاس کیا۔

افضل آرش، اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ آپ کی شاعری کا پہلا مجموعہ "نئے موسم کی پہلی بارش" جلد ہی منظرِ عام پر آنے والا ہے۔

افضل آرش

پرندے بادلوں میں کھو گئے ہیں
گھروندے خالی ہو گئے ہیں

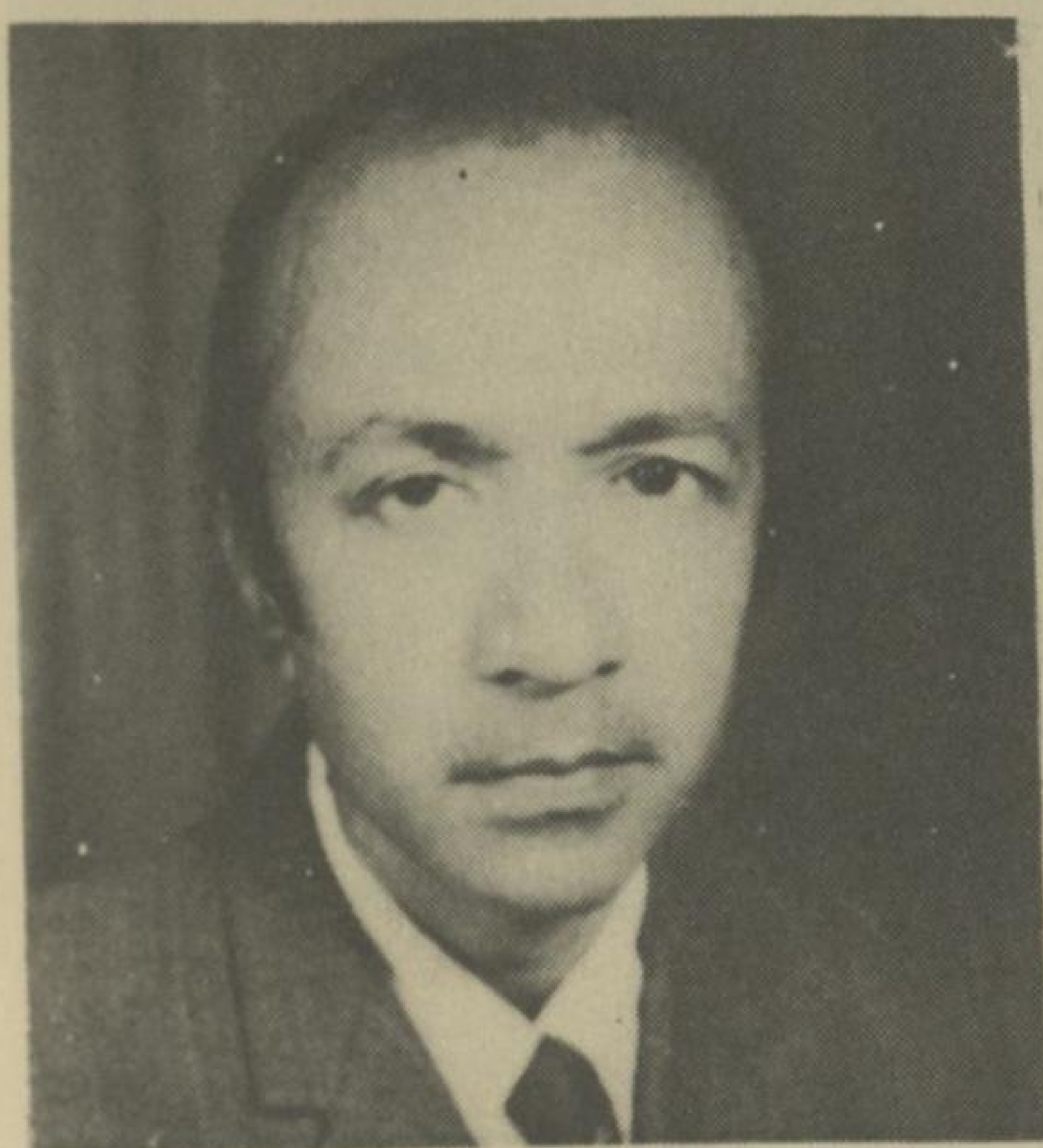
ہوا نے بولنا سیکھا ہے جب سے
شجر ناراض کتنے ہو گئے ہیں

ہر اُگتی فصل میں ہے زہر ہی کیوں
یہ دہقاں کیا زمیں میں بو گئے ہیں

مٹائے فرق کیا کیا پانیوں نے
بڑے چھوٹے برابر ہو گئے ہیں

وہ گرمی ہے کہ جل جائیں گے اعضاؔ
زمیں کے لوگ سُورج ہو گئے ہیں

فلک سے بارشیں ہیں رحمتوں کی
زمیں کے بخت روشن ہو گئے ہیں



افضل صدیقی

آپ کا اصل نام محمد افضل حسین صدیقی اور تخلص افضل ہے۔ آپ ۳ رمئی ۱۹۳۰ء کو دہلی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ صحافت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ آج کل روزنامہ "امن" کراچی کے مدیر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ شاعری کے علاوہ آپ طنز و مزاح اور انشائیہ بھی لکھتے ہیں۔ آپ نے ناروے کے ادیب زیتیرے ہوَم کے ڈرامے کا پہلی بار اردو ترجمہ "شنگھائی کی عورتیں" کے نام سے جمیل الدین عالی کی زیر نگرانی کیا۔ آپ گزشتہ ۳۲ سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔
"بچوں کی لوریاں"۔ مجموعۂ قطعات اور "ریڈیو ٹی وی اور صحافت کے تجربے" آپ کی تصانیف ہیں جو ترتیب و اشاعت کے مراحل میں ہیں۔

افضل صدیقی

نئے چراغ جلاؤ وفا کی راہوں میں
بڑے حسین بلاوے ہیں اُن نگاہوں میں

نہ جانے کون جلاتا ہے آنسوؤں کے چراغ
دیارِ گل میں تبسّم کی جلوہ گاہوں میں

ضرور کوئی بہاروں کا قافلہ ہوگا
غبار اُڑ تو رہا ہے خزاں کی راہوں میں

کسی کی یاد کا اک لمحۂ فروزاں تھا
کہ ایک خوابِ سحر رات کی نگاہوں میں

نگارِ صبح کو اے انتظارِ بے پایاں
ذرا تلاش کریں شب کی خواب گاہوں میں

تری نظر کا سہارا نہ آرزو کا فریب
بہت دنوں سے اکیلا ہوں غم کی راہوں میں

کہیں قریب کہیں دُور ہو گئے افضلؔ
وہ زندگی سے مری زندگی کی راہوں میں



اقبال صفی پوری

نام اقبال احمد خلیلی، تخلص اقبالؔ۔ آپ کے جدّ امجد حضرت شاہ خلیل احمد چشتی صابری ہیں۔ انہیں کی نسبت سے آپ خلیلی کہلاتے ہیں۔

اقبالؔ صفی پوری ۹ جولائی ۱۹۲۱ء کو صفی پور میں پیدا ہوئے، جو ضلع اناؤ (بھارت) میں ہے۔ فارسی عربی گھر پر ہی پڑھی، جس کے بعد لکھنؤ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔

اقبالؔ صفی پوری کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے ہے جہاں شعر و ادب، مذہب و ثقافت کی عظیم روایات پہلے سے موجود تھیں۔ آپ کے ذوقِ شعری کو لکھنؤ کے ادبی ماحول نے مزید جلا بخشی۔

اقبال صفی پوری، غزل کے علاوہ نعت بھی کہتے ہیں۔ حال ہی میں بلدیہ کراچی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں، ان دنوں تدوین و ترتیبِ کلام میں مصروف ہیں۔

اقبال صفی پوری

دل وہی عہدِ ملاقات پرانا چاہے
اور زمانہ کہ پلٹ کر ہی نہ آنا چاہے

وہ تو ہر حال میں دُوری ہی بڑھانا چاہے
اب کسی حد پہ ٹھہر جائے زمانہ چاہے

وہ عجب شخص ہے، انداز عجب ہیں اُسکے
کھنچتا بھی جائے، مراسم بھی بڑھانا چاہے

اُس کے پندار کا کیا پوچھنا جو مستِ غرور
کم نگاہی کا بھی احسان جتانا چاہے

دیکھ کر اُس کو زمانے کی طرف کیا دیکھیں
جو وہ چاہے وہی بے درد زمانہ چاہے

ہم وہ دل لائیں کہاں سے کہ پلٹ کر جائیں
وہ یہاں شوق سے آئے اگر آنا چاہے

کبھی بے بات شکایت، کبھی بے وجہ سکوت
وہ تو بس ترکِ محبت کا بہانہ چاہے

سادگی میں بھی ہے اُس غیرتِ گلشن کا وہ رنگ
خود بہار اُس کا حسیں رنگ چُرانا چاہے

یوں دل افروز و حسیں لاکھ ہوں خورشید جمال
جانِ خوبی ہے وہی جس کو زمانہ چاہے

ہونٹ ساکت ہیں، دل افسردہ ہے، آنکھیں بے آب
زندگی تو مجھے پتھر ہی بنانا چاہے

سایۂ زلف نہیں، سایۂ دیوار سہی
کوئی گوشہ ہو، مسافر تو ٹھکانا چاہے

آئے جس غنچے سے آوازِ شناسا اقبالؔ
دل اُس آواز کو تصویر بنانا چاہے

غزل کی ترکیب کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس کا ہر شعر ایک سالم اور مکمل تصوّر کا اظہار کر سکتا ہے۔ غزل کے اشعار میں زندگی کے مختلف مسائل و معاملات سے متعلق سیدھی اور بے تکلف زبان میں اور کبھی اشارہ اور تمثیل کے پردے میں مختلف اصول و نظریات مرتّب کئے جا سکتے ہیں جو ایک دوسرے سے پیوستہ نہ ہوں یعنی مضمون اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے غزل میں لامحدود تنوّع کا امکان ہے۔ یہ امتیاز اور یہ شرف دنیا کی کسی اور زبان کی شاعری میں کسی صنف کو حاصل نہیں۔

(مجنوں گورکھپوری)



اقبال عظیم

۸ جولائی ۱۹۱۳ء کو شہر میرٹھ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن قصبہ ابنہٹہ ضلع سہارن پور ہے لیکن زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ اور اس کے قرب وجوار میں گذرا۔ اور وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ ایم اے (اردو) کا امتحان آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء کی درمیانی مدت میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے ڈھاکہ یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ ہندی اور بنگلہ زبان کے امتحانات بھی اعلیٰ معیار سے پاس کئے۔

ملازمت کا آغاز، قیام پاکستان سے قبل بحیثیت مدرس کیا جس کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے اور ۱۹۵۰ سے ۱۹۷۰ تک مختلف سرکاری کالجوں میں پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ ملازمت کے آخری پانچ برسوں میں صوبائی سیکرٹریٹ نے ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے ان کی خدمات عاریتاً حاصل کرلیں جہاں انہوں نے مشرقی پاکستان کے تمام اضلاع سے متعلق سرکاری معلوماتی کتابوں کے لئے تعلیم اور ادب پر انگریزی زبان میں ابواب لکھے۔ پنشن لینے کے بعد اپریل ۱۹۷۰ میں کراچی آگئے اور اب تک وہیں مقیم ہیں۔

اقبال عظیم کی تصانیف ہیں "مشرقی بنگال میں اردو" (لسانی اور ادبی تذکرہ)۔ "مضراب" (غزلوں کا مجموعہ)، "قاب قوسین" (نعتیہ کلام)، شامل ہیں۔ "سات ستارے" آپ کی ایک اور تصنیف ہے جس میں سات معمارانِ پاکستان کے سوانح حیات درج ہیں۔ اس کے علاوہ حکیم ناطق لکھنوی کے کلام کا مجموعہ "دیوانِ ناطق" کے نام سے مرتب کیا اور شائع کرایا۔ آپ کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ "لب کشا" اور "رہنما تلفظ" ایک دوسری کتاب زیر ترتیب ہے۔

اقبال عظیم

مانا کہ زندگی سے ہمیں کچھ مِلا بھی ہے
اِس زندگی کو ہم نے بہت کچھ دیا بھی ہے

محسوس ہو رہا ہے کہ تنہا نہیں ہوں میں
شاید کہیں قریب کوئی دُوسرا بھی ہے

قاتل نے کِس صفائی سے دھوئی ہے آستیں
اُس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

غرقاب کر دیا تھا ہمیں ناخدا نے آج
وہ تو کہو کہ ایک ہمارا خدا بھی ہے

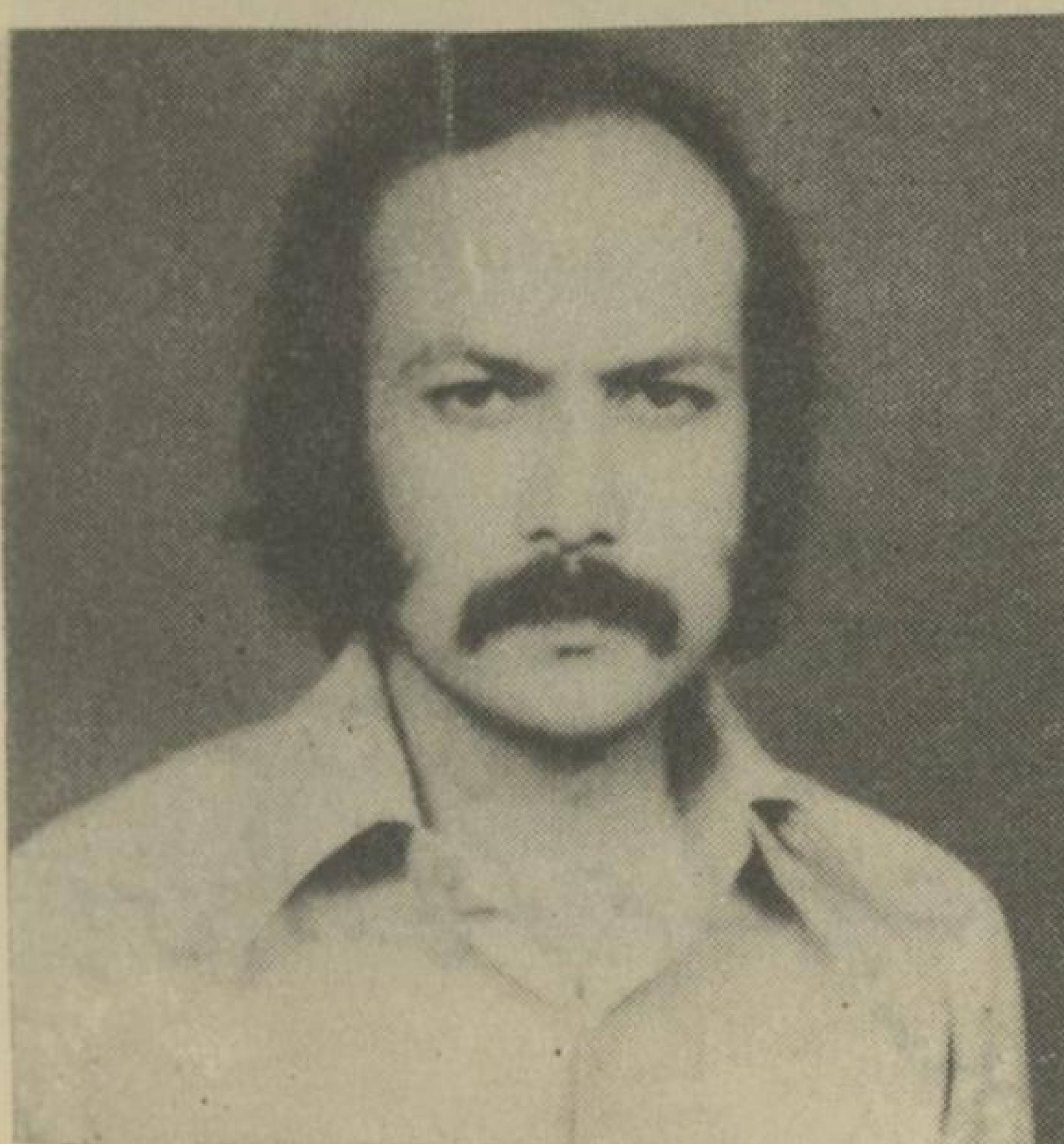
ہو تو رہی ہے کوششِ آرائشِ چمن
لیکن چمن غریب میں اب کچھ رہا بھی ہے

اے قافلے کے لوگو! ذرا جاگتے رہو
سُنتے ہیں قافلے میں کوئی رہنما بھی ہے

یہ حُسنِ اتفاق ہے یا حُسنِ اہتمام
ہے جس جگہ فراُت وہیں کربلا بھی ہے

ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج
آنکھیں بھی ہیں، چراغ بھی ہے، آئنہ بھی ہے

اقبالؔ شُکر بھیجو کہ تم دیدہ ور نہیں
دیدہ وروں کو آج کوئی پُوچھتا بھی ہے



اقبال فریدی

اقبال اعظم نام - ۱۵ دسمبر ۱۹۴۸ء کو کراچی میں پیدا ہوئے - اردو ادب میں ایم اے کر کے ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے - شاعری کے علاوہ افسانہ، تنقید اور تحقیق سے بھی لگاؤ ہے - اپنی شعر گوئی کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"شعر کیوں لکھتا ہوں۔ معاشرے سے "مکّے بازی" نہیں کر سکتا۔ لہذا خود سے لڑتا رہتا ہوں۔ مستقبل میں معاشی طور پر مضبوط ادیب کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہوں"

اقبال فریدی شعر کو کسی شعری ہیئت کا پابند نہیں سمجھتے اس واسطے نثری نظم کی حمایت میں مضامین بھی لکھے اور نظمیں بھی کہیں۔ جب تک راولپنڈی میں بہ سلسلہ ملازمت رہے، گھر کی دُوری ان کو اداس کئے رہی - اُن دنوں یہ شعر اکثر اُن کی زبان پر رہتا تھا ؎

گھر تو ایسا کہاں کا تھا لیکن
دربدر ہیں تو یاد آتا ہے

اقبال فریدی

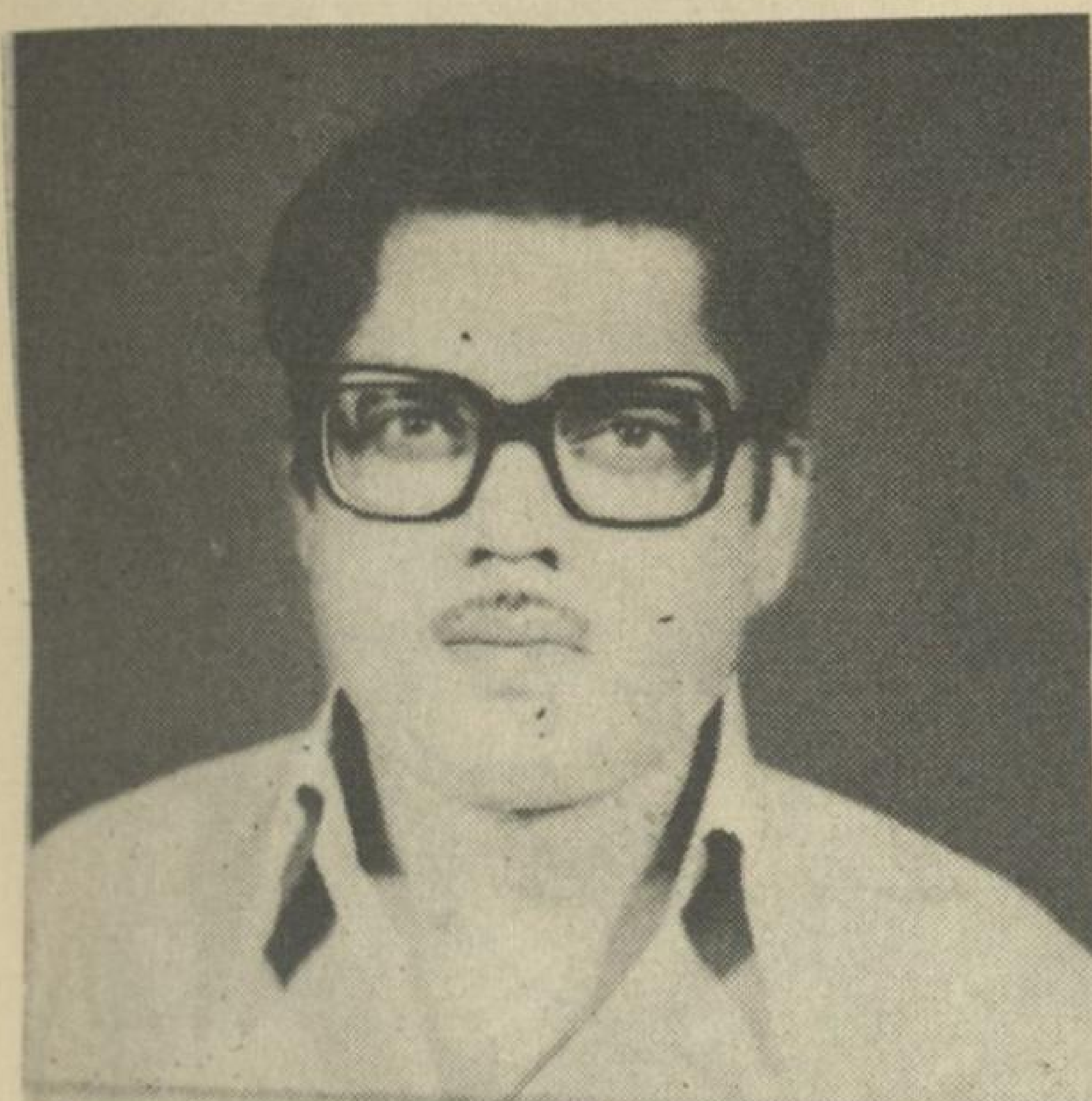
گھر کیا جاتے، اڑتے اڑتے عمر گزر گئی رستے میں
تتلی کے پر رکھے تھے اک روز کسی نے بستے میں

اور بھلا کیا ہونا تھا بس شاموں کی تفریح گئی
دل دے کر وحشت لے آئے چلیے چھوٹے سستے میں

ویسے تو امکان نہیں تھا آج کسی کے آنے کا
پھر یہ کس نے دستک دی ہے چھاجوں پانی برستے میں

کیا بتلائیں اس کے گھر کو کون سا رستہ جاتا ہے
اک دن ہم بھی کھوئے گئے تھے سائیں اسی چورستے میں

پھر اقبال فریدی صاحب اسی کے ہو گئے تم، جس کے
گالوں میں دو گڑھے پڑے بے ساختگی سے ہنستے میں



اقتدار قدر

پورا نام محمد اقتدار الدین حسن دانش مندی اور قدرؔ تخلص ہے۔ قدرؔ کا تعلق بدآیوں کے آلِ صدیق دانش مند خاندان سے ہے۔ ان کے والد کا نام مولوی اقبال الدین تھا جو بدایوں کے زمیندار خاندان کے ایک فرد تھے۔

قدرؔ ۸ جولائی ۱۹۳۴ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے اور وہیں سے ۱۹۴۸ء میں میٹرک کا امتحان مشن اسکول سے پاس کیا اور اسی سال پاکستان آگئے، میرپور خاص میں سکونت اختیار کی۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں محکمۂ انہار سندھ میں ملازمت حاصل کی۔ اب سندھ سیکرٹریٹ میں سرکل سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ دورانِ ملازمت شاہ عبداللطیف گورنمنٹ کالج، میرپور خاص میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۵ء میں سندھ یونیورسٹی سے بی اے آنرز کیا، ۱۹۵۷ء تک قانون کی تعلیم حاصل کی۔

قدرؔ ۱۹۴۸ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر غزل ان کا خاص میدان ہے۔ غزلوں کے دو مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔

اقتدار قدر

ہنگامہ دار و گیر کا ہوتا رہا بہت
پایا کسی نے کچھ، کوئی کھوتا رہا بہت

اٹھا ہوں صبح نو کی خبر سن کے دوستو
تسلیم یہ مجھے کہ میں سوتا رہا بہت

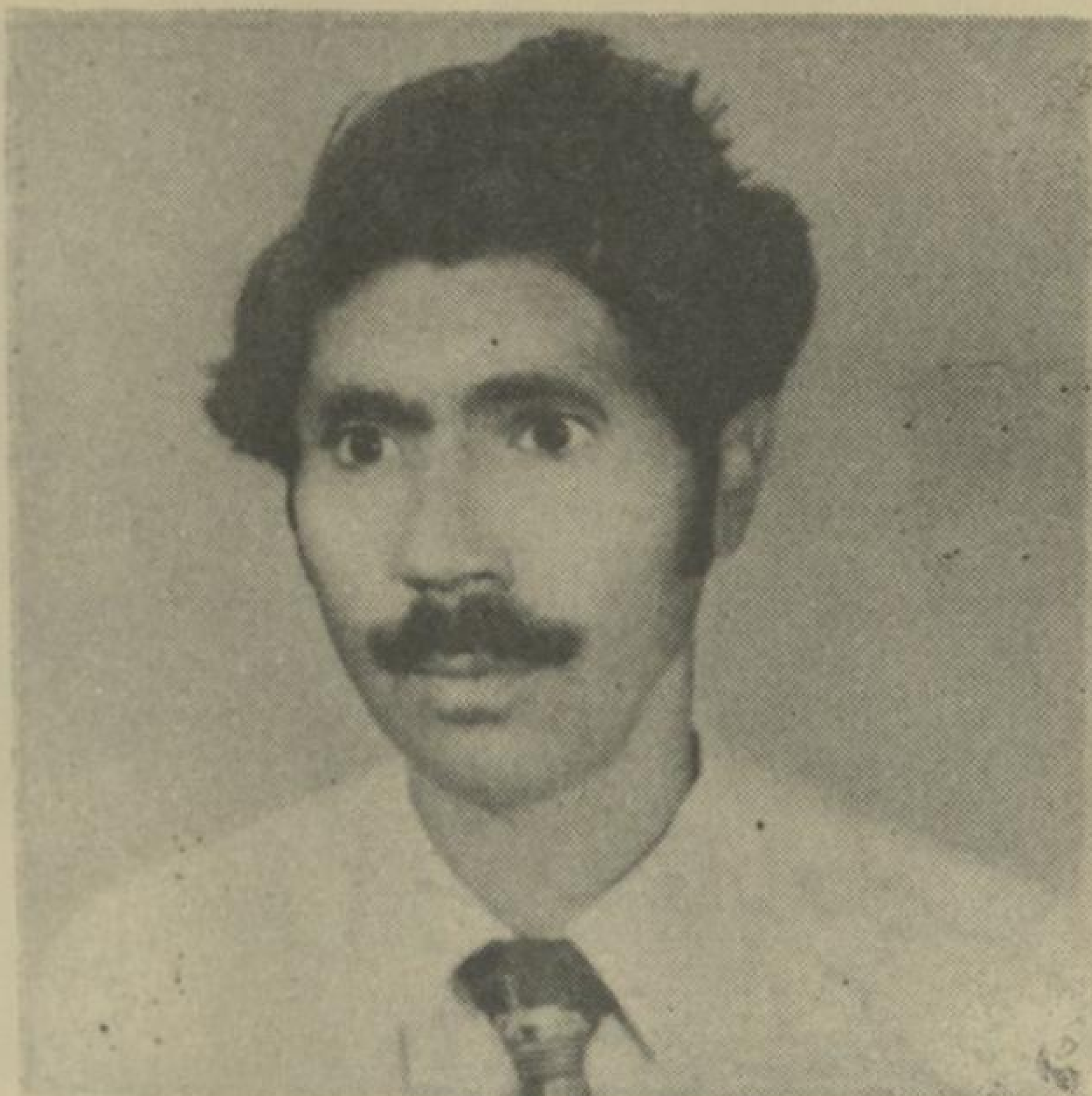
آیا تھا اک خیال کسی مستِ ناز کا
کیا جانئے جو رات میں روتا رہا بہت

پیشانیوں پہ اہلِ ہوس کی چمکتا ہے
وہ داغِ معصیت جو میں دھوتا رہا بہت

بنجر زمین سے نہ اُگا باوفا کوئی
مہر و وفا کے بیج میں بوتا رہا بہت

یارب زمانہ درپئے آزار پھر بھی ہے
کشتی کو اپنی خود میں ڈبوتا رہا بہت

اے قدرؔ تارِ زیست میں آئی نہ تازگی
موتی خلوص کے میں پروتا رہا بہت



اکبر حمیدی

محمد اکبر نام۔ ادبی دنیا میں اکبر حمیدی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اکبر حمیدی کی ولادت ۱۰ اپریل ۱۹۳۵ء کو بمقام فیروز والہ (ضلع گوجرانوالہ) کے ایک جاٹ گھرانے میں ہوئی۔

اردو اور پنجابی میں ایم اے کے امتحانات پاس کئے۔ ان دنوں مارکیٹ کمیٹی گوجرانوالہ میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔

اکبر حمیدی کی پہلی غزل ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ "ادبی دنیا" میں شائع ہوئی۔

پہلا مجموعۂ کلام "لہو کی آگ" ۱۹۷۰ء میں اور دوسرا مجموعہ "آشوبِ صدا" ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔

آپ کی ایک اور تصنیف "کوہ مری کی سیاسی، تاریخی، مذہبی اور معاشرتی زندگی" ہے۔ جو ابھی طبع نہیں ہوئی۔

اکبر حمیدی

رات آئی ہے بچوں کو پڑھانے میں لگا ہوں
خود جو نہ بنا اُن کو بنانے میں لگا ہوں

وہ شخص تو رگ رگ میں مری گونج رہا ہے
برسوں سے گلا جس کا دبانے میں لگا ہوں

اترا ہوں دیارے کے نہاں خانۂ جاں میں
سوئے ہوئے آسیب جگانے میں لگا ہوں

پتھر ہوں تو شیشے سے مجھے کام پڑا ہے
شیشہ ہوں تو پتھر کے زمانے میں لگا ہوں

آواز پہ آواز دیئے جاؤں کہاں تک
جیسے کسی پتھر کو بلانے میں لگا ہوں

فن کار بضد ہے کہ لگائے گا نمائش
میں ہوں کہ ہر اک زخم چھپانے میں لگا ہوں

کچھ پڑھنا ہے، کچھ لکھنا ہے، کچھ رونا ہے شب کو
میں کام سرِ شام چکانے میں لگا ہوں

ایسے میں تو اب صبر بھی مشکل ہوا اکبرؔ
سب کہتے ہیں میں اس کو بھلانے میں لگا ہوں



امجد اسلام امجد

۴؍اگست ۱۹۴۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے تدریس کے پیشہ کو اپنایا پھر پاکستان نیشنل سنٹر لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ امجد اسلام امجد کو شاعری، تنقید اور ڈرامے سے لگاؤ ہے۔ اُن کے مجموعہ ہائے کلام "برزخ" "عکس" اور "ساتواں در" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں "عکس" انکی انعام یافتہ تصنیف ہے۔

امجد نے کچھ نظموں کے تراجم بھی کئے ہیں۔ جو "کالے لوگوں کی روشن نظمیں" کے عنوان سے زیر طبع ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ "نئے پرانے" اور ٹیلی وژن ڈراموں کا انتخاب "خواب جاگتے ہیں" کے نام سے اشاعت کے مراحل میں ہے۔ آپ کا تحریر کردہ ٹی وی ڈرامہ "وارث" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

امجد اسلام امجد

غبارِ دشتِ طلب میں ہیں رفتگاں کیا کیا
چمک رہے ہیں اندھیرے میں استخواں کیا کیا

مجھے پتہ بھی نہ تھا مجھ میں ہے نہاں کیا کیا
تمہارے درد نے جوہر کئے عیاں کیا کیا

گھٹی دلوں کی محبت تو شہر بڑھنے لگا
مٹے جو گھر تو ہویدا ہوئے مکاں کیا کیا

پلٹ کے دیکھا تو اپنے نشانِ پا بھی نہ تھے
ہمارے ساتھ سفر میں تھے ہم رہاں کیا کیا

ہلاکِ نالۂ شبنم ذرا نظر تو اٹھا
نمود کرتے ہیں عالم میں گلرخاں کیا کیا

کہیں ہے چاند سوالی، کہیں گدا خورشید
تمہارے در پہ کھڑے ہیں یہ سائلاں کیا کیا

ہے پُرسکون سمندر مگر سنو تو سہی
لبِ خموش سے کہتے ہیں بادباں کیا کیا

کسی کا رختِ مسافت تمام دھوپ ہی دھوپ
کسی کے سر پہ کشیدہ ہیں سائباں کیا کیا

بچھڑ کے تم سے نہ جی پائے مختصر یہ ہے
اس ایک بات سے نکلی ہے داستاں کیا کیا

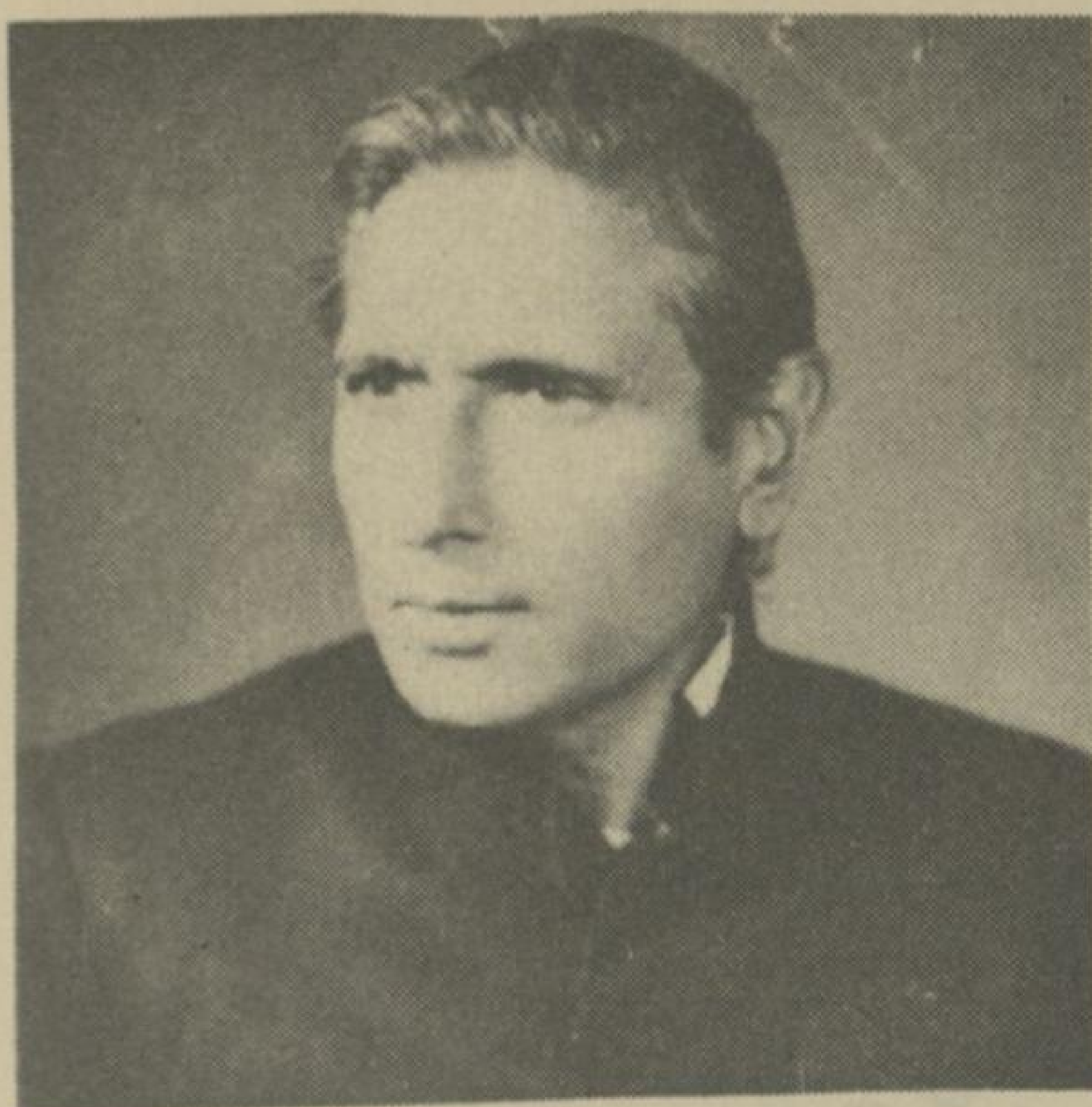
نکل ہی جائے گی اک دن مدار سے یہ زمیں
اگرچہ پہرے پہ بیٹھے ہیں آسماں کیا کیا

فنا کی چال کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی
بساطِ دہر سے ابھرے حساب داں کیا کیا

کسے خبر ہے کہ امجدؔ بہار آنے تک
خزاں نے چاٹ لئے ہوں گے گلستاں کیا کیا

غزل ایک ایسے روائتی سانچے میں ڈھل چکی ہے، کہ اگر اسے ان سانچوں
سے نکالا جائے تو غزل نہیں رہتی اور اگر نہ نکالا جائے تو اس میں ہم اپنے پیشروؤں کی
عظمتِ فن، شعورِ حیات اور اسلوبِ بیان پہ اضافہ کرنے سے قاصر ہیں۔

(یوسف ظفر)



امیدؔ فاضلی

امیدؔ فاضلی اپنی تاریخ پیدائش کے بارے میں خود بھی مشکوک ہیں۔ غالباً ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء کا کوئی مہینہ تھا، جب وہ اس دنیا میں وارد ہوئے۔

اوائل عمری ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ آج کل ماہنامہ "الفاظ" کے مدیرِ اعلیٰ کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ غزلوں کے علاوہ مرثیہ بھی خوب کہتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "دریا آخر دریا ہے" ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ زیرِ طبع کتب ہیں "سرِ فرات" اور "حرفِ جاں" ہیں۔

امیدؔ فاضلی

یادوں کی گھنی چھاؤں بھی رخصت ہوئی گھر سے
اک اور سفر کے لئے لوٹ آؤ سفر سے

فطرت کا تقاضا ہے کہ فطرت کا ہو اظہار
خوشبو ہے تو لہرائے، جو بادل ہے تو برسے

بستی کا یہ عالم کہ نظر ابر کی جانب
اور ابر کا یہ حال کہ دو بوند کو ترسے

جل اٹھتے ہیں یادوں کی منڈیروں پہ سرِ شام
جو خواب بچا لایا تھا جلتے ہوئے گھر سے

اتنا بھی کم احوال نہ سمجھے مجھے دنیا
چھلکا ہوا اک حرف ہوں اس دیدۂ تر سے

اندر سے اصولوں کی طرح ٹوٹے ہوئے لوگ
بک جائیں تو دیکھو نہ تعجّب کی نظر سے

یہ لمحۂ موجود کہ تم جس میں ہو زندہ
ٹوٹا ہوا پتّا ہے زمانے کے شجر سے

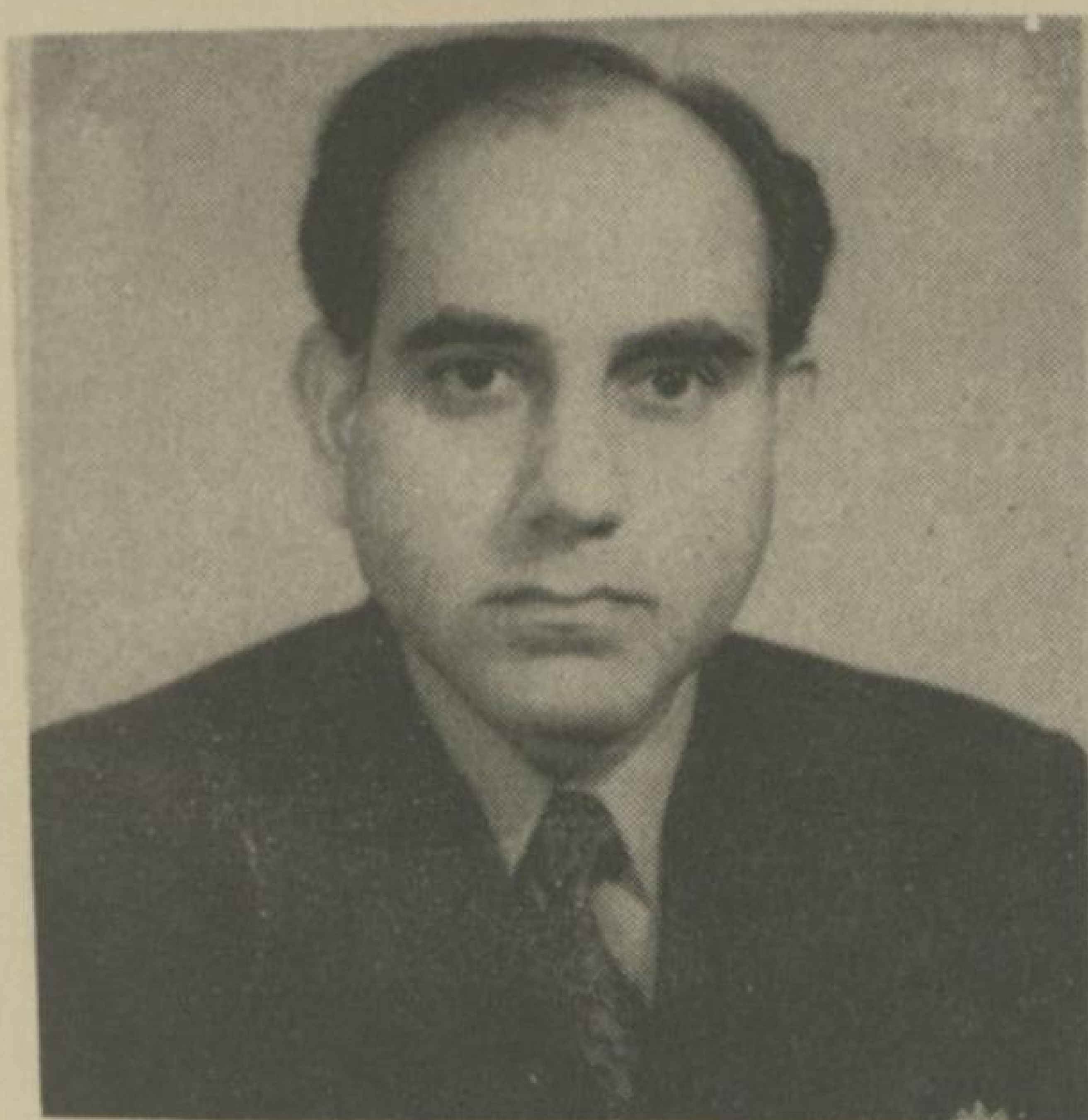
یہ دشتِ تمنّا ہے قدم سوچ کے رکھنا
بڑھتا ہے سفر اور یہاں ترکِ سفر سے

دھوکا ہی سہی پیار کے قابل ہے یہ دنیا
تم نے اسے دیکھا نہیں شاعر کی نظر سے

ہو لاکھ ہوا تیز مگر غم نہیں امیدؔ
لو حرف کی روشن ہے میرے خونِ جگر سے

غزل گو شعراء کے یہاں آج غمِ دوراں بھی ہے اور غمِ جاناں بھی۔ لیکن ان کا غمِ دوراں اور غمِ جاناں محض کسی شعری روایت کی ترجمانی نہیں ہے بلکہ حقیقت نگاری اور واقعیت پر مبنی ہے۔ اس لئے اس میں مضامین کی تکرار کی بجائے تنوّع اور بوسیدگی کی جگہ ندرت اور تازگی ملتی ہے۔ اُردو غزل کا یہ غنائیہ انداز ہے جسے کسی ادبی نظریئے، سیاسی اندازِ فکر یا کسی تحریک کے پراپگنڈے نے متاثر اور مجروح نہیں کیا ہے۔ اس قسم کی غزلوں سے بلاشبہ اردو غزل میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)



امین راحت چغتائی

مرزا محمد امین بیگ نام۔ ادبی حلقوں میں امین راحت چغتائی کے نام سے متعارف ہیں۔
۱۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو زنگون میں پیدا ہوئے۔

بی اے (آنرز) کرنے کے بعد ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے۔ کچھ عرصہ وکالت اور صحافت کے پیشوں سے وابستہ رہے۔ گذشتہ چودہ برس سے جاپان کے سفارت خانہ سے بطور پریس ایڈوائزر وابستہ ہیں۔

اپنی ادبی زندگی کے بارے میں، امین راحت چغتائی لکھتے ہیں:
"منشی تلوک چند محروم میرے فارسی کے استاد تھے۔ متاثر تو میں شاعری میں کسی سے بھی نہیں ہوا البتہ شعر کہنے کا لپکا غیر شعوری طور پر انہی کی صحبت میں پڑا۔ ادب میں آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ پھر اس بھاری پتھر کو چوم کر ہمیشہ ہمیشہ کے رکھ دیا"۔
منتخب کلام "بندِ قبا" کے نام سے زیرِ اشاعت ہے۔

امین راحت چغتائی

کسی مکاں کے دریچے کو وا تو ہونا تھا
مجھے کسی نہ کسی دن صدا تو ہونا تھا

جسے خمیدہ سروں سے ملے قد و قامت
اُسے کسی نہ کسی دن خُدا تو ہونا تھا

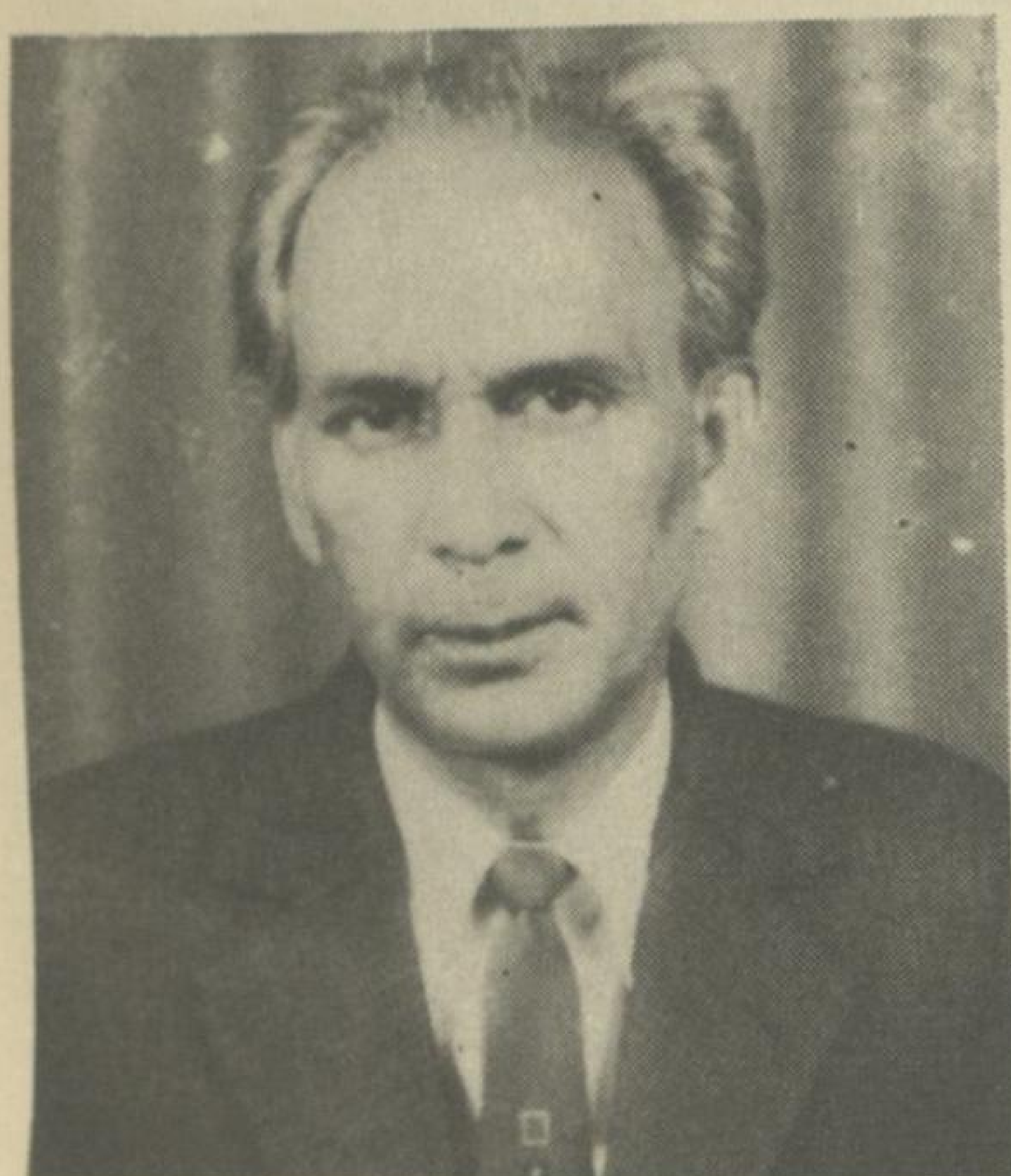
مَیں جانتا تھا، جبینوں پہ بل پڑیں گے مگر
قلم کا قرض تھا، آخر ادا تو ہونا تھا

یہ کیا ضرور، پتہ پُوچھتے پھریں اُس کا
ملا ہی یُوں تھا وہ جیسے جُدا تو ہونا تھا

وُہ پچھلی رات کی خوشبُو، رچی رچی سی فضا
سَحر قریب تھی، وقفِ دعا تو ہونا تھا

ہم ایک جاں ہی سہی، دل تو اپنے اپنے تھے
کہیں کہیں سے فسانہ جُدا تو ہونا تھا

مَیں آئنہ تھا، چھپاتا کسی کو کیا راحتؔ
وُہ دیکھتا مجھے جب بھی، خفا تو ہونا تھا



انجم اعظمی

نام مشتاق احمد، قلمی نام انجم اعظمی۔ ۲ جنوری ۱۹۳۱ء کو ضلع اعظم گڑھ (بھارت) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے اردو ادبیات میں ۱۹۵۲ء میں ایم اے کیا۔ ۱۹۵۲ء سے درس و تدریس کے شعبہ سے متعلق ہیں۔ ۱۹۵۸ء سے اب تک حکومت سندھ کے شعبہ تعلیم سے منسلک ہیں۔

آپ کی شاعری کے تین مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں: "لب و رخسار" ——— "لہو کے چراغ" اور "چہرہ"۔ تنقیدی مضامین "ادب اور حقیقت" کے عنوان سے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ شاعری کا نیا مجموعہ "سوغات" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ "جدید اردو لٹریچر" "شاعری کی زبان" اور "اعلیٰ تعلیم" آپ کے تنقیدی اور علمی مضامین کے مجموعے ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوئے۔

انجم اعظمی

روز و شب ایسی کشاکش سے نہ کوئی گزرے
نہ کہیں خواب سے بچھڑے، نہ غرض سے چھوٹے

زندگی کیا ہے بس اک رات کا افسانہ ہے
ایک ہی شب کو سہی، پیار کا موسم تو ملے

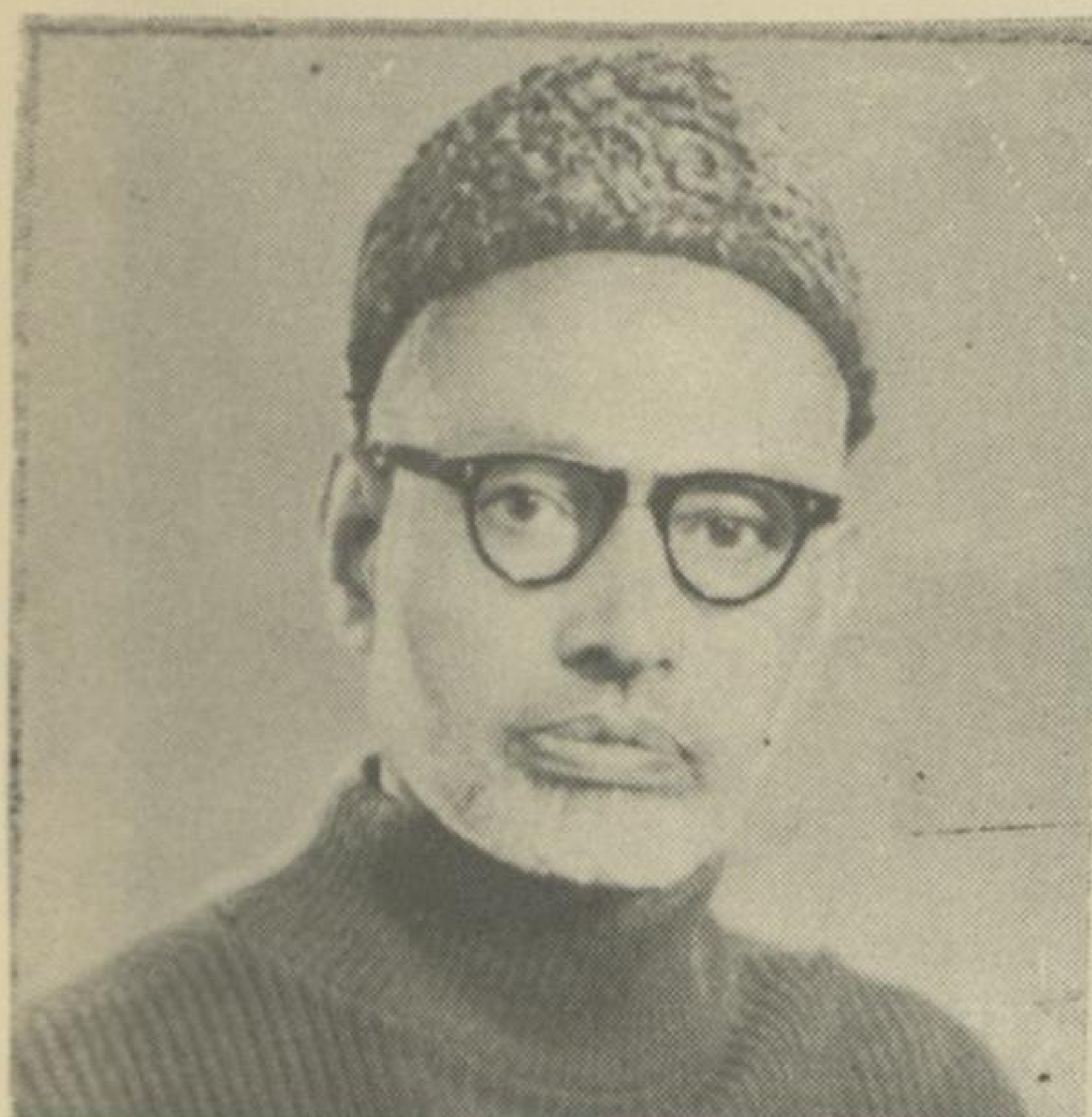
جاگ اٹھا درد تو پھر رسم نبھائی نہ گئی
رو پڑے لوگ تری بزم میں ہنستے ہنستے

سانحہ ہو تو کوئی اس کی خبر پاتے ہی
اقرباء دوست سبھی آئیں گے ملنے مجھ سے

جھوٹ سچ کیا ہے یہاں بحث ابھی جاری ہے
کارواں کتنے ہی منزل سے بھی آگے پہنچے

کیا عجب لوگ تھے جو چھوڑ گئے صحرا میں
پتلیاں ریت میں اور خار میں دامن اُلجھے

کیا کہیں شہرِ غلاماں کے کسی شخص سے ہم
ملے کونین تو لیں گے نہ ہنر کے بدلے



انجم رضوانی

قاضی احمد دین انجم رضوانی، راولپنڈی میں ۲۵ نومبر ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے۔ سکول میں باقاعدہ تعلیم آٹھویں جماعت تک حاصل کی، آپ کے والد قاضی محمد کیمچکرانی جیّد عالم اور صاحبِ فضل وکمال تھے۔ آپ نے عربی، فارسی اور علمِ قرآن وحدیث اپنے والد ہی سے حاصل کیا۔ آپ ۱۹۲۷ء میں ملٹری انجینیرنگ کے محکمہ سے منسلک ہوئے۔ اور ۱۹۶۷ء میں اسسٹنٹ آرکیٹیکٹ کی حیثیت سے سبک دوش ہو گئے۔ ان دنوں راولپنڈی ہی میں ریٹائرڈ زندگی گذار رہے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں شعروسخن کی طرف راغب ہوئے۔ پہلے ملک عطا محمد طاہرؔ سے اصلاح لی پھر علامہ محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی سے بذریعہ خط وکتابت رابطۂ تلمذ قائم کیا۔ ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ چند احباب کی اعانت سے ایک ادبی ماہنامہ "خمستان" نکالا جو کچھ عرصہ تک جاری رہا۔

انجم رضوانی نے غزل کے علاوہ حمد ونعت، منقبت ونوحہ پر بھی توجہ کی ہے۔ آپ نے اردو کے علاوہ پنجابی میں بھی کسی قدر لکھا ہے۔

مجموعۂ کلام ترتیب دے چکے ہیں جو فی الوقت کتابت کے مرحلہ میں ہے۔

انجم رضوانی

وہ شخص یوں نگاہ میں نگاہ ڈال کر گیا
بجھی بجھی سی زندگی مری بحال کر گیا

وہ سادہ لوح تھا مگر غضب کی چال کر گیا
نہیں جواب جس کا، مجھ سے وہ سوال کر گیا

مجھے تو اپنی جستجو اُس آستاں پہ لے گئی
وہ دشمنِ وفا نہ جانے کیا خیال کر گیا

نہ دو دلوں کا میل تک کے سہہ سکا تو محتسب
خبر یہ ساری شہر میں اچھال اچھال کر گیا

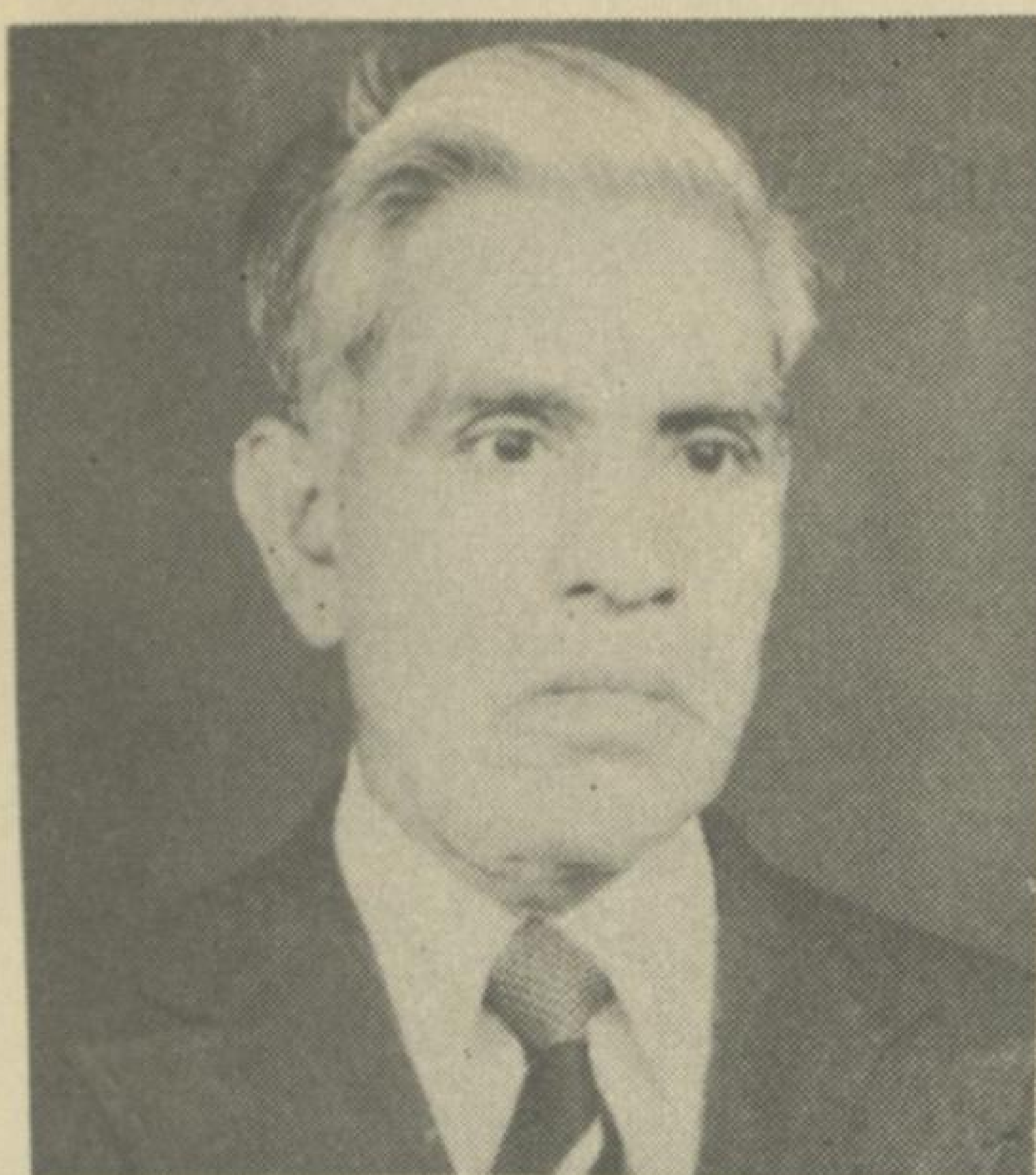
تو آگیا تو ظلمتِ غمِ فراق چھٹ گئی
جو مہر و مہ نہ کر سکے، ترا جمال کر گیا

یہاں نگاہ و فکر کے بدل چکے ہیں زاویے
وفا کی رسم اٹھی خلوص انتقال کر گیا

شکن شکن جبیں نہ کر، اگر امیدِ خیر پر
فقیر تیرے در پہ آگیا، سوال کر گیا

یہ سیلِ حسنِ بے حجاب، جھومتی جوانیاں
جو دین و دل بچا کے لے گیا، کمال کر گیا

قدم قدم پہ بتکدے رہِ حرم میں تھے مگر
مِرا بچاؤ ذکرِ ربِّ ذوالجلال کر گیا



انجم رومانی

اصل نام فضل الدین، انجم رومانی قلمی نام ہے۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۰ء کو سلطان پور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں ریاضیات میں ایم اے کیا۔ اور پھر یکے بعد دیگرے اسلامیہ کالج جالندھر، ایمرسن کالج ملتان، گورنمنٹ کالج ساہیوال اور دیال سنگھ کالج لاہور میں پڑھاتے رہے، انجم صاحب اسلامیہ کالج سول لائن لاہور سے حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق لاہور کے سیکرٹری بھی رہ چکے ہیں۔ پنجاب ریاضی سوسائٹی کے صدر اور پاکستان ریاضی سوسائٹی کی مجلسِ تنظیم کے کنونیئر بھی ہیں۔

غزلوں کا مجموعہ "کوئے ملامت" زیرِ طبع ہے۔ اس کے علاوہ نظموں کا ایک مجموعہ بھی زیرِ ترتیب ہے۔

انجم رومانی

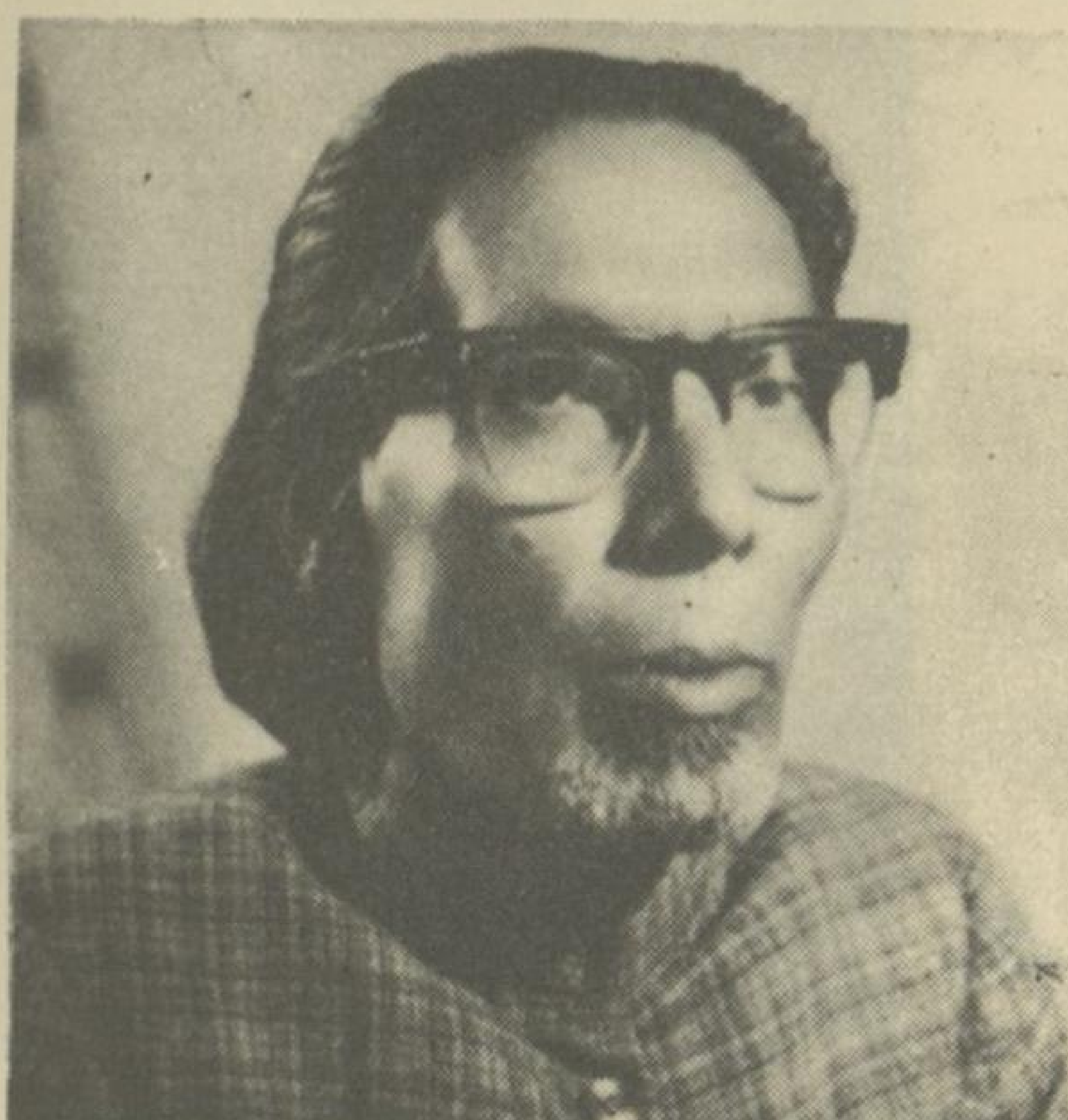
کچھ اجنبی سے لوگ تھے کچھ اجنبی سے ہم
دنیا میں ہو نہ پائے شناسا کسی سے ہم

دیتے نہیں سجھائی جو دنیا کے خطّ وخال
آئے ہیں تیرگی میں مگر روشنی سے ہم

یاں تو ہر اک قدم پہ خلل ہے حواس کا
اے خضر! باز آئے تری ہمرہی سے ہم

دیتے ہیں لوگ آج اسے شاعری کا نام
پڑھتے تھے لوحِ دل سے کچھ آشفتگی سے ہم

رہتی ہے انجمؔ ایک زمانے سے گفتگو
کرتے نہیں کلام بظاہر کسی سے ہم



انجم فوقی بدایونی

جناب ظہور محمد انجم سلسلۂ فوقی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کا سال پیدائش ۱۹۱۱ء ہے اور مقام پیدائش بدایوں (یوپی) آپ نے گورنمنٹ طبیہ کالج کلکتہ اور طبیہ کالج علی گڑھ میں تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۵۷ء سے کراچی میں مقیم ہیں۔ شاعری کو آپ ایک خلش لطیف سمجھتے ہیں جس کا تعلق احساس کے ساتھ ہے۔ فوقی صاحب نے ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ "سنگم" کانپور سے جاری کیا، اور آپ ہی اس کے مدیر تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور ماہناموں کے اعزازی مدیر بھی رہے۔ آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف آتش غم (رباعیات وقطعات)، اجالے، (غزلوں کا مجموعہ)۔ رازِ کہکشاں، سلک پروین اور کیمیا (ڈرامہ) بدایوں سے شائع ہوئیں۔ پاکستان میں طبع ہونے والی کتابیں درج ذیل ہیں:-

مہر و ماہ (مجموعہ غزلیات) فکر و فن (عروضی اصطلاحات) مخاطبات رمکاشفات ملاحظات اور وژن (تین اردو کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ)

انجم فوقی بدایونی

ذات سے ذات کا فاصلا کیا
سوچتا ہوں مجھے ہو گیا کیا

اب نہ ہچکی نہ آہٹ نہ آواز
کوئی اتنے قریب آ گیا کیا؟

ہلکی ہلکی دکھن تو کھُلے گی
درد بھرپور ہو پھر گلا کیا

بات طولِ سفر کی نہیں ہے
جیب خالی تھی گھر لوٹتا کیا

جس طرف دیکھئے دکھ ہی دکھ ہیں
پیار کا سلسلہ بڑھ گیا کیا؟

فاصلہ قُرب کی آبرو ہے!
قُرب جب تک نہ ہو فاصلا کیا

پہلے خود پر تو ایمان لاؤ
خود نہیں ہو تو پھر دوسرا کیا

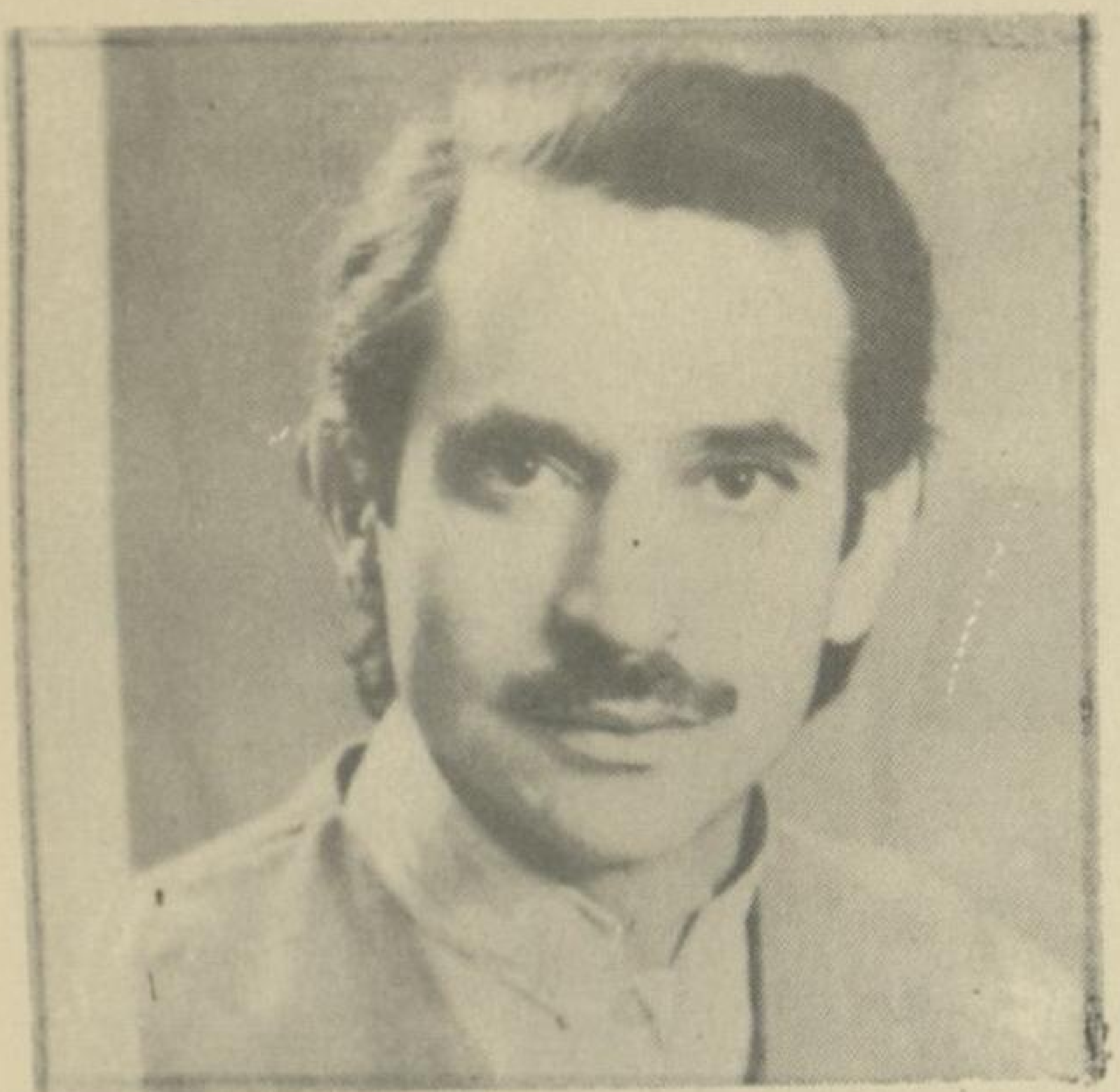
گرمیوں کی فضا لوٹ آئے
ایسی رُت اتنی ٹھنڈی ہوا کیا

عشق اتنا کہاں سوچتا ہے
آشنا کیا ہے ناآشنا کیا

اُس نے سب کچھ دیا ورنہ انجمؔ
میں غزل کے سوا مانگتا کیا ہے

عشق غزل کا بنیادی موضوع ہے لیکن زندگی کے دوسرے معاملات کو پیش کرنے کی بھی اس میں ایک عظیم روایت ملتی ہے۔ ابتدا سے لے کر اس وقت تک عشقیہ معاملات کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار میں اس نے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کی ترجمانی کو بھی اپنے پیش نظر رکھا ہے اور ایک مخصوص انداز میں زندگی کے ان پہلوؤں کی ترجمانی غزل میں بڑے سلیقے سے ملتی ہے۔ اسی سلیقے نے اسے ان موضوعات کی ترجمانی کے باوجود بھی غزل باقی رکھا ہے اور اسی میں اس صنفِ سخن کی بڑائی ہے۔

(ڈاکٹر عبادت بریلوی)



انجم یوسف زئی

نام مصطفیٰ علی خان ہے۔ آبا و اجداد نسلاً پٹھان تھے اور یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو ہندوستان آکر آباد ہو گئے تھے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے بڑی جاگیر تھی جو قوم پرستی کے جرم میں ضبط ہوئی۔

انجم یوسف زئی کی پیدائش بمقام بانس بریلی (بھارت) ۸ جولائی ۱۹۳۸ء کو ہوئی ۱۹۵۰ء میں والدین کے ساتھ نقل مکانی کر کے کوہاٹ آ گئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ ان دنوں گورنمنٹ ہائی اسکول کوہاٹ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

"سچ کا پتھر" اور "جاگتے خواب" ان کی غیر مطبوعہ تصانیف ہیں۔

انجم یوسف زئی

جانے وہ شہکار کس آذر کا تھا
موم کی گڑیا میں دل پتھّر کا تھا

دھیان میں تھی اس کے چہرے کی شفق
رنگ منظر میں بھی پس منظر کا تھا

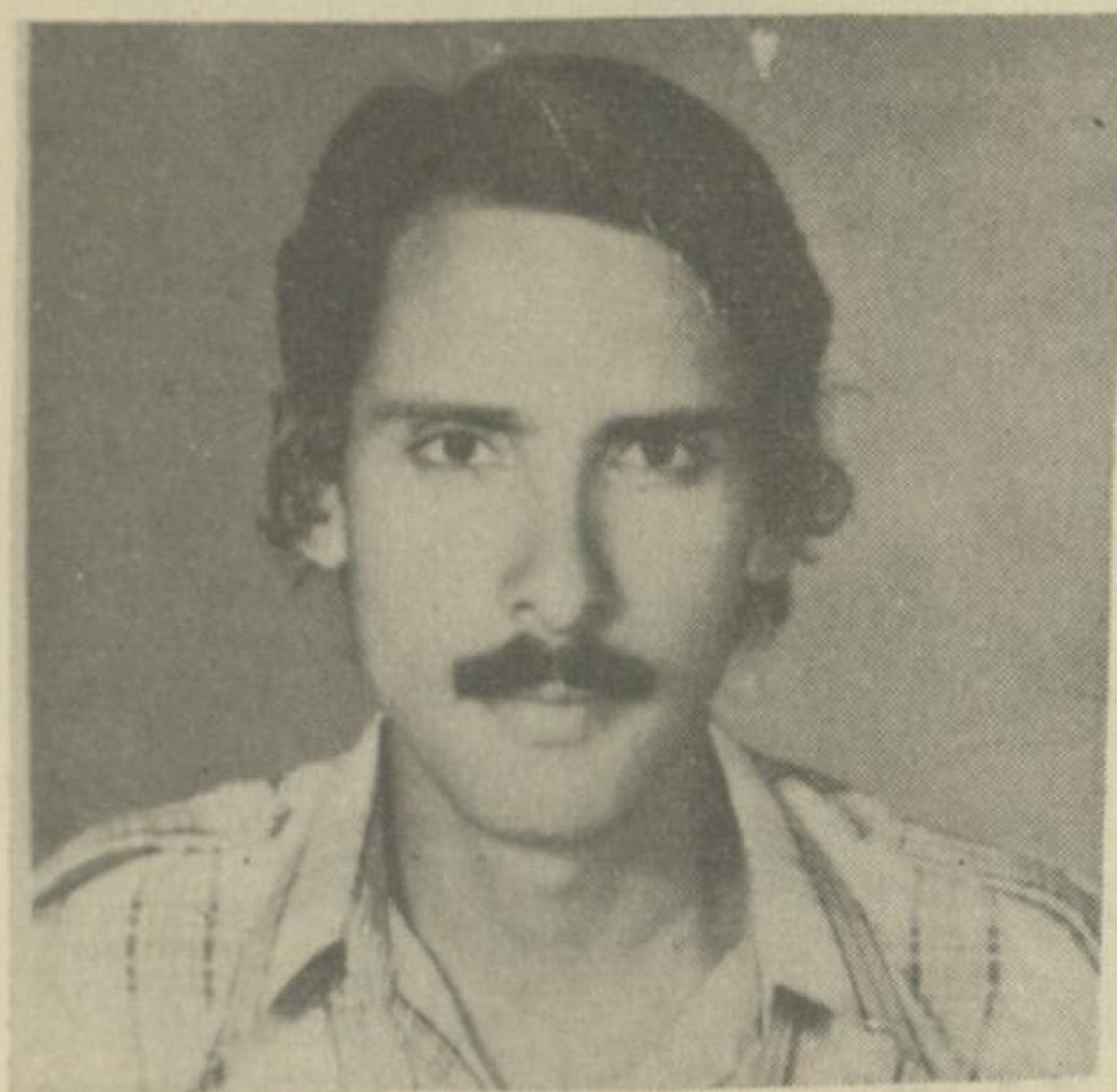
آہٹیں خوشبو کی جسم و جاں میں تھیں
تذکرہ اک پھول سے پیکر کا تھا

رات کی رانی تھی میرے روبرو
لمحے لمحے کا بدن عنبر کا تھا

لوحِ پیشانی پہ وہ لکھّا گیا
جو صحیفہ دل کے پیغمبر کا تھا

خود بھی آخر وہ تماشا بن گیا
کھیل جانے کیسا بازی گر کا تھا

اب مری آنکھوں میں ہیں صدیوں کے خواب
ورنہ انجمؔ واقعہ پل بھر کا تھا



انور جمال

انور جمال ۱۹۴۸ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی تعلیم ملتان اور پھر لاہور میں مکمل کی۔ آپ آج کل گورنمنٹ کالج ملتان میں لیکچرر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ملتان آنے سے قبل آپ بہ سلسلہ ملازمت سیالکوٹ، خانیوال اور لاہور بھی رہے ہیں۔

انور جمال اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں، شعر گوئی کی ابتدا، آپ نے ۱۹۶۵ء میں کی، اسی زمانہ میں آپ جناب طاہرؔ شادانی سے اکتسابِ فیض کرتے رہے۔

آپ کی نعتوں کا مجموعہ "لولاک لما" زیرِ ترتیب ہے۔ اس کے علاوہ مجموعۂ غزل اور اردو شاعروں پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی زیرِ اشاعت ہے۔

انور جمال

سُلگتے دریا کی تپتی موجوں میں تم نے ٹھنڈے سراب دیکھے
مری نگاہوں نے سطحِ صحرا پہ جلتے بجھتے حباب دیکھے

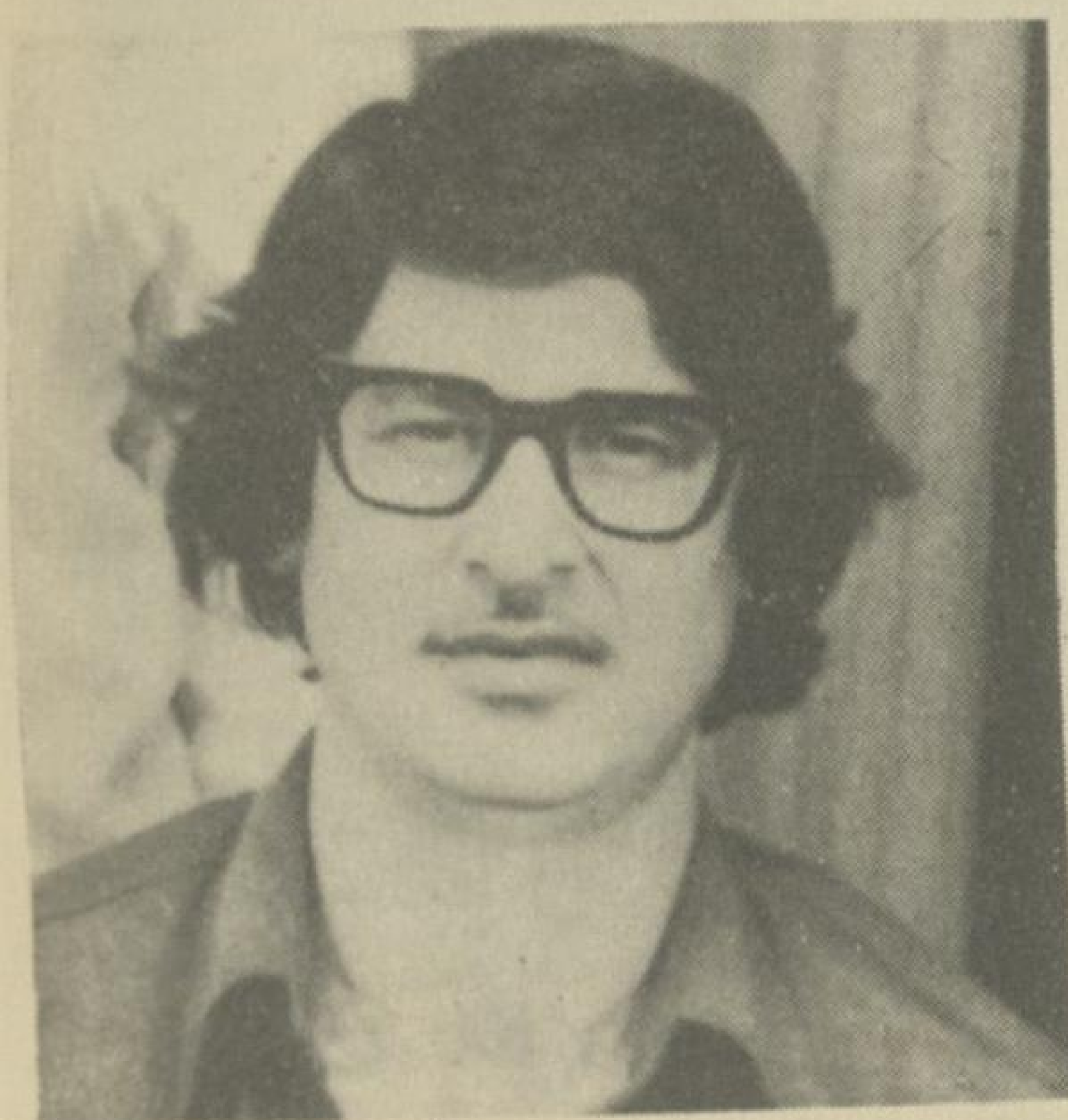
وہ مجھ سے ، بروا کو شور دھرتی میں بو کے جانے کدھر گیا ہے
وہ آکے میرے بدن کی شاخوں پہ موسموں کے عذاب دیکھے

نتیجتاً صبحدم تو چبھتے ہیں زرد کرنوں کے تیز کانٹے !!
ردائے گل سر پہ لے کے آخر کہاں تلک کوئی خواب دیکھے

وہی حرارت کا مستحق ہے ۔ اُسی کی بینائی مُعتبر ہے
جو برف کی قاش پر ٹھہر کر دمِ سحر آفتاب دیکھے

مَیں عصرِ حاضر میں نسلِ نو کے جوان جذبوں کا ترجماں ہوں
جدید اَدب سے جو مُنحرف ہو مری غزل کا شباب دیکھے

وہ کیسے سمجھے ادب کے قرطاس کی عبارت کہ جس نے انؔور
نہ حرف چکھے ۔ نہ لفظ سونگھے ۔ نہ سطر لکھی نہ باب دیکھے



انور خلیل

اصل نام محمد انور، خلیل تخلص کرتے ہیں۔ آپ ۱۹۳۸ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی اور لاہور سے حاصل کی۔ ایم اے اردو اور ایم اے فلسفہ کی اسناد کراچی سے حاصل کیں۔ آپ ۱۹۵۷ء سے شعر اور افسانے لکھ رہے ہیں۔ ۱۹۶۱ء سے آپ صحافت سے منسلک ہو گئے۔ آج کل روزنامہ "حریت" کے مدیر کی حیثیت سے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ آپ شعبۂ تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ انجمن مدیران جرائد کے سرگرم کارکن ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں آپ دوسری بار سی پی این ای کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ مجموعہ کلام ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔

انور خلیل

وحشت زدہ قطارِ غزالاں بہت ہے آج
کیا بات ہے کہ دشت ہراساں بہت ہے آج

اے بادِ بے بہار بتا ماجرا ہے کیا
جھونکوں میں تیرے بوئے بہاراں بہت ہے آج

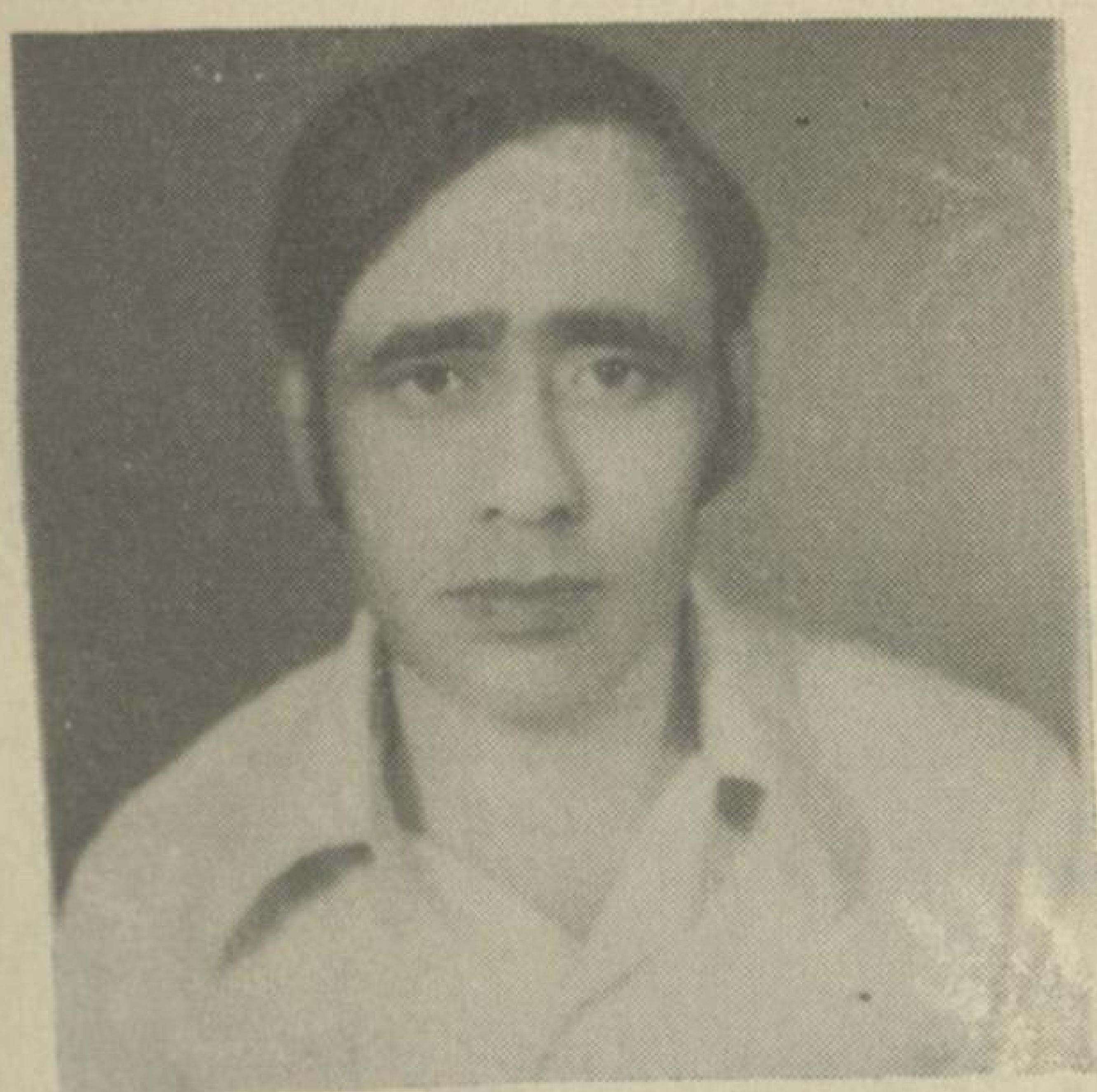
کیا کیا رقابتیں تھیں کہ تاراج ہو گئیں
ہم کو ملالِ فرقتِ یاراں بہت ہے آج

تجھ سے خفا نہیں ہیں مگر اے نشاطِ جاں
ہم کو خیالِ خاطرِ یاراں بہت ہے آج

یارو دعائے خیر کرو مل کے میرے ساتھ
اس کا خیال مجھ سے گریزاں بہت ہے آج

اے چشم آج اس سے ندامت کا غم نہ کر
سامانِ دلفریبیٔ مژگاں بہت ہے آج

یہ رات چین سے نہ گزر پائے گی خلیل
دستک کسی کی دل پہ غزلخواں بہت ہے آج



انور شعور

پورا نام انوار حسین اور شعور تخلص۔ انور شعور ۱۱۔اپریل ۱۹۴۳ء کو بمبئی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد آپ کے اہل خاندان یہاں آ گئے۔ اسی وقت سے انور کراچی میں مقیم ہیں۔ پہلے انجمن ترقیٔ اردو سے وابستہ رہے۔ گذشتہ دس برس سے ماہنامہ "سب رنگ" سے متعلق ہیں۔

مجموعہ کلام "رونما" کے نام سے اشاعت کے مراحل میں ہے۔

انور شعور

وہ جب سے انکار کے بجائے مجسّم اقرار ہو گئے ہیں
کچھ اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کچھ اور دشوار ہو گئے ہیں

نہ جانے کارِ جہاں بڑھا کر وہ عہد کس دن نبھائیں آکر
ہزار ہفتے گزر چکے ہیں ہزار اتوار ہو گئے ہیں

نہ پُوچھ دنیا کی بے ثباتی کہ دیکھتے دیکھتے ہمارے
بَسے بسائے نگار خانے قدیم آثار ہو گئے ہیں

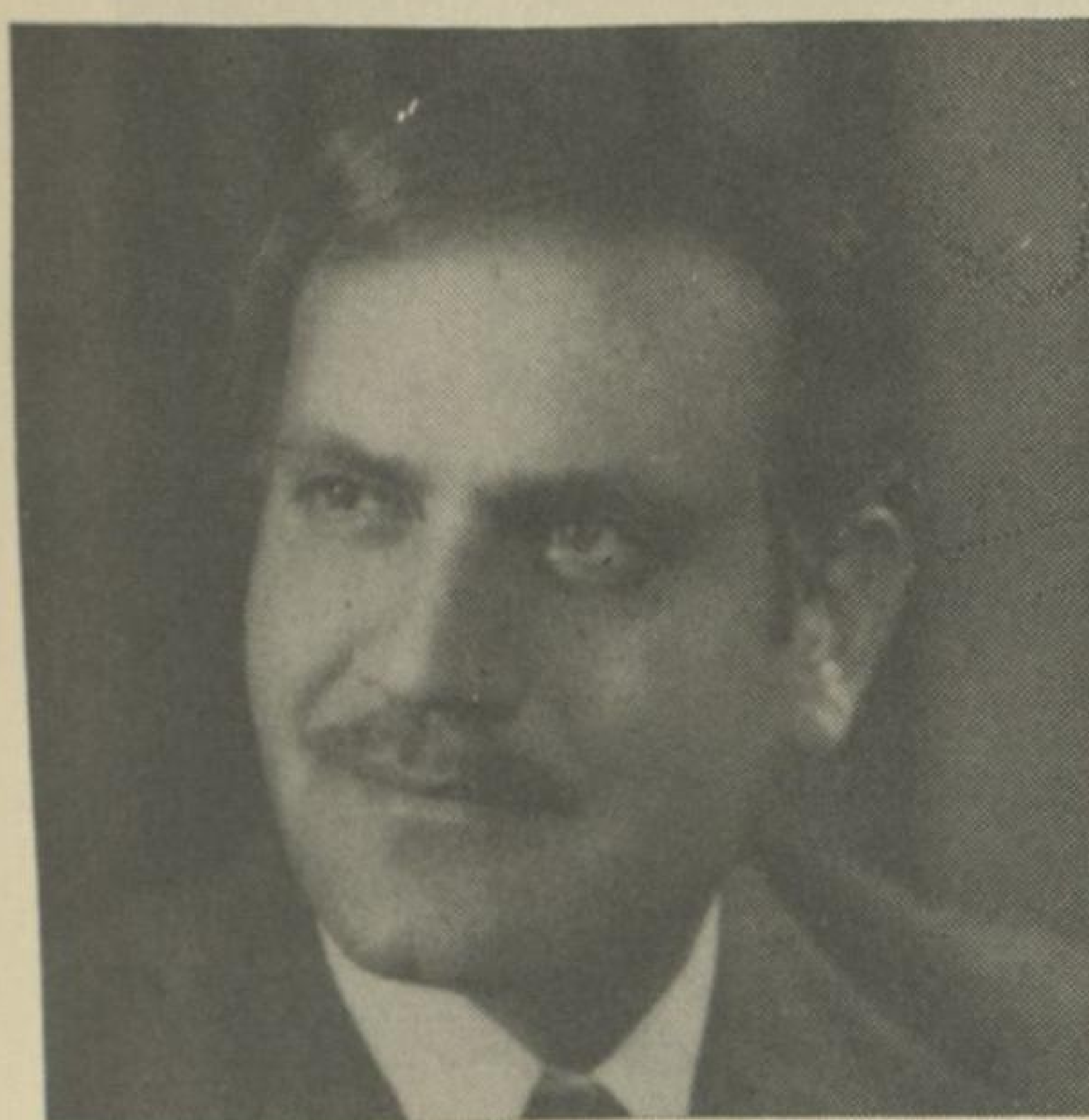
میں ایک بے مایہ شخص اُن کی نگاہ کا کیا جواب دیتا
یہ پانچ چھ نقش کھنچ گئے ہیں یہ چند اشعار ہو گئے ہیں

نمٹ کے دنیا سے دل کی جانب تم آئے بھی اب تو خوب آئے
جب اس نگر کے محل دو محلے تمام مسمار ہو گئے ہیں

کہیں تو اتنی بڑی زمین پر کھُلی ملاقات کی جگہ ہو
یہ گاؤں تو شہر ہو گئے ہیں یہ گھر تو بازار ہو گئے ہیں

ملے نہ تھے تم تو شہر بَن تھا لباس میرے لئے کفن تھا
ملے ہو جب سے مزار بھی گھر، قفس بھی گلزار ہو گئے ہیں

شعورؔ دنیا کی دسترس سے بچی نہ مقتل کی آبرو تک
منافقوں کے بھی ، سر یہاں تو علم سَرِ دار ہو گئے ہیں



انور مسعود

۸ نومبر ۱۹۳۵ء کو گجرات (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی محمد عظیم ہے ۱۹۶۲ء میں ایم اے فارسی کرنے کے بعد تدریس کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ اِن دنوں گورنمنٹ کالج، سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں فارسی ادبیات پڑھاتے ہیں۔

پنجابی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں پنجابی نظموں کا مجموعہ "میلہ اکھیاں دا" شائع ہوا جو بہت مقبول ہوا۔ اور اس پر رائٹرز گلڈ اور بک فاؤنڈیشن کی طرف سے انعامات بھی دیئے گئے۔

اردو غزلیات اور قطعات کے مجموعے جلد شائع ہونے والے ہیں۔ فارسی ادب پر تحقیقی اور تنقیدی مضامین پر مشتمل ایک کتاب بھی زیرِ ترتیب ہے۔

انور مسعود

بس یونہی اک وہم سا ہے واقعہ ایسا نہیں
آئنے کی بات سچّی ہے کہ میں تنہا نہیں

بیٹھئے پیڑوں کی اُترن کا الاؤ تاپئے
برگِ سوزاں کے سوا درویش کچھ رکھتا نہیں

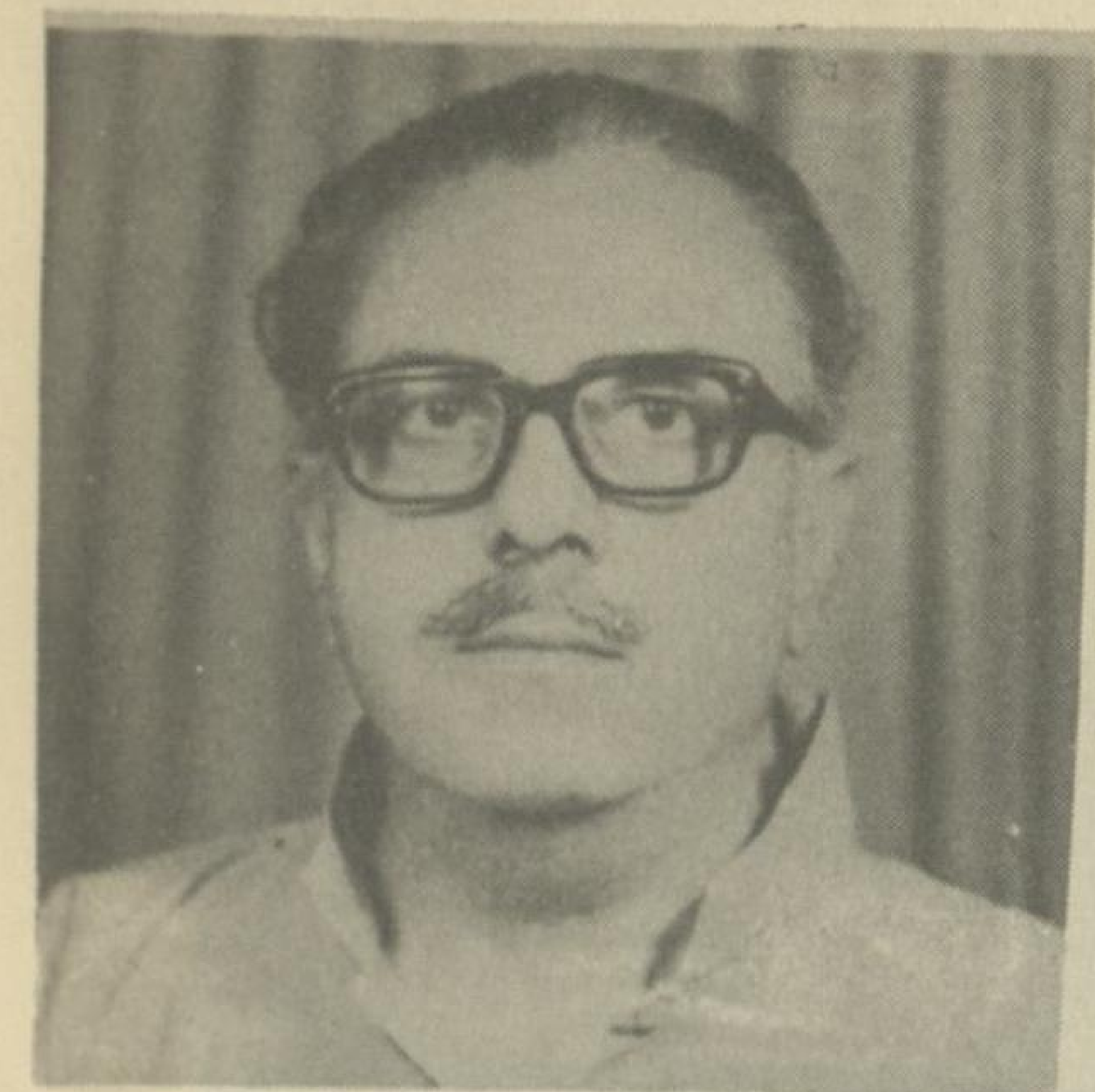
اُف پٹخنے کی صدا سے کس قدر ڈرتا ہوں میں
کتنی باتیں ہیں کہ دانستہ جنہیں سوچا نہیں

اپنی اپنی سب کی آنکھیں اپنی اپنی خواہشیں
کس نظر میں جانے کیا جچتا ہے، کیا جچتا نہیں

چین کا دشمن ہوا اک مسئلہ میری طرف
اُس نے کل دیکھا تھا کیوں اور آج کیوں دیکھا نہیں

اب جہاں لے جائے مجھ کو جلتی بجھتی آرزو
میں بھی اِس جگنو کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں

کیسی کیسی پُرسشیں انورؔ رلاتی ہیں مجھے
کھیتیوں سے کیا کہوں میں، ابر کیوں برسا نہیں



ایوب صابر

سن پیدائش ۱۹۲۳ء، کوہاٹ کے ایک قصبہ جنگل خیل کے رہنے والے ہیں۔ مادری زبان اگرچہ پشتو ہے مگر اردو پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ایوب صابر، اردو اور پشتو دونوں زبانوں کے شاعر، ادیب اور صحافی ہیں۔

ایوب صابر نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی جس کے طاقوں میں عربی، فارسی، اردو اور پشتو کی کتابیں سجی رہتی تھیں۔ چنانچہ لڑکپن سے ہی علم و ادب کی طرف مائل رہے۔ اُن کے پردادا مولانا محمد عالم پشتو کے ایک اچھے انشا پرداز تھے۔ ایوب صابر نے لکھنے کا آغاز اردو سے کیا، بعد میں پشتو میں بھی لکھنے لگے۔ کئی اخبارات اور رسائل کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ جن میں روزنامہ و ماہنامہ "بانگِ حرم" پشاور اور ہفت روزہ "ہمدم" کوہاٹ شامل ہیں۔ آج کل روزنامہ "مشرق" پشاور کے کالم نگار ہیں۔ ایوب صابر کی اب تک اردو اور پشتو کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اتنی ہی کتابیں زیرِ اشاعت ہیں۔ پشتو فلم "لمبے" (شعلے) کے مکالمے بھی لکھ چکے ہیں۔

ایوب صابر

متاعِ فکر و نظر رہا ہوں
مثالِ خوشبو بکھر رہا ہوں

میں زندگانی کے معرکے میں
ہمیشہ زیر و زبر رہا ہوں

شفق ہوں، سورج ہوں، روشنی ہوں
صلیبِ غم پر ابھر رہا ہوں

سجاؤ رستے، بچھاؤ کانٹے
کہ پا برہنہ گزر رہا ہوں

نہ زندگی ہے نہ موت ہے یہ
نہ جی رہا ہوں نہ مر رہا ہوں

غموں سے کب تھی نجات حاصل
خوشی سے کب بہرہ ور رہا ہوں

جو میرے اندر چھپا ہوا ہے
اس آدمی سے ہی ڈر رہا ہوں

اگرچہ بے بال و پر ہوں پھر بھی
میں اپنی تکمیل کر رہا ہوں

وہ میرے اپنے ہی غم تھے صابرؔ
کہ جن سے میں بے خبر رہا ہوں



بیدار سرمدی

آپ کا اصل نام محمد بخت اور قلمی نام بیدار سرمدی ہے۔ آپ ۱۱ نومبر ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے صحافت کے شعبے کو اپنایا۔ آج کل آپ روزنامہ "نوائے وقت" میں بطور سب ایڈیٹر کام کر رہے ہیں۔ اور "نوائے وقت" کے ادبی ایڈیشن کے نگران ہیں۔ شاعری کے علاوہ آپ افسانے اور تنقید بھی لکھتے ہیں۔

آپ کا مجموعۂ کلام "صبح و شام" زیر ترتیب ہے۔

بیدار سرمدی

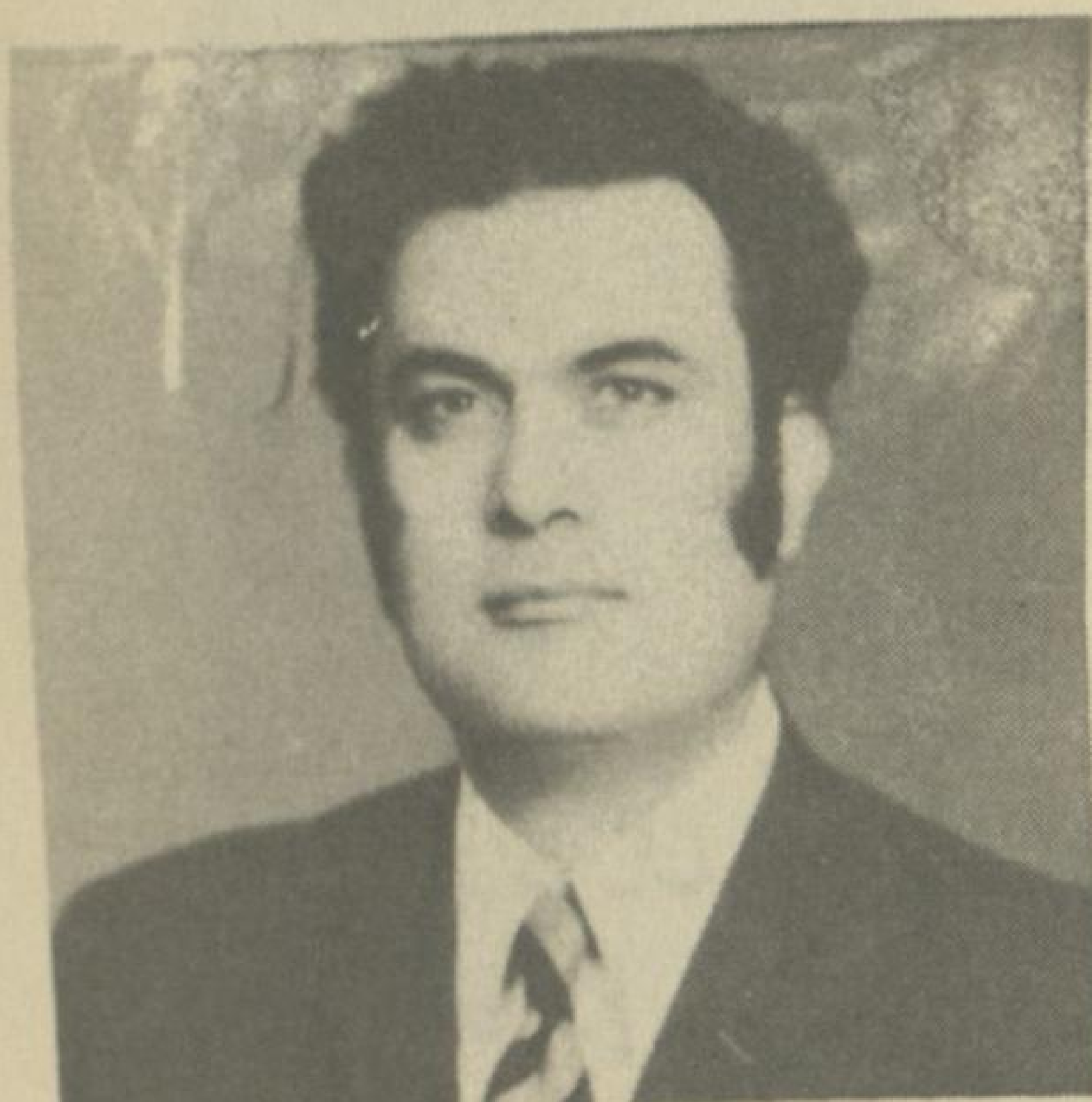
کرن میں پھر سے بدلنے لگا خیال اُس کا
اتر رہا ہے نئے چاند پر جمال اُس کا

گیا ہے شاخ سے وہ اس لئے کہ شاخ رہے
ہُوا تو بیج کی صورت ہُوا زوال اُس کا

جیوں گا میں بھی ہمیشہ کہ جاوداں ہے وہ
میں جی رہا ہوں کہ یہ سال بھی ہے سال اس کا

وہ لے گیا ہے مری آنکھ اپنی بستی میں
کہ میرے ساتھ رہے رابطہ بحال اُس کا

میں صرف پانی کی چھاگل سہی مگر بیدار
ہُوا گلاب مرے دم سے بال بال اُس کا



پرتو روہیلہ

اصل نام مختار علی خاں۔ ادبی نام پرتو روہیلہ ہے۔
پرتو ۲۳ نومبر ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمۂ انکم ٹیکس سے وابستہ ہوگئے۔ ان دنوں پشاور میں انکم ٹیکس کمشنر ہیں۔
نظمیں، غزلیں اور دوہے سب ہی کہے ہیں۔ شاعری کے دو مجموعے "پرتوِ شب" اور "رین اجیارا" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اپنی شخصیت اور شاعری کے بارے میں پرتو روہیلہ کا خیال ہے :-

"میرے اندر ۲ قسم کے ہم زاد بیٹھے ہیں، ایک ضدی بچہ ہے جو دنیا کی ہر اچھی چیز کے لئے ضد کرتا اور کھیل کود پر اکساتا ہے اور دوسرا ایک نرم دل ضعیف انسان جس کے ہاتھ پیر مفلوج ہیں، پر جس کی آنکھیں کھلی اور اس کا دماغ کام کر رہا ہے، جو اس کے ارد گرد ہو رہا ہے۔ میری شاعری اس بوڑھے کا رونا ہے۔ یہ اس اس وقت جاگتی ہے جب میرے اندر کا بچہ کھیل کود سے تھک کر سو جاتا ہے۔"

پرتو روہیلہ

اپنی ڈیوڑھی جھاڑ میاں تو اپنا آپ سنوار میاں
اپنے ساتھ ہی لے جائے گا، ہر اک اپنا بار میاں

دل کی کھڑکی کھلتی ہے تو جگمگ جگمگ کرتے ہیں
کثرت کے اس شیش محل میں وحدت کے آثار میاں

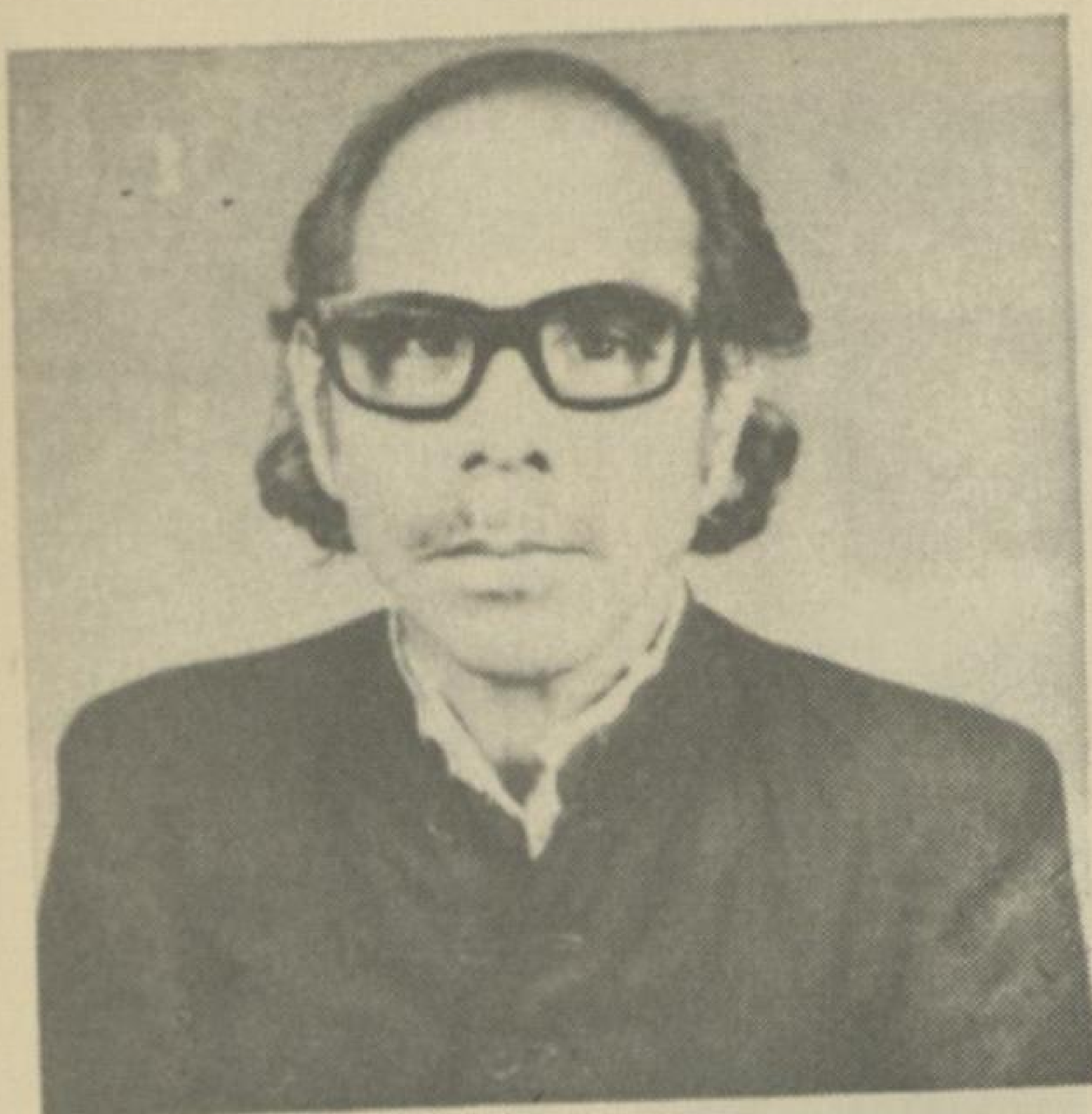
رہ رہ کر اس بوجھ تلے میں کب سے پستا جاتا ہوں
چھاتی سے کب میری اٹھے گا جیون کا انبار میاں

سینہ تو گھائل ہونا تھا، اور زخم بھی دل میں لگنے تھے
چاہت کے اس خنجر کی جب الٹی ہو گئی دھار میاں

چھاتی اندر آن براجے کیسے عریانی کے دیو
مجھ سے اپنا حق مانگے پیراہن کا ہر تار میاں

تپتے شک ویرانوں گھومے سوچ پیاسی ننگے پاؤں
نا اس رستے چھاؤں کہیں، نا اس رستے دیوار میاں

مجبوری کا اس سے بڑھ کر کیا طعنہ ہوگا پرتوؔ
ہنس ہنس کر جب دوست ہی اپنے مجھ کو کہیں مختار میاں



پرویز واسطی

سید پرویز واسطی اکتوبر ۱۹۳۲ء میں بہرائچ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد سید محمد رضوی لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ حالات نے واسطی صاحب کو جہانیاں جہاں گشت بنا دیا۔ طبیعت مرنجاں مرنج، چنانچہ ہر قسم کی محفل میں قابل قبول، مجموعۂ اضداد، تحریر و تقریر کے ساتھ کھیلوں سے دلی لگاؤ۔ ملکی اور غیر ملکی کئی اداروں میں کام کیا۔ مگر گذشتہ ۲۳ سال سے محکمۂ تعلیم سے منسلک ہیں۔ فی الوقت کھوسکی ضلع بدین میں ایک سرکاری انگلش میڈیم اسکول میں صدر مدرس ہیں۔ غزلیں اور افسانے بہت کم لکھے مگر معیاری رسائل میں شائع ہوئے۔ ڈرامے لکھے مگر اسکولوں کے لئے۔ "نوروز" کراچی کی ادارت کی۔ "کامران اور ساحل" کے اعزازی مدیر رہے۔ اضافت سے پاک زبان میں غزلیں کہیں۔ قدر شناس حضرات نے انہیں گیت گردانا اس لئے مشاعروں سے کنارہ کش ہو گئے۔ تاہم مشق سخن جاری ہے۔ صفی لکھنوی سے ابتدائی دور میں اصلاح لی۔ مجموعۂ کلام زیرِ ترتیب ہے۔

پرویز واسطی

گلیوں گلیوں چرچا ہے ، تو بوئے بیج تو بیر کا ہی
ایک میرا منہ کیا سیتا ہے، سی تو سارے شہر کا سی

ڈالی ڈالی سولی دیکھی، تھالے تھالے لاشے لاکھ
اس پر بھی مالی کی رٹ ہے، موسم تھا وہ سیر کا ہی

جگ میں جس کا مان ہو اس کے کڑوے بول کو امرت جان
اور جو ہے انکار، تو بن سقراط، پیالہ زہر کا پی

دین کے غم میں گھلنے والے، سیدھے سادے بھولے لوگ
خون کی ہولی بھی کھیلیں تو چرچا ہوگا خیر کا ہی

سنّاٹے پر مرنے والو ، کال نہیں سنّاٹے کا
جنگل جنگل گھوم رہے ہو، رنگ تو دیکھو شہر کا بھی

پھلواری پر جب آنچ آئی، اپنے ہی کچھ کھیت رہے
لیکن جب بھی بات چلی ہے نام آیا ہے غیر کا ہی

پھسلا جب بھی ہاتھ، گرے کچھ اور بھی گہرے پانی میں
ہم کو تو اے دوست نہ آیا راس کنارہ نہر کا بھی

تم بھی اے پرویزؔ بدل دو رنگ، کہاں تک لکھو گے
روکھے پھیکے شعر جنہیں سن سن اکتائے دہر کا جی



پروین شاکر

۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئیں۔ کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا، اور درس وتدریس سے وابستہ ہوگئیں۔ آپ آج کل عبداللہ کالج برائے خواتین کراچی میں انگریزی کی استاد ہیں۔

پہلا مجموعۂ کلام "خوشبو" کے نام سے شائع ہوا۔ جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ دوسرا مجموعۂ کلام "صد برگ" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

پروین شاکر

رستہ بھی کٹھن دھوپ میں شدّت بھی بہت تھی
سائے سے مگر اس کو محبت بھی بہت تھی

خیمے نہ کوئی میرے مسافر کے جلائے
زخمی تھے بہت پاؤں مسافت بھی بہت تھی

سب دوست مرے منتظرِ پردۂ شب تھے
دن میں تو سفر کرنے میں دقّت بھی بہت تھی

بارش کی دعاؤں میں نمی آنکھ کی مل جائے
جذبے کی کبھی اتنی رفاقت بھی بہت تھی

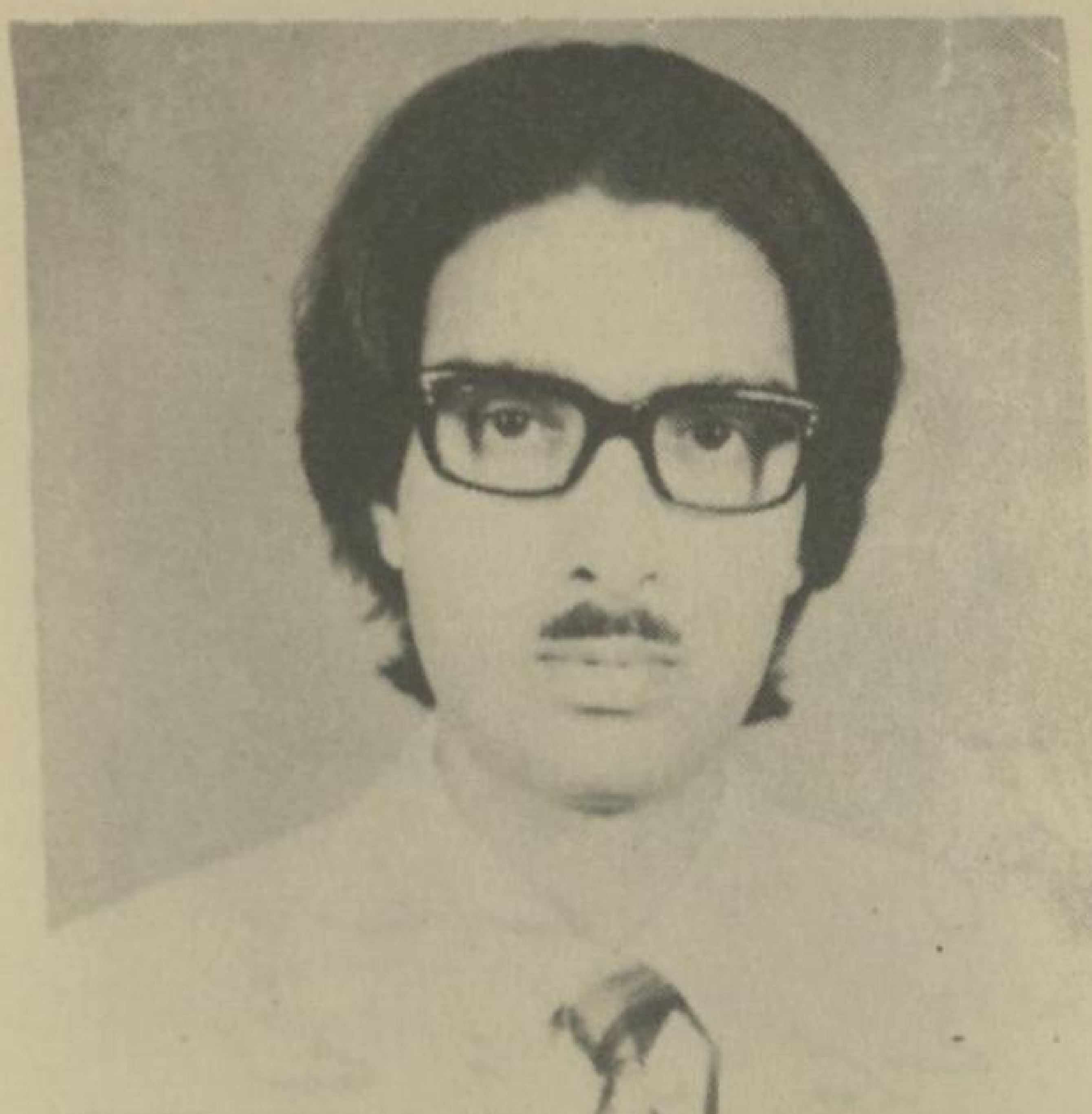
کچھ تو ترے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ مری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی

پھولوں کا بکھرنا تو مقدّر ہی تھا، لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی

خوش آئے تجھے شہرِ منافق کی امیری
ہم لوگوں کو سچ کہنے کی عادت بھی بہت تھی

اس ترکِ رفاقت پہ پریشاں تو ہوں، لیکن
اب تک کے ترے ساتھ پہ حیرت بھی بہت تھی

دریا کی طرف پشت کئے کون کھڑا تھا
جس وقت کہ سورج میں تمازت بھی بہت تھی



پیرزادہ قاسم صدیقی

پیرزادہ قاسم صدیقی، ۸ جون ۱۹۴۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، آپ نے بی ایس سی (آنرز) کے بعد ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا، اور پھر برطانیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ ان دنوں کراچی یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف فزیالوجی سے منسلک ہیں۔

پیرزادہ قاسم صدیقی، ۱۹۶۰ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ غزل ان کا خاص میدان ہے۔ شعری مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔

پیرزادہ قاسم صدیقی

کربِ نہاں کو کچھ ہمیں حرفِ سخن بنا سکے
ورنہ یہ شورِ بے صدا کس کی سمجھ میں آ سکے

اب مرا سیلِ تشنگی ریگِ رواں سے مل گیا
کون ہے اس فضا میں جو تیر کے پار جا سکے

دردِ فراق و زخمِ سر سب ہی تھے امتحاں مگر
درد کہاں دکھا سکے زخم کہاں چھپا سکے

ضبط کی سب ریاضتیں صاف جواب دے گئیں
ہم تھے بشر بشر رہے غم میں نہ مسکرا سکے

اب رہ و رسمِ دوستی بس یہی ہو کے رہ گئی
کوئی فریب دے سکے کوئی فریب کھا سکے

کوئی نہیں سفر کی شرط جو بھی چلے چلے مگر
درد سے تیز اٹھ سکے جان سے تیز جا سکے



تابش دہلوی

نام سید مسعود الحسن، تخلص تابش۔ ۹ نومبر ۱۹۱۳ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ تابش ایک بڑے علمی و ادبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ چنانچہ ننھیال کی طرف سے آپ کا تعلق مولوی ذکاءاللہ اور ددھیال مولوی نظام الدین نظامی کے خاندان سے ہے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ ملازمت کا آغاز آل انڈیا ریڈیو دہلی سے کیا اور تقسیم ملک کے بعد مستقل طور پر ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔

تابش دہلوی کا پہلا مجموعہ "نیم روز" کے نام سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ دو مجموعے زیرِ طبع ہیں جو جلد ہی منظرِ عام پر آنے والے ہیں۔

تابش دہلوی

احوالِ شوق ہم سے بمشکل کہا گیا
پوچھا کسی نے حال تو بس دل کہا گیا

عہدِ وفا سے پہلے نہ تھا اس کا کوئی نام
اب جس کو چارہ گر، کبھی قاتل کہا گیا

اندازہ عافیت کا اسی وقت تھا ہمیں
جب سیلِ ناگزشتہ کو ساحل کہا گیا

اظہار کے لیے لبِ منصور ہی سہی
ہر ماجرائے شوق بمشکل کہا گیا

اربابِ عشق مصلحت اندیش ہو گئے
اک زخمِ آرزو تھا جسے دل کہا گیا

محرومیوں نے خوب پناہیں تلاش کیں
میں تھک گیا جہاں اسے منزل کہا گیا

آبِ گہر کے تشنہ دہن سارے مر گئے
ہم سے یہ واقعہ لبِ ساحل کہا گیا

مجھ کو سنا کے میری ہی آوازِ بازگشت
کس کس کو میرا مدِّمقابل کہا گیا

تابش تمام دہر کی قدریں بدل گئیں
اس دور میں تو حق کو بھی باطل کہا گیا



تابش صدیقی

آپ کا اصل نام جماعت علی اور قلمی نام تابش صدیقی ہے۔ آپ ۱۹۱۵ء میں سیالکوٹ کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی سے میٹرک اور اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۳۸ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ابتدا میں آپ نے اخبار نویسی بھی کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ بعد ازاں سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور بسلسلۂ ملازمت دہلی اور شملہ میں مقیم رہے۔ قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی اور پھر کراچی میں ملازمت کی۔ ۱۹۵۸ء میں آپ کا تبادلہ دوبارہ راولپنڈی ہو گیا۔ جون ۱۹۷۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ آج کل راولپنڈی ہی میں مقیم ہیں۔

آپ حلقہ ارباب ذوق کے بانیوں میں سے ہیں۔ آپ کی درج ذیل تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

زر گل (کشمیری گیتوں کا منظوم ترجمہ)۔ دو چینی سیاح۔ تین مسلمان سیاح۔ تلاش کے سفر۔

تابش صدیقی

ہم ان سے آشنا ہیں انہیں جانتے نہیں
جیسے ہم اپنے آپ کو پہچانتے نہیں

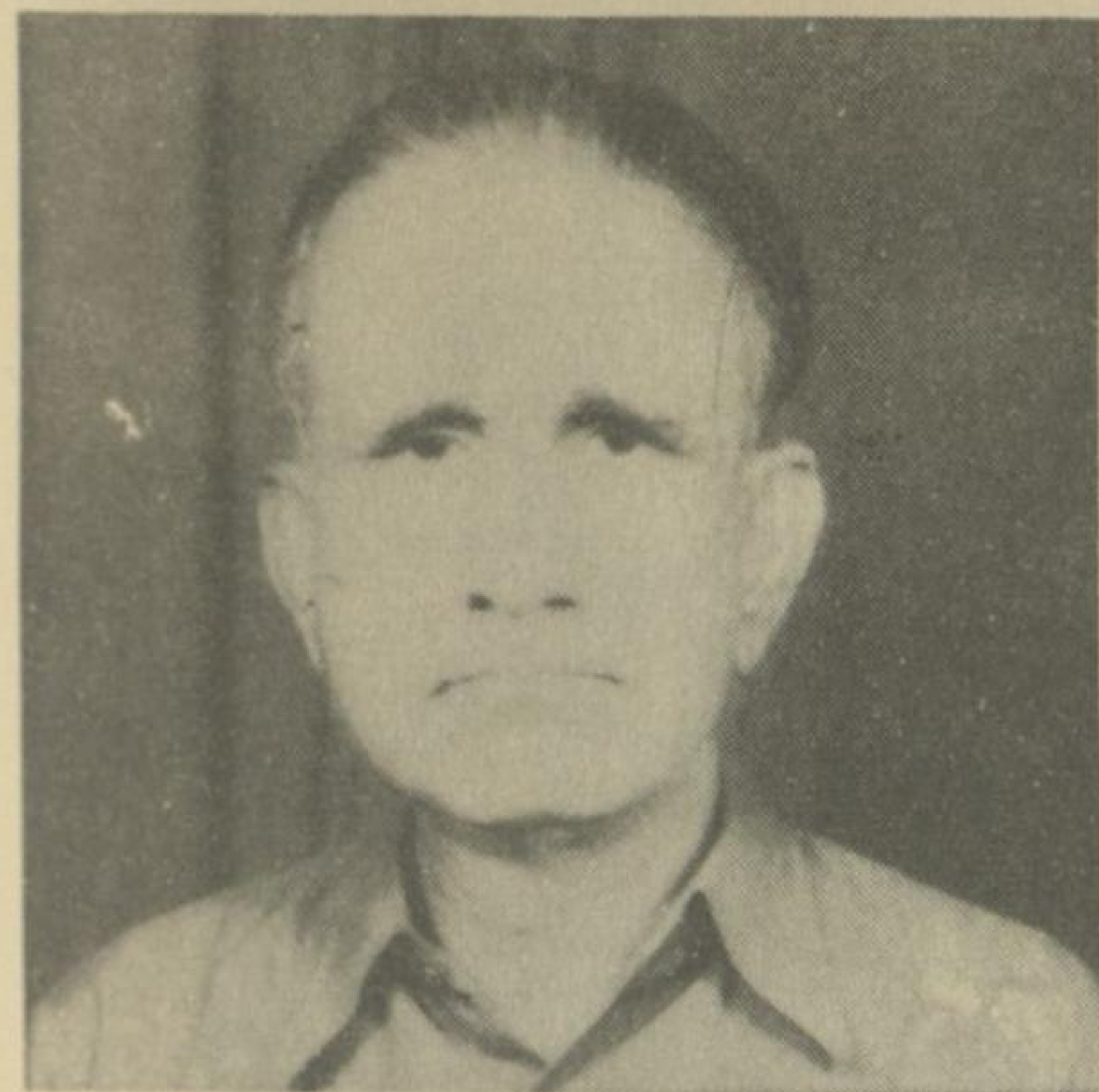
پھرتے ہیں دشت دشت کسی کی تلاش میں
خاک اپنے دشت ہی کی مگر چھانتے نہیں

دل سے ہے دل کو راہ یہ افواہ خوب تھی
اب دل کی کوئی بات بھی ہم مانتے نہیں

ہم ہیں گل آفتاب جہاں پر ہیں آشکار
تنبو ہم اپنے سر پہ کوئی تانتے نہیں

دیکھا تو ہم سے ایک زمانہ خفا ملا
کچھ ایسے لوگ بھی جو ہمیں جانتے نہیں

تابشؔ یہ ہم سے بات بھی کر لیں تو کم نہیں
اہلِ جہاں کسی کو بھی گردانتے نہیں



تجمّل حسین اختؔر

تجمّل حسین نام اور اختؔر تخلص۔ پیدائش ۲۹ مارچ ۱۹۲۰ء بمقام بانس بریلی (بھارت)۔

بریلی کالج سے بی اے کرنے کے بعد ملازمت اختیار کی۔ ان دنوں عساکرِ پاکستان کے ہیڈکوارٹر راولپنڈی میں اسٹاف آفیسر ہیں۔

تجمّل حسین اختؔر کا پہلا مجموعہ جو طنزیہ نظموں پر مشتمل تھا۔ ۱۹۴۱ء میں 'پسِ پردہ' کے نام سے شائع ہوا تھا۔

مجموعۂ غزلیات زیرِ ترتیب ہے۔

تجمل حسین اختر

شکوہ نہ ہو تسلسلِ آہ و فغاں رہے
وہ چاہتے ہیں آگ نہ بھڑکے دھواں رہے

لیل و نہار پہلے جو تھے اب کہاں رہے
ہاں یاد ہے کہ تم بھی کبھی مہرباں رہے

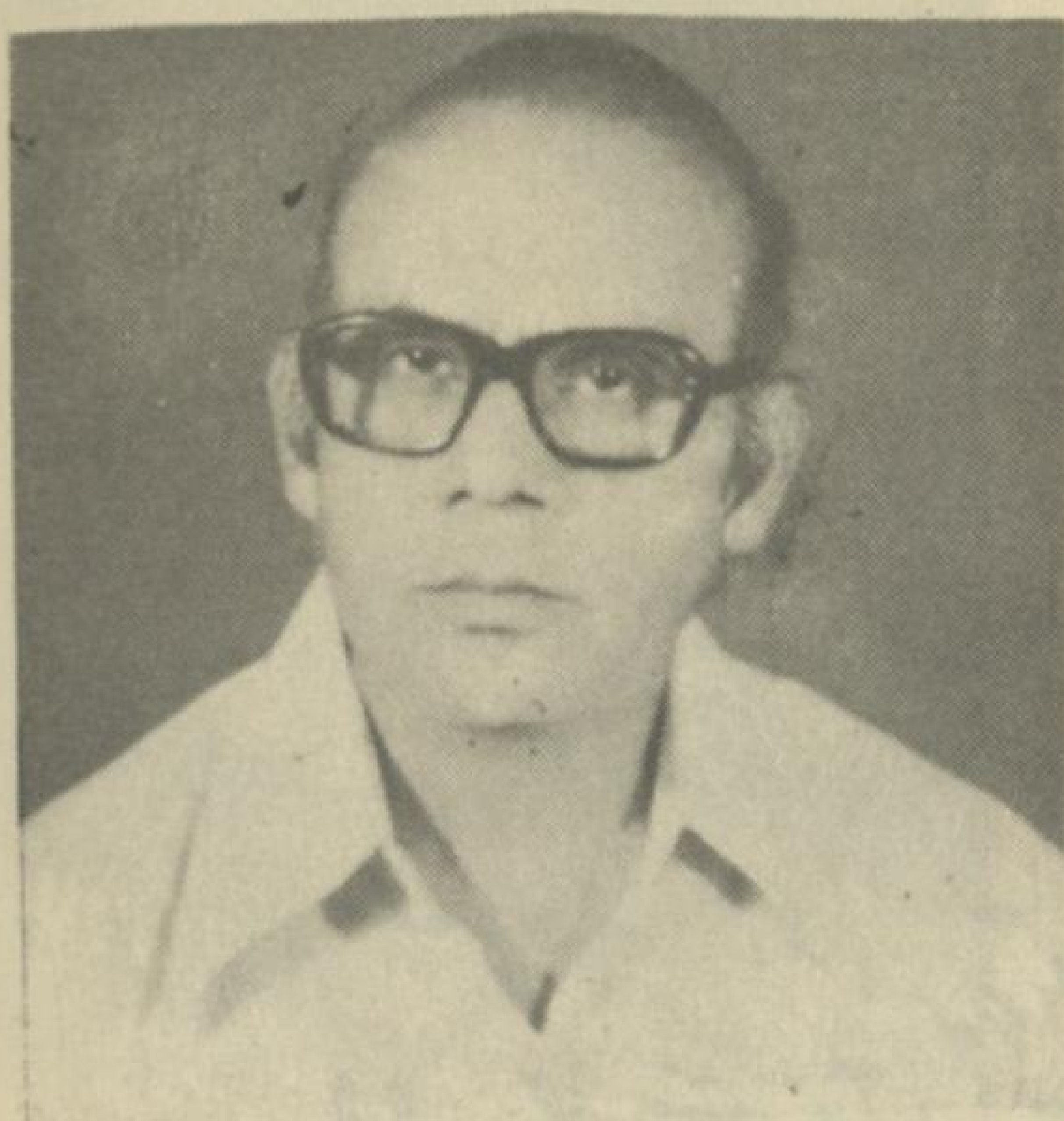
قربت میں آ پڑے تھے قیامت کے فاصلے
تنہا تھے ہم تو قول و قسم درمیاں رہے

ہر گام پر ہیں دار و رسن کی سہولتیں
اب جسم و جاں لٹاؤ کہ نام و نشاں رہے

یوں مسکرا کے ترکِ تعلق کی گفتگو
ایسا ستم کہ جس پہ کرم کا گماں رہے

راہوں کے پیچ و خم میں مسافر بکھر گئے
اب کارواں قیام کرے یا رواں رہے

خوشبوئے پیرہن میں بسا ہے رُواں رُواں
وہ ہم سے لاکھ دُور رہے جزوِ جاں رہے



توصیف تبسّم

نام محمد احمد توصیف۔ ادبی نام توصیفؔ تبسّم۔ بدایوں (یوپی) کے ایک قصبہ سہسوان میں ۳۔ اگست ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد عبد اللطیف صدیقی تھا جن کا تعلق ایک معزز اور علمی زمیندار گھرانے سے تھا۔ ابتدائی تعلیم سہسوان اور دہلی میں پائی۔ قیام پاکستان کے بعد، راولپنڈی آ گئے اور اب تک وہیں رہائش پذیر ہیں۔ ملٹری انجینئرنگ سروسز کی ملازمت میں پشاور، واہ اور کراچی میں قیام رہا۔ اس دوران تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۹۶۲ء میں گورڈن کالج راولپنڈی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ ان دنوں اسی کالج میں اردو کے استاد ہیں۔

شعر گوئی کا آغاز ۱۹۴۴ء سے ہوا مگر ۱۹۵۲ء سے باقاعدہ مقتدر ادبی رسائل میں آپ کا کلام چھپ رہا ہے۔ یوں تو نظم بھی کہتے ہیں مگر غزل گو شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

مجموعۂ کلام "سمندر اور آئینہ" کے نام سے اشاعت کے مراحل میں ہے۔ "مثنویات دہلی کا تہذیبی و معاشرتی مطالعہ" کے موضوع پر مقالہ لکھ چکے ہیں جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔

توصیف تبسم

کشیدہ سر ہوتے کچھ لوگ قامتوں کے بغیر
ہم آسماں ہیں تہہِ آب وسعتوں کے بغیر

سگانِ قریہ، تہہِ شاخِ ماہ، نوحہ کناں
گھروں میں خلق، تہہِ آسماں چھتوں کے بغیر

سحر کے خوف سے یوں بند ہیں مکاں جیسے،
چٹانیں رات کے ساحل پہ صورتوں کے بغیر

یہ آدمی ہیں کہ روتے درخت جنگل میں
ہر ایک زخم نمایاں، علامتوں کے بغیر

نفس کی لہر کنارے پہ لے گئی سب کو،
سفینہ موج سے نکلا نہ ساعتوں کے بغیر

تجھے بھی اے غمِ جاں! کم ملیں گے ہم ایسے
متاعِ درد سمیٹی ضرورتوں کے بغیر

وہ ایک لفظ عطا ہو سمجھ سکوں جس کو
وہ اک جہانِ معانی نہایتوں کے بغیر

پڑھو تمہارے لئے ہی شجر سے اُترا ہے
ورق ورق یہ صحیفہ، عبارتوں کے بغیر

تمہیں ہر اک سے شکایت سہی مگر توصیفؔ
بتاؤ جی بھی سکو گے محبتوں کے بغیر

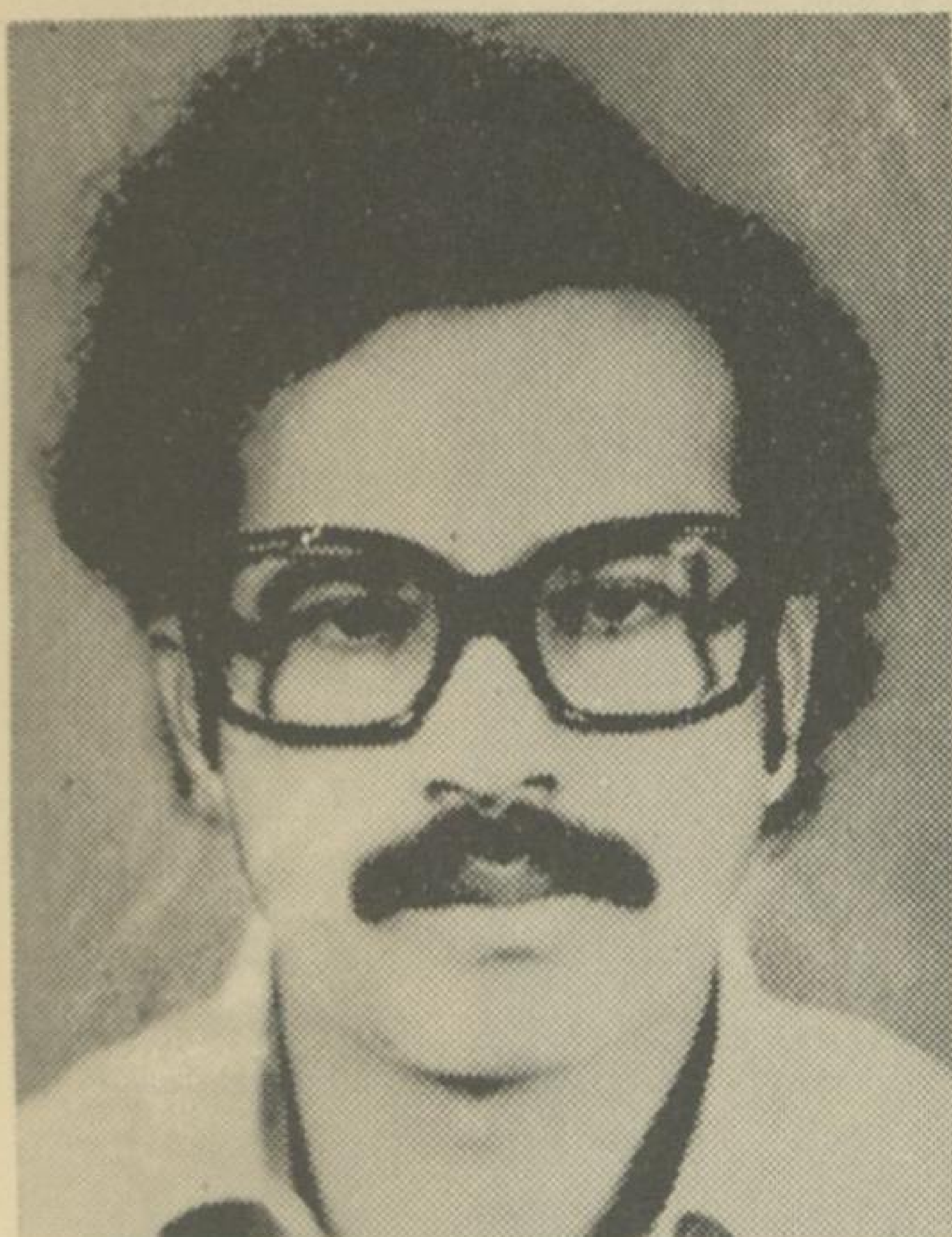


ثاقب حزیں

اصل نام محمد غلام مصطفےٰ، ادبی نام، ثاقب حزیں۔ ۶ راگست ۱۹۳۰ء کو بمقام پشاور پیدا ہوئے۔ انگریزی، اردو، تاریخ اور پولیٹکل سائنس میں ایم، اے کئے۔ اس کے علاوہ بی ٹی، آنرز اردو، آنرز پشتو اور آنرز فارسی بھی کیا۔ محکمۂ تعلیم میں متعدد عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۸ء تک بطور مجسٹریٹ اور ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک اسسٹنٹ کمشنر بھی رہے۔ روزنامہ "انقلاب" میں بطور چیف ایڈیٹر فرائض سرانجام دیئے۔ آج کل روزنامہ "ارم" پشاور کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ مطبوعات میں ہیولا، کیفِ جنوں، فکرِ آوارہ، خونِ دل، نوکِ پیکان، سازِ خاموش، ترجمہ دیوان سیدنا علی، ترجمہ رباعیات سرمد شہید، مہدی سوڈانی، حسن بن صباح، بابی و بہائی، تاریخِ ہند، تاریخِ اسلام، دین الہٰی، ماڈرن اردو ڈکشنری اور دیگر کتابیں شامل ہیں۔

ثاقب حزیں

تخیّل میں مرے کچھ ہو رہا ہے
مرا ہمزاد ہے جو رو رہا ہے
یہ انساں خواہشوں کو پوجتا ہے
یہ کمزوری ہماری رہنما ہے
ازل کی داستاں دہرانے والے
زمانہ مجھ سے پھر بدلا ہوا ہے
عدم کی منزلوں سے بھی پرے ہوں
کوئی ہے! ساتھ میرے چل رہا ہے
ازل سے آج تک کیا کر رہا تھا
یہ انساں تو ابھی انساں بنا ہے
یہاں کے آشیاں سے کیا تعلق
ہمارا قصرِ تن ہے جل رہا ہے
ہمیں رمزِ حقیقت کیا بتانا!
کوئی اس کو ازل سے سُن رہا ہے
تمہارے ہجر کی یادیں ازل سے
ہماری آنکھ سے کیا کچھ بہا ہے
مجھے تم ماورا سے پار پھینکو
حزیںؔ دنیاؤں سے سہما ہوا ہے



ثروت حسین

۱۹۴۹ء میں بمقام کراچی پیدا ہوئے ۔ کراچی یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم ۔ اے کیا ۔ آج کل جامعہ ملیہ کالج ملیر میں اردو کے لیکچرار ہیں ۔

اردو شاعری کا مجموعہ "خود کلامی" اور پنجابی شاعری کا مجموعہ "کچ کٹورا" زیرِ طبع ہیں ۔

ثروت حسین

آنکھوں میں سوغات سمیٹے اپنے گھر آتے ہیں
بجرے لاگے بندرگاہ پہ سوداگر آتے ہیں

زرد زبور تلاوت کرتی ہے تصویر خزاں کی
عین بہار میں کیسے کیسے خواب نظر آتے ہیں

گندم اور گلابوں جیسے خواب شکستہ کرتے
دور دراز زمینوں والے شہر میں در آتے ہیں

شہزادی تجھے کون بتائے تیرے چراغ کدے تک
کتنی محرابیں پڑتی ہیں کتنے در آتے ہیں

بندِ قبائے سرخ کی منزل ان پر سہل ہوئی ہے
جن ہاتھوں کو آگ چرا لینے کے ہنر آتے ہیں



ثمینہ راجہ

ثمینہ راجہ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۸ء کو راجہ کوٹ ضلع رحیم یار خان میں پیدا ہوئیں۔ آپ نے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا اور ایف اے بھی کیا۔
ابتدا میں آپ نے افسانے لکھے۔ لیکن پھر شاعری کو مکمل طور پر اپنا لیا۔ ملک کے مقتدر ادبی جرائد میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

ثمینہ راجہ

آسیب صفت یہ مری تنہائی عجب ہے
ہر سمت تری یاد کی شہنائی عجب ہے

اک نہ بچھڑے شناسا سے ملاقات کے باوصف
بکھرے ہوئے لمحوں کی شکیبائی عجب ہے

اب سلسلۂ رنج و محن ٹوٹ بھی جائے
اس بار تو کچھ طرزِ پذیرائی عجب ہے

اب مجھ پہ کھلا اپنے در و بام کا افسوں
یوں ہے کہ مرے گھر کی یہ تنہائی عجب ہے

سورج سے اُترتے ہیں مرے ہر بُنِ مو پر
آنکھیں بھی رکھوں بند تو بینائی عجب ہے

ہر دن ستم ایجاد ہے ہر رات سیہ فام
یا رب یہ تری انجمن آرائی عجب ہے

پگھلا ہوا سونا تھی جو دیوار و سقف پر
وہ دھوپ گھڑی بھر میں ہی کجلائی عجب ہے

نس نس میں پھسلتا ہے ترے قرب کا نشّہ
ہر موجۂ خوناب کی گہرائی عجب ہے



جاذب قریشی

جاذب قریشی کا اصل نام محمد صابر ہے۔ جاذب کی پیدائش لکھنؤ (بھارت) کی ہے۔ قیام پاکستان کے تین برس بعد وہ نوعمری کے زمانہ میں لاہور پہنچے اور یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء میں ثانوی تعلیم کا امتحان پاس کیا جس کے بعد آپ کراچی چلے گئے اور وہاں سے ۱۹۶۸ء میں ایم اے کیا جس کے بعد آپ تدریس کے پیشہ سے متعلق ہو گئے۔ ان دنوں ایس ایم کالج کراچی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

شاعری اور تنقید دونوں سے رغبت ہے۔ شاعری کا مجموعہ "پہچان" کے نام سے زیر طبع ہے۔

جاذب قریشی

وہ لوٹ آئے گا یہ بھی گماں نہیں مجھ میں
کہ مجھ میں دھوپ تو ہے سائباں نہیں مجھ میں

غبار سا تری پرچھائیوں میں اڑتا ہوں
بہت دنوں سے مرے جسم و جاں نہیں مجھ میں

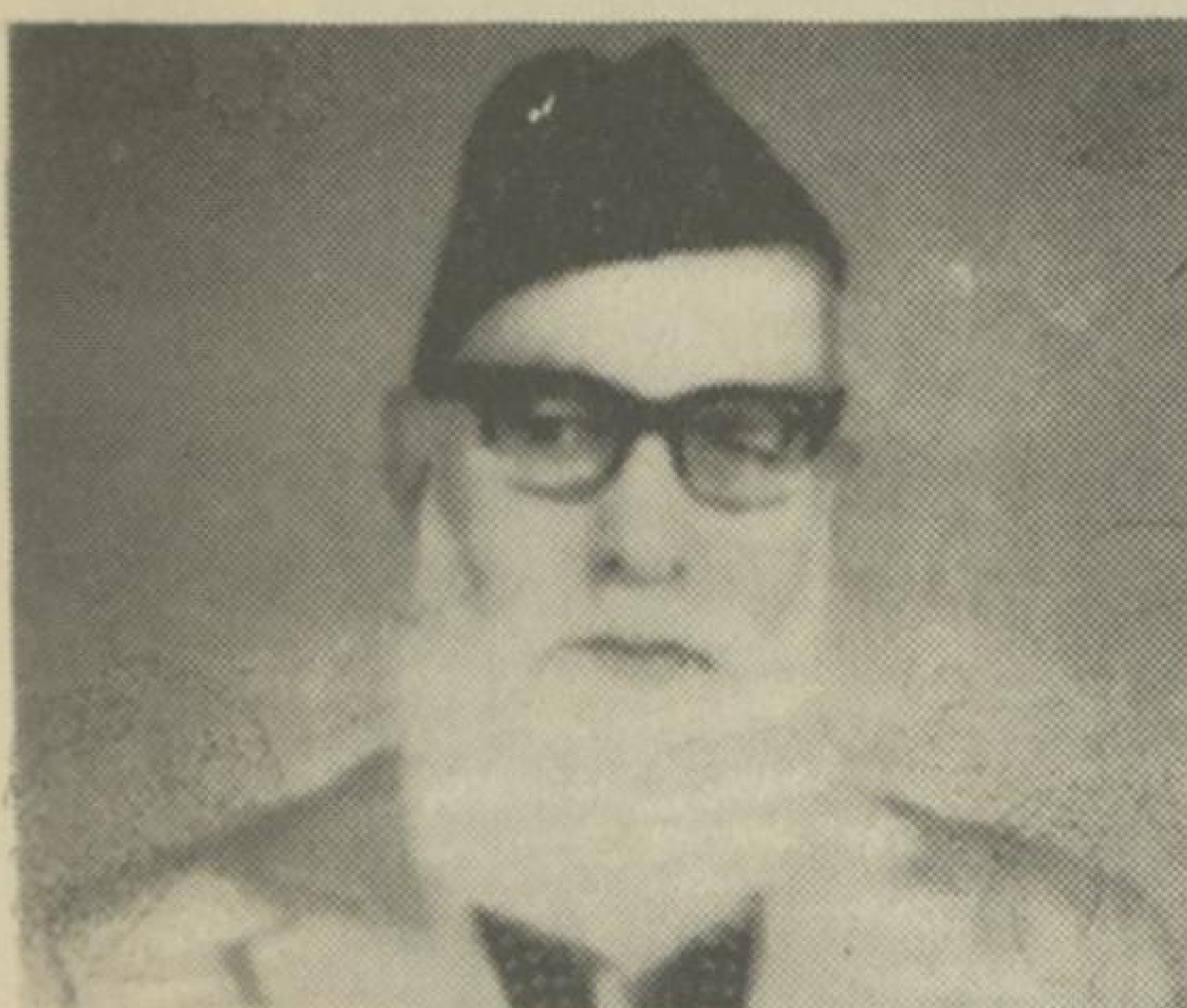
سمندروں کا سفر ہے مگر اُداس نہ ہو
ترے، بچھڑنے کا کوئی گماں نہیں مجھ میں

میں اپنے آپ میں اک بے کنار موسم ہوں
کوئی زمین کوئی آسماں نہیں مجھ میں

وہ عکس ہے نہ وہ آئینہ ہے نہ وہ چہرہ
یہ کیا ہوا مرا کوئی نشاں نہیں مجھ میں

میں آندھیوں میں بھی سورج کے رنگ پڑھتا ہوں
ترے بدن کی مہک رائیگاں نہیں مجھ میں

مجھے تو اندھی ہواؤں کے پار اترنا ہے
کوئی ستارہ کوئی بادباں نہیں مجھ میں



جام نوائی بدایونی

آپ برصغیر کے مشہور و معروف شاعر اور قدیم مکتبۂ فکر کے باقیات الصالحات میں سے ہیں۔ بدایوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظفریاب حسین تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۲۱ ہجری سال پیدائش برآمد ہوتا ہے۔ شاعر خوش فکر خان نواب ظہور اللہ نوا بدایونی آپ کے اجداد میں ہیں اس نسبت سے نوائی کہلاتے ہیں۔ جامع طبیہ لکھنؤ، دہلی، الٰہ آباد علی گڑھ، لاہور اور کراچی سے اعلیٰ اسنادِ طب اور علومِ مشرقیہ و مغربیہ کی اسناد حاصل کیں۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ سے وکالت مال و فوجداری کا امتحان پاس کیا اور ستائیس برس تک بدایوں ہی میں وکالت کرتے رہے۔ ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت بیت المقدس اور حرمین شریفین کی زیارت اور حج اکبر سے شرف یاب ہوئے۔

شعر و شاعری ورثۂ خاندانی ہے۔ تقریباً ۶۵ سال سے خدمت شعر و ادب کر رہے ہیں۔ جہاں بھی رہے آپ کے نام سے شعر و ادب کی محفلیں قائم رہیں۔ کلام کا کافی حصہ تلف ہو جانے کے باوجود، اب بھی آپ کے پاس اتنا کچھ موجود ہے جس کی ترتیب بڑی محنت چاہتی ہے۔

پندرہ سال کراچی میں رہنے کے بعد اب ۱۲ سال سے اپنے صاحبزادگان کے ساتھ اسلام آباد میں مقیم ہیں اور باوجود ضعیفی اور پیرانہ سالی تمام وقت یاد اللہ اور خدمت شعر و ادب میں گزار رہے ہیں۔

جامؔ نوائی بدایونی

دل سے بچ بچ کے نکلتی ہے ہر افتاد اب کے
کیا ہوا وہ کرمِ فطرتِ بیداد اب کے

رہی بے دادِ ستم، حسن کی بیداد اب کے
سی دیے ضبطِ فغاں نے لبِ فریاد اب کے

سُونا سُونا ہے طرب خانۂ صیّاد اب کے
ہیں کہاں نغمہ سرایانِ چمن زاد اب کے

نہ مژہ پر کوئی آنسو، نہ لبوں پر کوئی آہ
پڑ گئی کیا یہ غمِ عشق پہ افتاد اب کے

کچھ ذرا اور بڑھے دائرۂ لطف و کرم
ایک ناشادِ محبت ہی سہی شاد اب کے

کھُل گئی دل پہ رہِ معرفتِ عشرتِ غم
آ گیا کام غمِ عشرتِ برباد اب کے

اہلِ ہمت پہ یہ فرسودہ جفائیں تاچند
گردشِ دہر! کوئی فتنۂ نوزاد اب کے

بے نیازِ شبِ غم کاش بنے صبحِ چمن
مرگِ ظلمت ہوں یہ انوارِ سحر زاد اَب کے

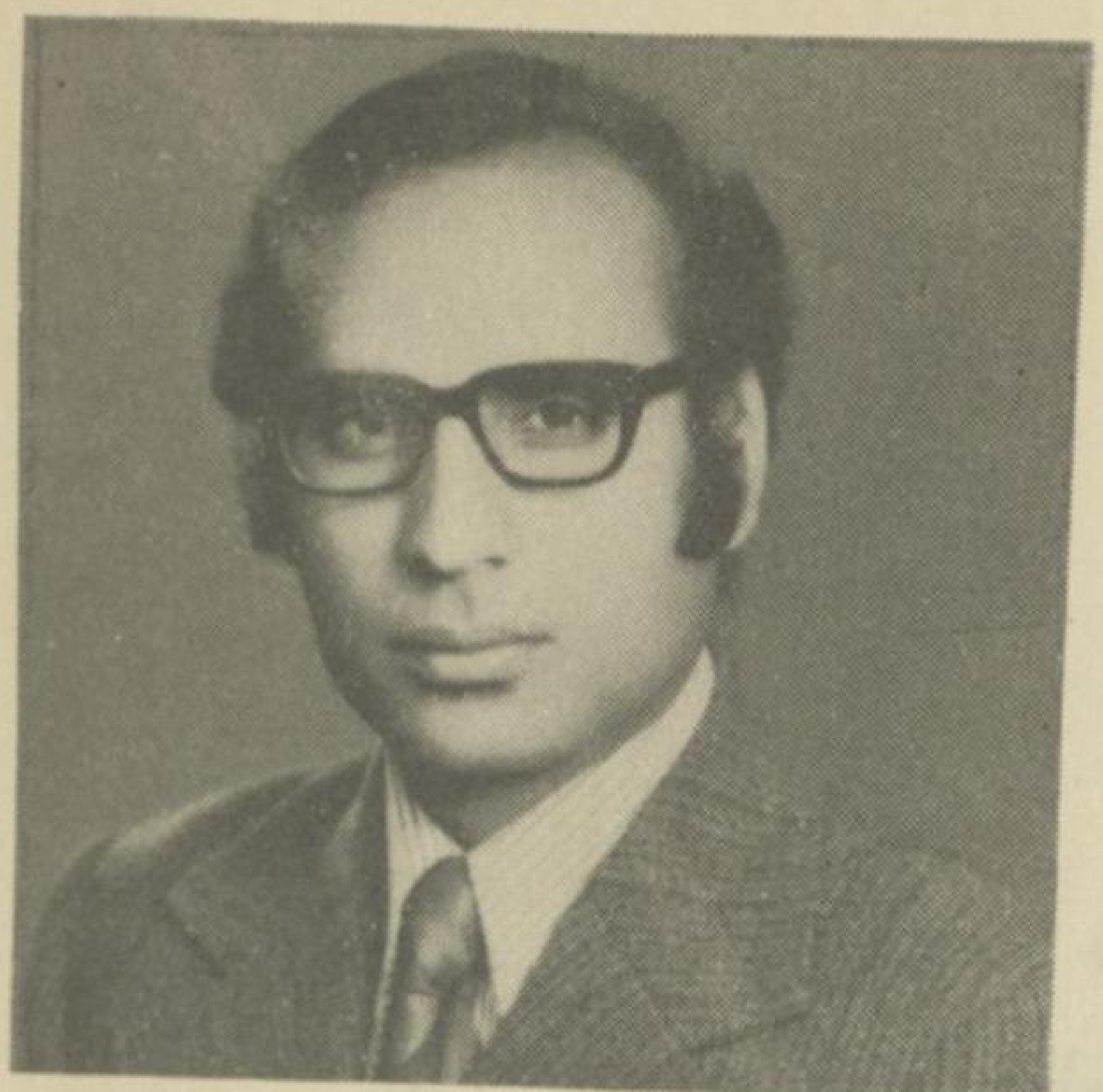
بے ستونِ غمِ دوراں سے بہے جوئے نشاط
اے جنوں، دے ہمیں ایسا کوئی فرہاد اب کے

بزمِ دل ہے ہمہ نغمہ، ہمہ نکہت، ہمہ نور
کچھ عجب رنگ سے آئی ہے کوئی یاد اب کے

فطرتِ حسن ہے جامِ اہلِ ہوس سے بے زار
ہو تو سکتا ہے کہ ہم آئیں انہیں یاد اب کے

ادب تجربوں کے تسلسل کا نام ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ غزل نے ابتدا سے اب تک اپنے مزاج کو کافی بدل لیا ہے۔ اب رفتہ رفتہ اس کی وہ ناہم آہنگی ختم ہو رہی ہے جو پہلے کسی دور میں دخیل تھی کہ ایک شعر زمین کا ہے اور ایک آسمان کا۔ ایک میں زار نالی ہے اور دوسرے میں خوشی اور انبساط۔ آج کل غزل میں موڈ کے تسلسل کی رعایت کی جاتی ہے اور آئندہ کی غزل شاید اسی قسم کی ہو۔

(عبدالمجید سالک)



جلیل عالی

۱۲ مئی ۱۹۴۵ء کو مشرقی پنجاب کے ایک قصبے ویروکے میں پیدا ہوئے۔
۱۹۶۷ء میں ایم اے اردو اور ۱۹۶۹ء میں ایم اے عمرانیات کے امتحانات پاس کئے۔
۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء سے شعبۂ تدریس سے منسلک ہیں۔ پہلے فیڈرل گورنمنٹ کالج واہ کینٹ میں بطور اردو کے استاد رہے، ان دنوں ایف جی کالج راولپنڈی میں تعینات ہیں۔
غزلوں کا مجموعہ "رابطے" کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔

جلیل عالی

بستی میں کس عذاب کے ڈر جاگنے لگے
شب بھر پسِ فصیل بھی گھر جاگنے لگے

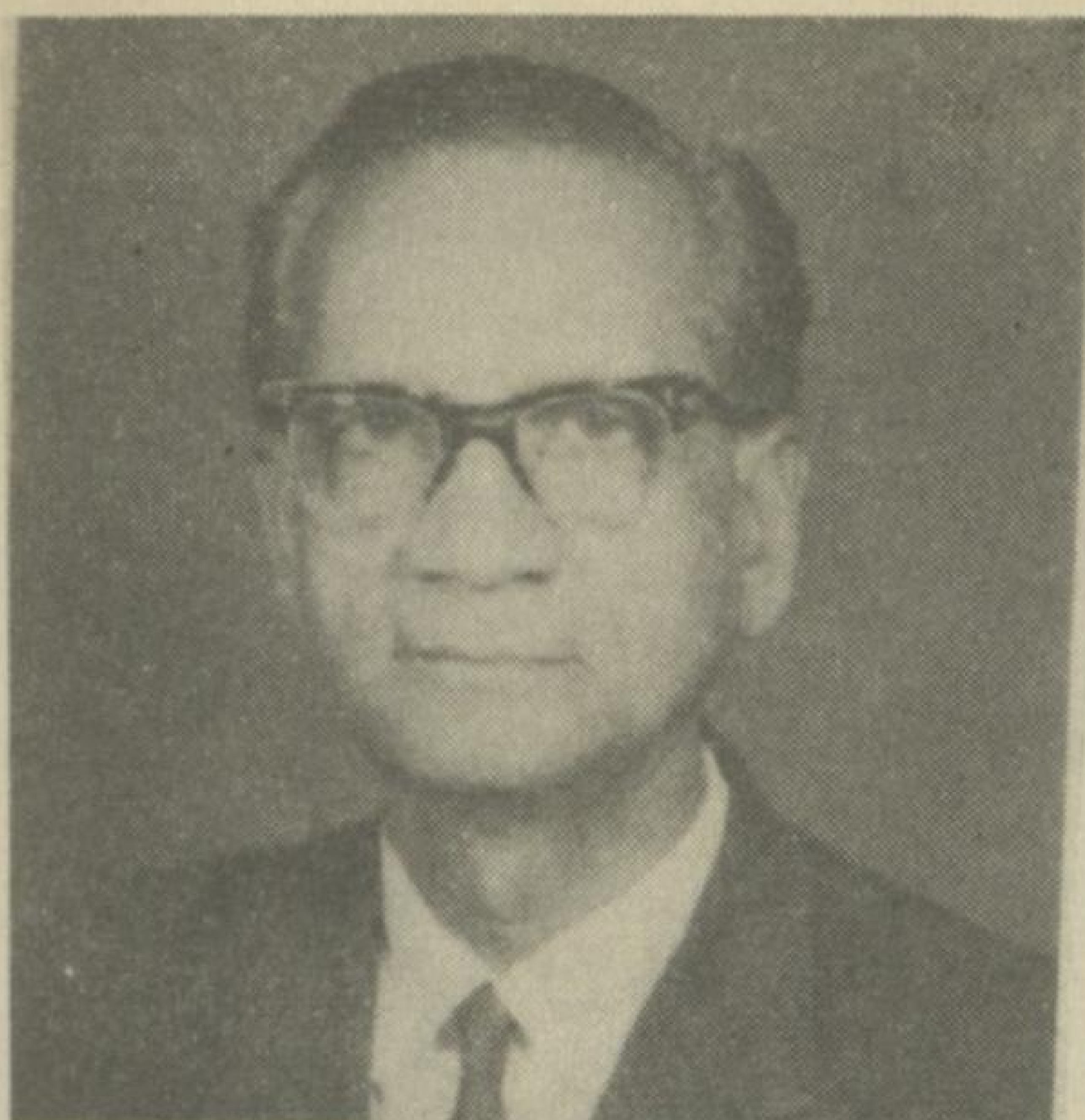
سوچیں جواں ہوئیں تو عقیدے تڑخ گئے
دریا چڑھے تو کتنے بھنور جاگنے لگے

اِن بارشوں چھتیں تو ٹپکنے لگیں مگر
صحنوں میں سایہ دار شجر جاگنے لگے

تجھ سے جدا ہوئے تو من و تو کے درمیاں
بے نام رابطوں کے سفر جاگنے لگے

اُس رُت ملیں گی شوق نگاہوں کو ٹھنڈکیں
جب چاند صحبتوں کے نگر جاگنے لگے

عالیؔ طلوعِ فن کی نشانی یہی تو ہے
لفظوں میں ان کہی کا اثر جاگنے لگے



جلیل قدوائی

پورا نام جلیل احمد قدوائی ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۹۰۴ء میں بمقام اناؤ (بھارت) میں ہوئی۔ علی گڑھ سے بی اے اور الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ چند سال مسلم یونیورسٹی میں اردو کے استاد رہے۔ جس کے بعد حکومت ہند کے شعبۂ تعلقات عامہ سے وابستہ ہو گئے۔ پاکستان کی وزارت اطلاعات ونشریات کے مختلف صیغوں اور محکموں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ان دنوں آپ اپنے ذاتی ادارہ نگارش و مطبوعات کے مالک اور راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان کے بانی اور معتمد ہیں۔ اس سے قبل آپ پندرہ برس تک انجمن ترقی اردو پاکستان کے معاون معتمد بھی رہے ہیں۔

جلیل قدوائی کی تقریباً ڈیڑھ درجن تصنیفات و تالیفات شائع ہو چکی ہیں آپ کی منظومات کے دو مجموعے ان کے علاوہ ہیں، تیسرا مجموعہ طباعت کے مراحل میں ہے۔

جلیل قدوائی

زوروں پہ بہت اب مری آشفتہ سری ہے
یہ حال ہے خود سے بھی مجھے بے خبری ہے

جب سے نہیں آغوش میں وہ جانِ تمنّا
اِک سِل ہے کہ ہر وقت کلیجے پہ دھری ہے

اُن کی جو میسر نہیں شاداب نگاہی
پھولوں میں کوئی رنگ نہ سبزے میں تری ہے

مانا کہ محبت کے ہیں دشوار تقاضے
بے یار کے جینا بھی تو اک دردسری ہے

لپکا ہے یہ اک عمر کا جائے گا نہ ہرگز
اُس گل سے طبیعت نہ بھرے گی نہ بھری ہے

اک اُن کی حقیقت تو مرے دل کو ہے تسلیم
باقی ہے جو کونین میں وہ سب نظری ہے

آنکھوں میں سماتا نہیں اب اور جو کوئی
کیا جانے بصیرت ہے کہ یہ بے بصری ہے

جاگو گے شبِ غم میں جلیلؔ اور کہاں تک
سوتے نہیں کیوں؟ نیند تو آنکھوں میں بھری ہے!



جمال احسانی

جمال احسانی ۲۱۔ اپریل ۱۹۵۱ء کو سرگودھا شہر میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن وہیں بسر ہوا۔ آپ کے والد کا تعلق پانی پت (مشرقی پنجاب) سے تھا۔ آب و دانے کی مجبوری انکو کراچی لے آئی۔ تلاشِ رزق میں مختلف علاقوں میں رہنا پڑا اور یوں عمر مسلسل سفر میں گزری۔ ان دنوں محکمہ اطلاعات ونشریات سندھ سے منسلک ہیں۔ "اظہار" کراچی کے معاون مدیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے ہیں، اپنی شاعری کے بارے میں جمال احسانی کہتے ہیں :۔

"وہ تمام تجربات اور واقعات جن سے شب و روز میں اس جہان کے ہمراہ گزرتا ہوں۔ میرے سینے میں تر و تازہ ہیں، ان کے اظہار کی خواہش کا دوسرا نام میرے ہاں شاعری ہے۔ اس لگن اور انتظار میں ہوں کہ شاید کبھی یہ خواہش پوری ہو جائے"۔

جمال احسانی

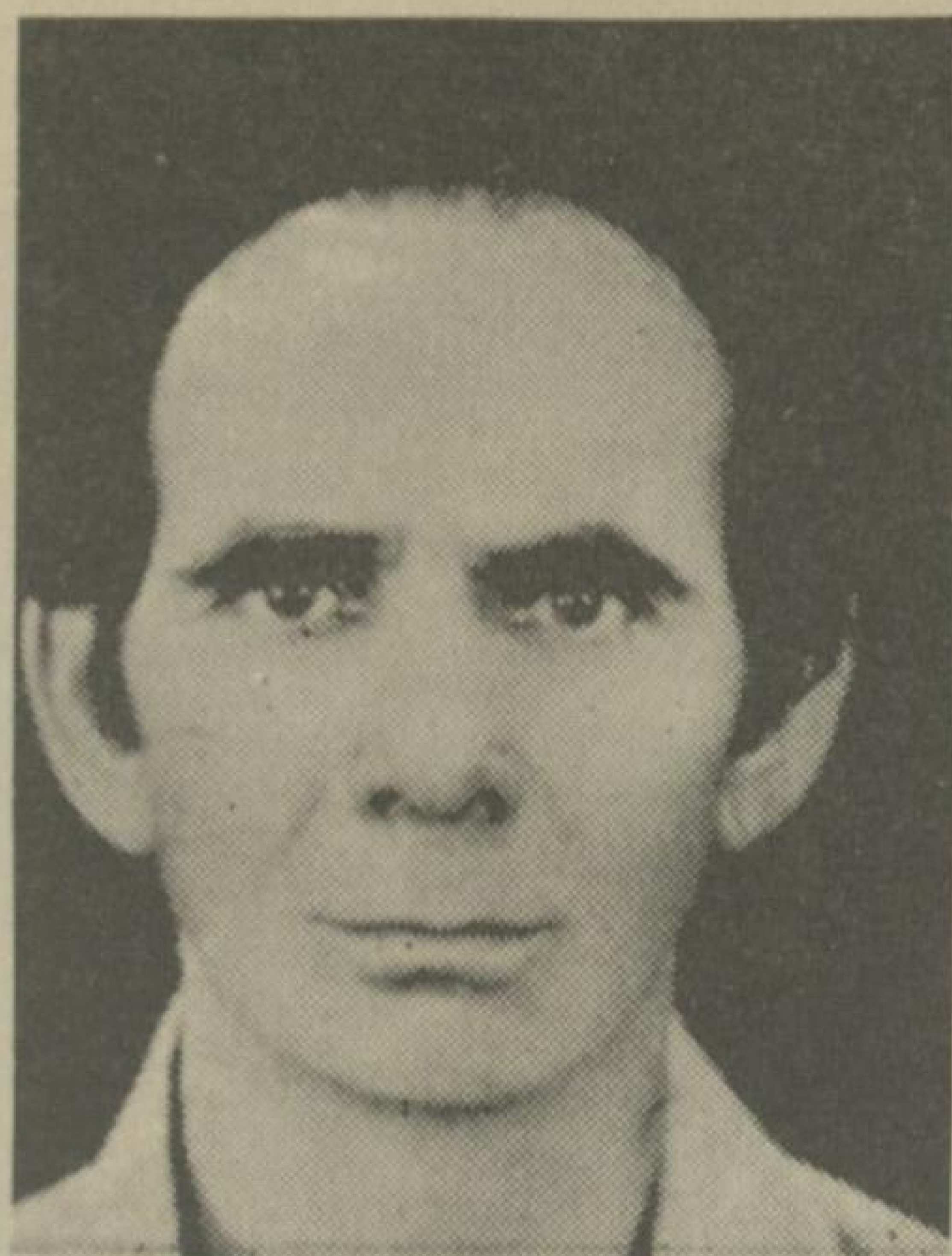
آنکھیں مٹّی دھول میں خواب ہواؤں میں ہوتے تھے
کیسے کیسے محل تعمیر، خلاؤں میں ہوتے تھے

دھوپ وہی ہے، ریت وہی ہے، سنّاٹا ہے وہی
لیکن کہاں وہ لوگ جو ان صحراؤں میں ہوتے تھے

سانسوں کی آون جاون میں جینے کے پیغام
دور کہیں سے آنے والی صداؤں میں ہوتے تھے

اک دیوار گری اور اس کی کہانی ختم ہوئی
سارے سورج جمع کبھی جس چھاؤں میں ہوتے تھے

آج دلوں میں دکھ سہنے کی تاب نہیں ہے جمالؔ
آگ کے سارے بھید کبھی دریاؤں میں ہوتے تھے



جمال پانی پتی

آپ کا اصل نام گلزار احمد ہے اور جمال تخلّص۔ آبائی وطن چونکہ پانی پت (مشرقی پنجاب) ہے۔ اس لئے پانی پتی آپ کے ادبی نام کا جزو ہے۔

آپ ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے، بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد بینکاری کے پیشہ سے وابستہ ہو گئے، ان دنوں کراچی میں اقامت پذیر ہیں۔

جمال پانی پتی، فرانسیسی مفکر رینے گینوں کی کتاب CRISIS OF THE MODERN WORLD کا ترجمہ "عہدِ جدید کا بحران" کے نام سے کر چکے ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوا۔ کلام اور تنقیدی مضامین کے مجموعے بھی ترتیب و اشاعت کے مراحل میں ہیں۔

جمال پانی پتی

سدا رہے تیرا غم سلامت، یہی اثاثہ ہے آبرو کا
یہ دولتِ دل بہم نہ ہوتی تو کون پرساں تھا آرزو کا

اُمڈ کے آیا تو ہے عزیزو روش روش سیلِ رنگ و بو کا
مگر نہ پھر بھی نصیب چمکا اگر مری خاکِ بے نمو کا

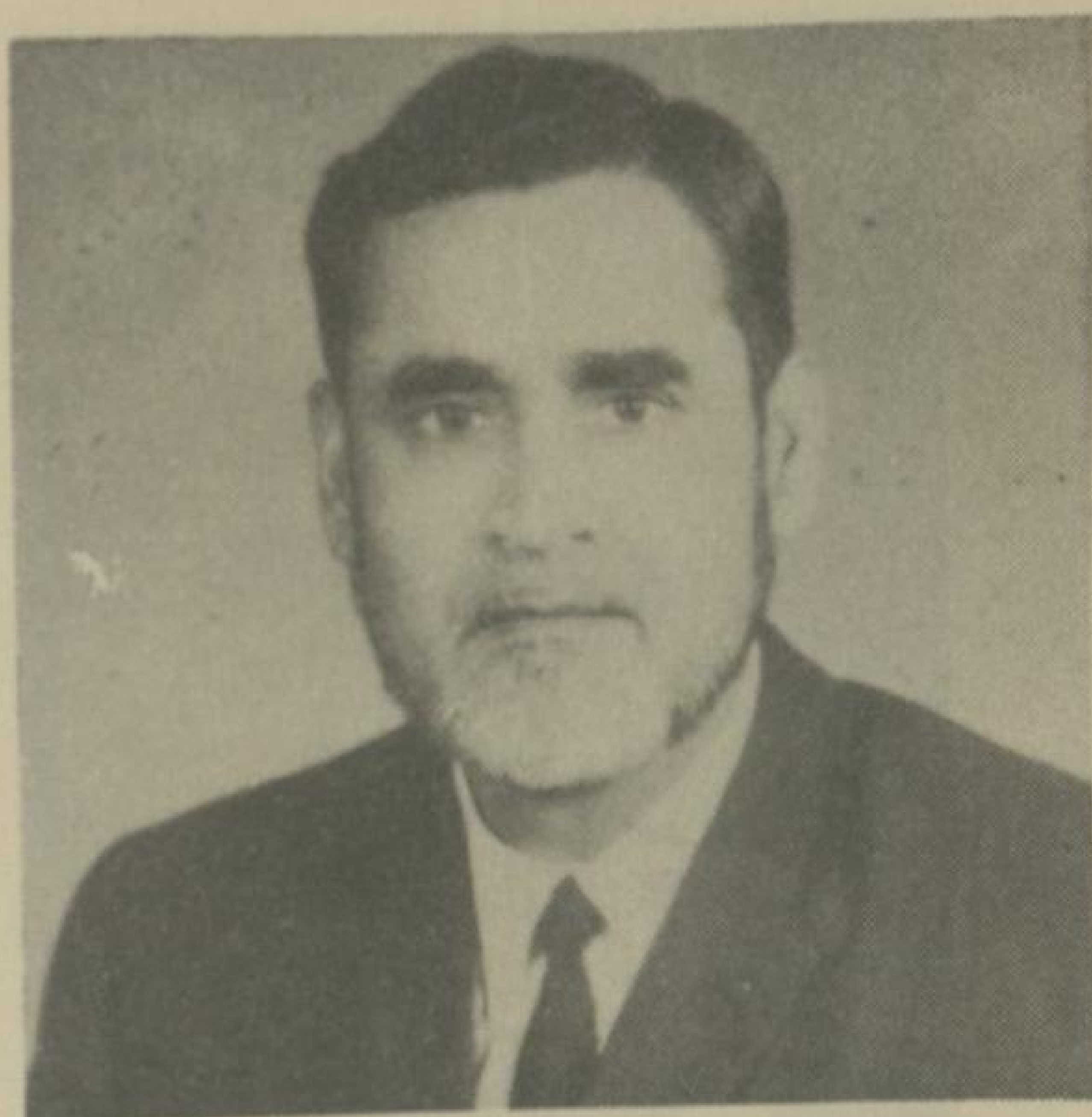
مثالِ صبحِ بہار تُو ہے تو میں ہوں شامِ خزاں کی صورت
چمن چمن خار و خس سے میرے فروغ ہے تیرے رنگ و بو کا

بسے تو میرے مشامِ جاں میں مہک ترے نامۂ نفس کی
کھلے تو پرچم کبھی مرے دوش پر تری زلفِ مشکبو کا

مسافرانِ سفینۂ جاں رواں ہیں کن منزلوں کی جانب
ہوا کی زد پر شبِ سیہ میں علم کئے بادباں لہو کا

قبائے جاں تار تار اپنی ہوئی بہت کاوشِ رفو میں
مگر اسی سے کھلا ہے آخر بھرم ہر اک چاکِ ہر رفو کا

جو میرے احساسِ بے زباں کو زباں ملی تو چمک اٹھا ہے
شرارہ بن کر کہیں نوا کا، چراغ بن کر کہیں لہو کا



جمیل عظیم آبادی

محمد جمیل احسن نام اور جمیلؔ تخلص۔ آپ کا سنِ ولادت ۱۹۲۴ء اور مقام پیدائش عظیم آباد ہے۔ تعلیم عظیم آباد ہی میں پٹنہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور وہیں ڈاک و تار کے محکمہ سے منسلک ہو گئے۔

قیام پاکستان کے بعد جمیل عظیم آبادی مشرقی پاکستان چلے آئے اور سقوط ڈھاکہ تک وہیں مقیم رہے۔ ۱۴؍اگست ۱۹۷۲ء کو کراچی آئے۔ آج کل محکمہ ٹیلی فون میں جنرل مینجر ٹیلی فون کراچی کے دفتر میں بحیثیت اکاؤنٹس آفیسر کام کر رہے ہیں۔

نظم و نثر دونوں لکھتے ہیں، کلام مختلف جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

مجموعۂ کلام ابھی طبع نہیں ہوا۔

جمیل عظیم آبادی

توڑ کے ناتا ہم سجنوں سے پگ پگ وہ پچھتائے ہیں
جب جب اُن سے آنکھ ملی ہے تب تب وہ شرمائے ہیں

رُوپ نگر کو چھوڑ کے جب سے آس نگر کو آئے ہیں
صحرا صحرا دُھوپ کڑی ہے، پیڑ نہ کوئی سائے ہیں

جنگل جنگل آگ لگی ہے، دریا دریا پانی ہے
نگری، نگری، تھاہ نہیں ہے لوگ بہت گھبرائے ہیں

سچائی ہے امرت دھارا، سچائی انمول سہارا
سچ کے رستے چل کے سب نے، ٹھور ٹھکانے پائے ہیں

دولت تو ہے آنی جانی، رُوپ نگر کی رام کہانی
دھن کے لوبھی دھرتی پر کب سکھ سے رہنے پائے ہیں

شیشہ جب بھی ٹوٹے گا، جھنکار فضا میں گونجے گی
جب ہی کومل دیش دلارے پتھر سے ٹکرائے ہیں

جھُوٹ کا ڈنکا بجتا تھا جس وقت جمیلؔ اس نگری میں
ہر رستے، ہر موڑ پہ ہم نے سچ کے علم لہرائے ہیں



جمیل ملک

۱۲۔ اگست ۱۹۲۸ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی سے حاصل کی۔ گارڈن کالج سے ایم۔ اے (اردو) کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم میں ڈپلوما حاصل کیا۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی۔ ایڈ کرنے کے بعد ادبیات فارسی میں بھی ایم۔ اے کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کی مرکزی مجالس عاملہ کے ممبر رہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے بنیادی ممبر ہیں۔ اور اس ادارے کی مرکزی اور صوبائی مجالس عاملہ کے ممبر بھی رہے ہیں۔

تحصیل علم کے بعد کچھ عرصہ راولپنڈی سے نکلنے والے روزنامے "بادِ شمال" میں بطور سب ایڈیٹر بھی کام کیا۔ اس کے بعد شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ آج کل ایف۔ جی سرسید کالج راولپنڈی میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔

آپ کے تین شعری مجموعے "سروِ چراغاں" (غزل) "طلوعِ فردا" (نظم) "پردۂ سخن" (غزل) شائع ہو چکے ہیں، اس کے علاوہ "ندیم کی شاعری، فکر، فن اور شخصیت" (تنقید و سوانح) بھی طبع ہو چکی ہے۔ شاعری اور تنقیدی مضامین کے متعدد مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔

جمیل ملک

احساس میں گھل مل جاتی ہے جب مادرِ فطرت کی خوشبو
اپنے تو ہیں اپنے، آتی ہے غیروں سے محبت کی خوشبو

جیسے کوئی پنچھی رک رک کر گمنام کہانی دہرائے
یوں دور سے اڑ کر آتی ہے وہ تیری رفاقت کی خوشبو

جب کوئی سہارا بھی نہ رہے اس وقت یہی کام آتی ہے
کیا ٹھنڈی میٹھی راحت ہے، یہ زخمِ محبت کی خوشبو

اس شہر کے باسی دل کے دیئے شب کو بھی بجھا کر رکھتے ہیں
کن گلیوں ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں حسنِ صداقت کی خوشبو

آنکھوں میں چلی آتی ہے چمک، کھلتی ہی چلی جاتی ہے دھنک
ہر رنگ میں لو دے اٹھتی ہے یوں رقص و حرارت کی خوشبو

وہ فطرت کا چلتا پھرتا شہ پارۂ فن بن جاتا ہے
اک پیکر میں ڈھل جاتی ہے جب صورت و سیرت کی خوشبو

اظہار کے شیریں چھینٹوں سے سب گردِ انا دھل جاتی ہے
جب اندر باہر پھیلتی ہے گلزارِ طبیعت کی خوشبو

تخلیقِ ازل بھی ہم دونوں، تکمیلِ ابد بھی ہم دونوں
ہیں تیری عبادت کی خوشبو، تو میری ریاضت کی خوشبو

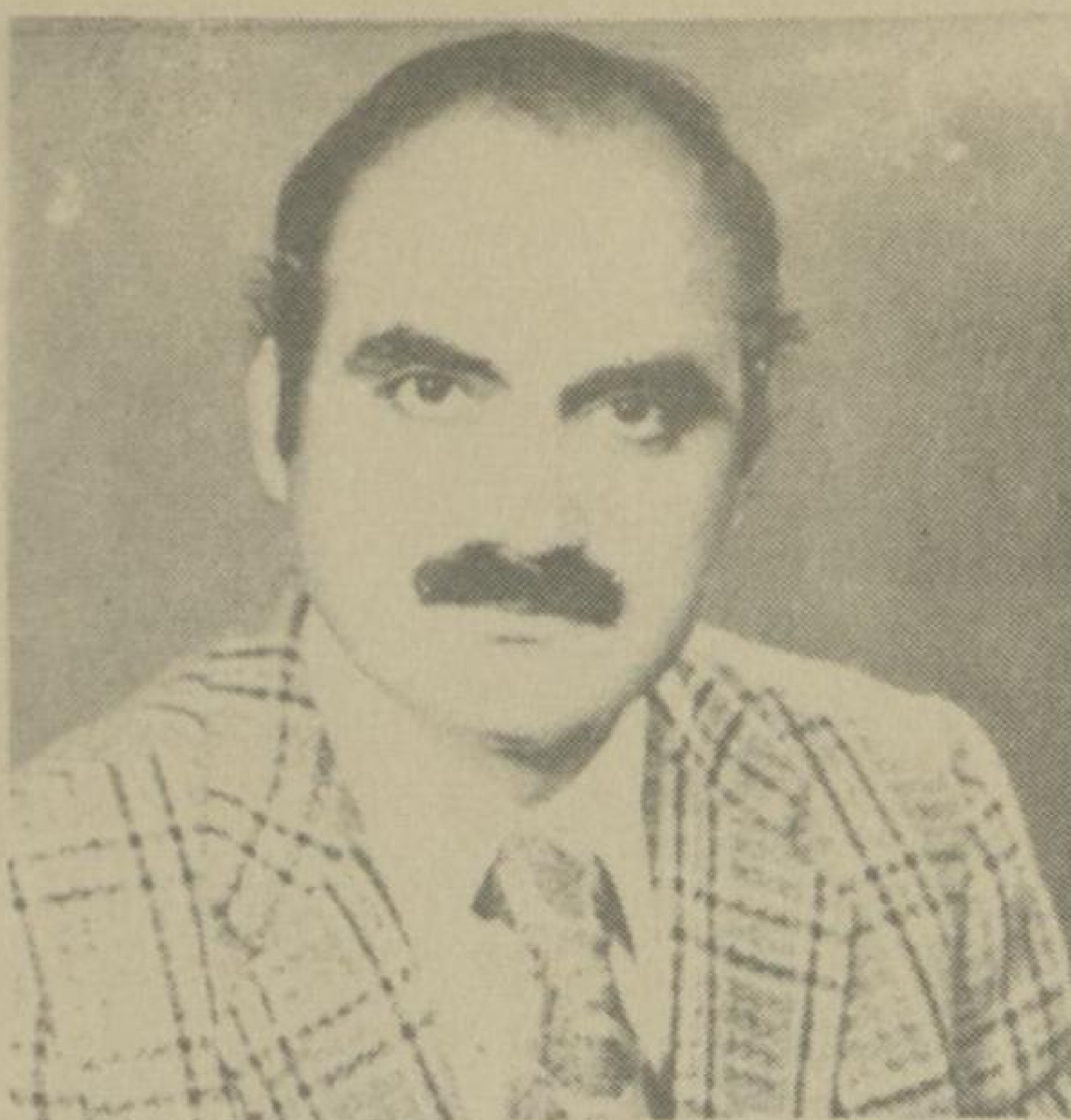
گل بن کے مہکتے ہیں کیا کیا اس وقت پسینے کے قطرے
اعصاب میں رچ بس جاتی ہے جب اپنی مشقت کی خوشبو

وہ کچا رنگ ہے شہرت کا، جو پل بھر میں اڑ جاتا ہے
لیکن صدیوں کی روحِ رواں یہ محنت و عظمت کی خوشبو

سورج کس دیس سے آیا ہے، دامن میں کیا بھر لایا ہے
ایک ایک کرن سے آتی ہے، ایک ایک بشارت کی خوشبو

غزل کی افادیت کے راستے میں بعض دشواریاں بھی ہیں، غزل بڑے خیال کو اور تفصیلی تاثر کو پیش کرنے سے عاجز ہے، چنانچہ ادب کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی شاعر بڑے خیال کو ایک دو مصرعوں میں قید نہیں کر سکتا تو مثنوی یا قصیدہ کا سہارا لیتا ہے۔ بڑے خیالات کے لئے غزل کی نازم شاید کبھی ساتھ نہ دے سکتی۔

(سبط حسن)



جمیل یوسف

جمیل یوسف ۱۹۳۹ء میں چکوال (ضلع جہلم) کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کرنے کے بعد کچھ مدت درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ پھر مقابلہ کا امتحان پاس کیا۔ ان دنوں راولپنڈی میں رینٹ کنٹرولر کے عہدہ پر فائز ہیں۔

شاعری، تحقیق و تنقید اور تاریخ، جمیل یوسف کے خاص میدان ہیں۔ اب تک انکی غزلوں کے دو مجموعے "موجِ صدا" اور "گریزاں" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ تاریخ سے متعلق ایک نثری تصنیف بھی "بابر سے ظفر تک" طبع ہو چکی ہے۔

جمیل یوسف

تیری یادوں کے خُنک سائے یہاں رہ جائیں گے
زخم بھر جائیں گے زخموں کے نشاں رہ جائیں گے

صبح کی پہلی کرن بن کر گزر جاؤ گے تم
ہم جھلستی دھوپ میں جانے کہاں رہ جائیں گے

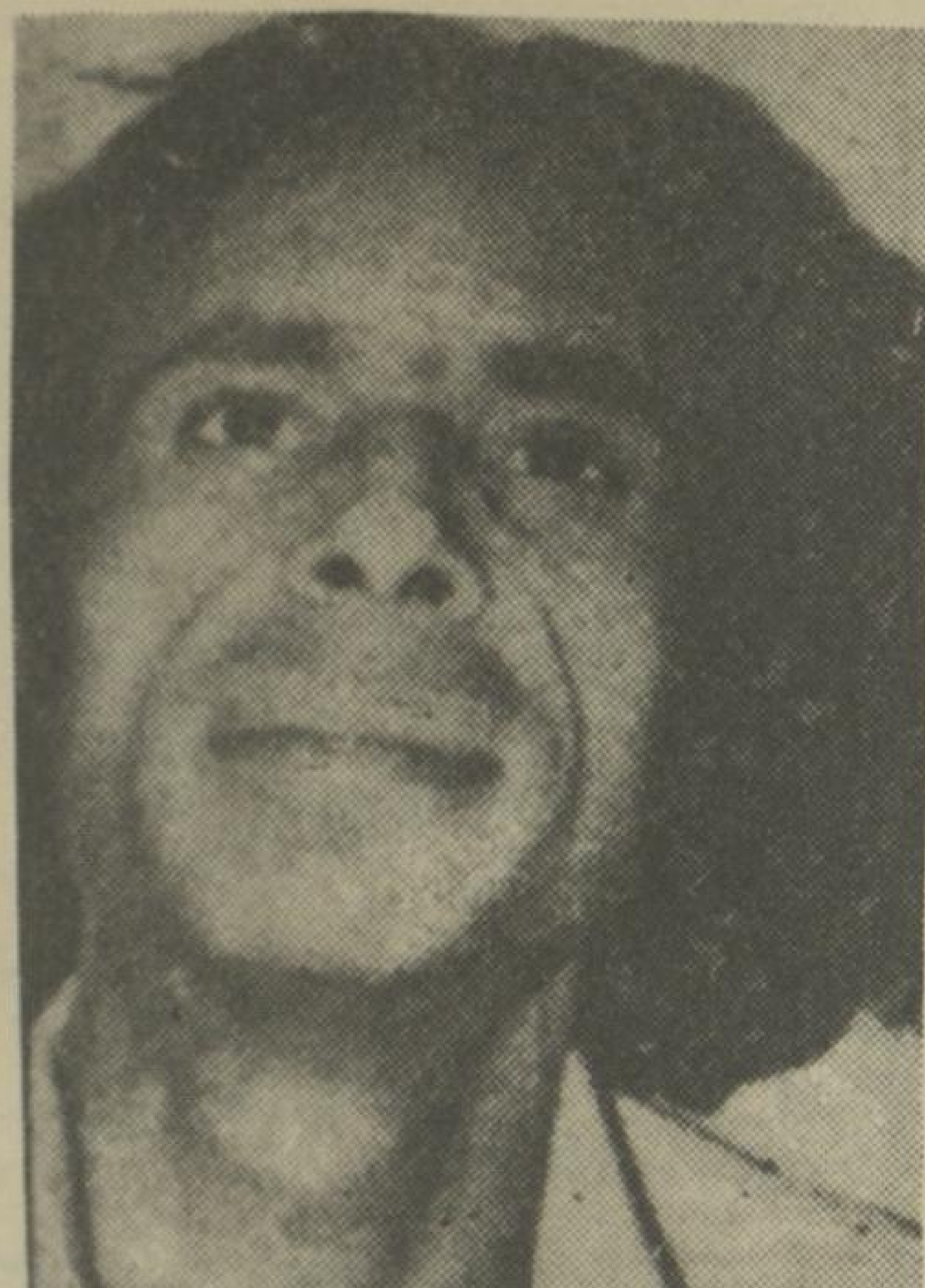
تیری آنکھوں کے سفینے بھی جو اوجھل ہو گئے
ہم بپھرتے پانیوں کے درمیاں رہ جائیں گے

تم ہمارے واسطے تڑپو گے ساری زندگی
ہم بھی نشتر کی طرح پیوستِ جاں رہ جائیں گے

سامنے ہو تم تو اپنے سامنے ہوتے ہیں ہم
تم نہیں ہوگے تو پھر ہم بھی کہاں رہ جائیں گے

دُوریوں کے زہر سے بھر جائیں گے سب راستے
فاصلوں کی زد پہ کتنے کارواں رہ جائیں گے

راہرو کھو جائیں گے آخر سفر کی دھول میں
راستوں پر نقش پائے رہرواں رہ جائیں گے



جون ایلیا

سید جون ایلیا ۱۴؍دسمبر ۱۹۳۵ء کو امروہہ (بھارت) کے ایک علمی و ادبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ گوشتہ کئی برسوں سے آپ اپنی اہلیہ زاہدہ حنا کے ساتھ مل کر عالمی ڈائجسٹ نکال رہے ہیں۔ جوہر صقلی (ترجمہ) آپ کی مطبوعہ تصنیف ہے۔ علاوہ ازیں انقلابی صوفی حلاج۔ کتاب الطواسین (ترجمہ)، آپ کی زیر ترتیب تصانیف ہیں۔ آپ کا کلام ملک کے متعدد ادبی جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

جون ایلیا

پہنائی کا مکان ہے اور در ہے گم یہاں
راہِ گریزِ پائی صرصر ہے گم یہاں

وسعت کہاں جو سمت و طرف پرورش کریں
بالیں کہاں سے لائیں؟ کہ بستر ہے گم یہاں

عرضِ سخن کے وقت میں چیخوں سو تب بھی کیا
باہر کی ہے جو چیز وہ باہر ہے گم یہاں

ہے ذات کا وہ زخم کہ جس کا شگافِ رنگ
سینے سے دل تلک ہے پہ خنجر ہے گم یہاں

بیرونِ ذات کیسے ہے صد ماجرا فروش؟
وہ اندرونِ ذات جو اندر ہے گم یہاں

کس شاہراہ پر ہول رواں میں بصد شتاب
اندازِ پا درست ہے ۔ پر سر ہے گم یہاں

بس طور کچھ نہ پوچھ مری بود و باش کا
دیوار و در ہیں جیب میں اور گھر ہے گم یہاں

حرف ایک خامشی ہے جو لب تک پہنچ سکے
لب پر سخن ہے، زینۂ لب پر ہے گم یہاں

قطرے ہیں سطح وسیل ہے ساحل ہے موج ہے
میں ڈوب تو رہا - پہ سمندر ہے گم یہاں
ہیں صفحۂ وجود پہ سطریں کھنچی ہوئی
دیوار پڑھ رہا ہوں مگر در ہے گم یہاں
لمحوں کی دھند میں ہے خدا کا وجود کیا
یہ وہ غبار ہے کہ خدا گر ہے گم یہاں

غزل گو شاعر کسی پائیں باغ کی طرف کھلنے والے دریچہ کو بند نہیں رکھتا ہے۔ وہ زندگی کے دریچے سے ہر منظرِ زیبا و نازیبا کو دیکھتا ہے، اور پھر اس کی دروں بینی ان خارجی مطالعوں اور مشاہدوں پہ آپ بیتی کا رنگ چڑھا دیتی ہے۔ غزل کی دنیا میں شہروں کا اجڑنا، دِل کا اجڑنا بن جاتا ہے۔

(ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی)



جوہر نظامی

جوہر نظامی، سرگودھا کی بزرگ ادبی شخصیت ہیں۔ عمر کا ابتدائی حصہ یہیں گذرا۔ جہاں انہوں نے ۱۹۲۸ء میں ایک ادبی انجمن "بزمِ ادب" کے نام سے قائم کی۔ اس انجمن کا سرگودھا کی جدید نسل کی ذہنی تربیت میں بڑا حصہ ہے۔ اسی انجمن کے تحت اقبال کی زندگی میں، جنوری ۱۹۳۸ء میں پہلا یوم اقبال سرگودھا میں منایا گیا۔ جب جوہر نظامی بعض مجبوریوں کے تحت، سرگودھا سے جوہر آباد آ گئے تو اس انجمن کو "انجمن ترقیٔ اردو" میں مدغم کر دیا گیا۔ اس انجمن کا ذکر اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایک زمانہ میں لوگ یہی کہتے تھے کہ جوھر نظامی ہی دراصل بزمِ ادب کا دوسرا نام ہے۔

یوں تو جوہر مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں لیکن ان کی طبیعت کا جوہر دراصل غزل ہی میں کھلتا ہے۔

آپ کا شعری مجموعہ "لوحِ محفوظ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جوہر نظامی

حقیقتوں سے ہے دُنیا کو احتراز بہت
کہ ہے مزاجِ زمانہ فسانہ ساز بہت

ترا غرورِ عبادت تجھے نہ لے ڈوبے
سنا ہے پڑھتا تھا ابلیس بھی نماز بہت

کوئی بھی فطرتِ یزداں کا رکھ سکا نہ بھرم
جو نا سزا تھے وہ کہلائے پاکباز بہت

یہ کہہ رہے تھے کل آوارگانِ کوچۂ یار
ادائیں آج بھی اس کی ہیں دلنواز بہت

اُنہیں شعورِ محبت نہیں خدا کی قسم
جو لوگ ہیں تری محفل میں سرفراز بہت

مِری خوشی کا زمانہ ہَوا کا جھونکا تھا
مرے غموں کی رہی زندگی دراز بہت

یہ حسن و عشق کا جوہرؔ ہے اور کچھ بھی نہیں
وہ خود پسند بہت ہیں میں بے نیاز بہت



حبیب احمد صدیقی

حبیب احمد صدیقی — سیوہارہ ضلع بجنور (یو۔پی) کے صدیقی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۲۹ء میں ایم۔اے (انگریزی) اور ایل ایل بی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔

ملازمت کا آغاز ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے ہوا اور پھر اپنی ذہانت، قابلیت اور فرض شناسی کی بدولت ترقی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے، نینی تال کے کمشنر رہے اور یو۔پی پبلک سروس کمیشن کی ممبری پر بھی فائز ہوئے۔ آپ ۱۹۶۹ء میں پاکستان آ گئے۔

آپ کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن کے نام "جلوۂ صد رنگ" اور "گلِ صد برگ" ہیں۔

حبیب احمد صدیقی

ہمارا نام زباں پر جہاں بھی آتا ہے
تو ذکرِ کج روئی آسماں بھی آتا ہے

فغاں کا شغل ہے مرغوب ہم سبھی کو مگر
وہ کم ہیں جن کو شعورِ فغاں بھی آتا ہے

رہِ وفا میں قدم احتیاط سے رکھیئے
کہیں کہیں کوئی سنگِ گراں بھی آتا ہے

ہزار ضبط کرے کوئی پر کبھی نہ کبھی
زباں پہ شکوۂ اہلِ جہاں بھی آتا ہے

بہار کیوں ہے گریزاں ہمارے گلشن سے
اگرچہ ابرِ بہاراں یہاں بھی آتا ہے

گلوں سے اتنی بھی وابستگی نہیں اچھی
رہے خیال کہ عہدِ خزاں بھی آتا ہے

بشر کا آنا جہاں میں ہے یوں تو وجہِ نشاط
بشر کے ساتھ غمِ دو جہاں بھی آتا ہے

جو کام کرنے ہیں ان میں نہ چاہیئے تاخیر
کبھی پیامِ اجل ناگہاں بھی آتا ہے



حسن اختر جلیل

پورا نام راجہ حسن اختر اور جلیل تخلص ہے۔ آپ ۲۴ جولائی ۱۹۳۵ء کو جھنگ میں پیدا ہوئے۔ سرگودھا میں تعلیم پائی جہاں آپ کے والد حضرت جوہر نظامی بہ سلسلہ ملازمت مقیم تھے۔

حسن اختر جلیل نے بی اے کرنے کے بعد ملازمت اختیار کی۔ ان دنوں آپ جھنگ میں بطور مجسٹریٹ تعینات ہیں۔

شاعری میں ابتدائی اصلاح آپ نے اپنے والد گرامی ہی سے لی۔ آپ کی غزل اور نظم کے مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔

حسن اختر جلیل

اُسی کی جہدِ طلب امتیاز اپنا ہے
وہ فصل جس کی تمنّا جواز اپنا ہے

وفا کے دشت میں کوئی نہیں کسی کا مگر
ہر ایک خارِ مسافر نواز اپنا ہے

ہر ایک دور میں ہم پر رہی ہے بارشِ سنگ
شکستہ گر نہ ہوئے ، یہ گداز اپنا ہے

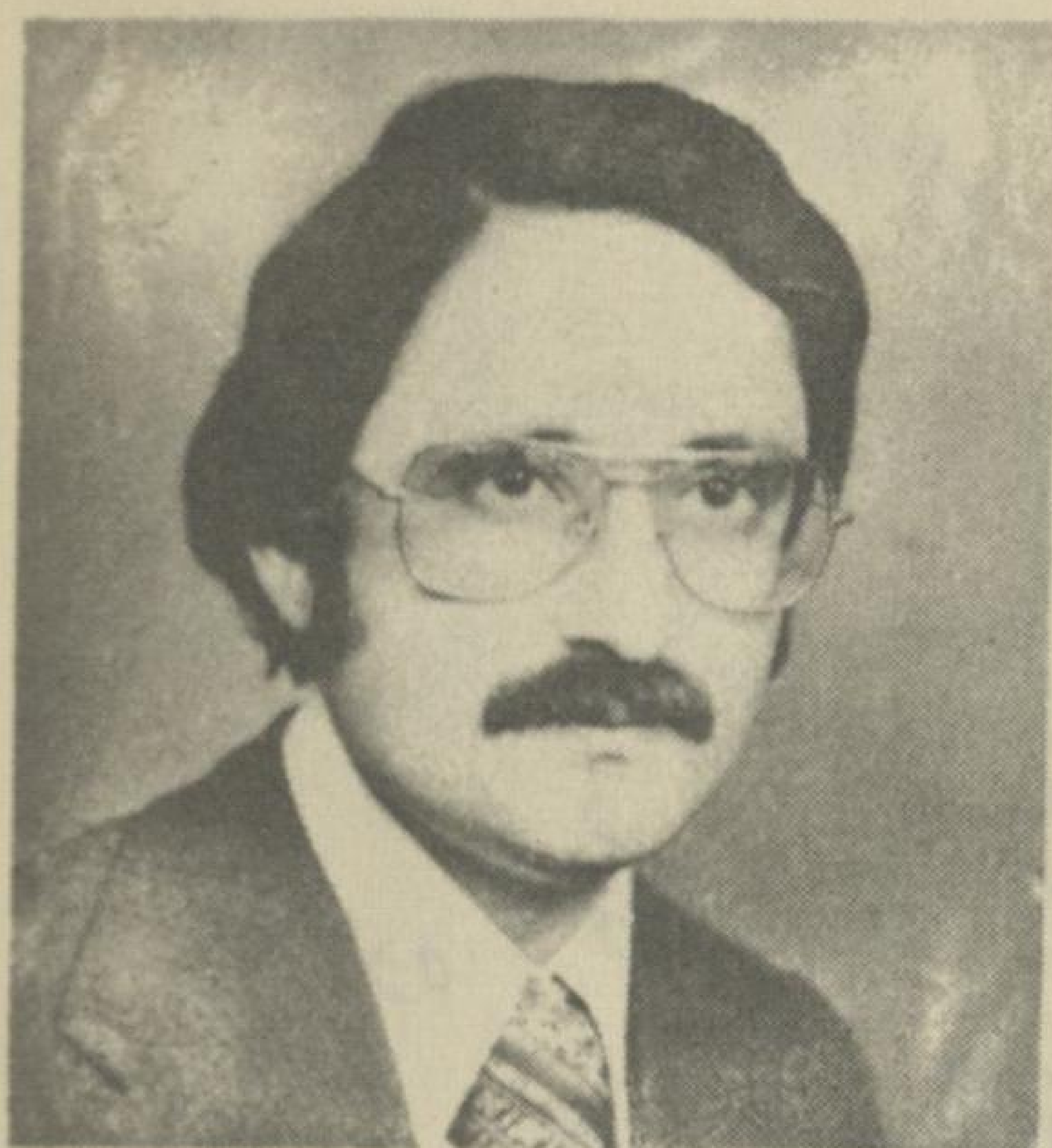
ہمارے دکھ کا شرر ہے اُسی کی مٹّی میں
وہ بے وفا ہے مگر اہلِ راز اپنا ہے

ہمارے پیار کی لَو ہے اسی کے سینے میں
وہ حیلہ جُو ہے کہ افسانہ ساز، اپنا ہے

اُسی کے۔ لب پہ گلے ہیں اُسی کی۔ دل میں کسک
اُسی سے ناز، اسی سے نیاز اپنا ہے

ہزار حمد کہ لب پر فغانِ غیر نہیں
ہزار شکر کہ ہاتھوں میں ساز اپنا ہے

کبھی تو آئے گا وہ دورِ دلکشا بھی جلیلؔ
اگرچہ سلسلۂ غم دراز اپنا ہے



حسن اکبر کمال

۲۴ فروری ۱۹۴۶ء کو آگرہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد والدین کے ہمراہ یہاں آگئے۔ ان کے والد اپنی ملازمت کے سبب ملک کے مختلف علاقوں میں رہے، اس شہر نوردی نے حسن اکبر کمال کو بقول ان کے بہت کچھ دیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی دوسری سرگرمیاں غیر اہم نہیں رہیں۔

اب سے کوئی گیارہ برس پہلے انگریزی ادب میں ایم، اے کیا تھا، ان دنوں کراچی کے ایک کالج میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

پہلی نظم ۱۹۶۲ء کے موسمِ خزاں میں لکھی اور پہلا مجموعۂ کلام "سخن" کے نام سے ۱۹۶۹ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ دوسرا شعری مجموعہ "خزاں میرا موسم" عنقریب شائع ہو رہا ہے۔

حسن اکبر کمالؔ

دودھ جیسا جھاگ ، لہریں ، ریت اور یہ سیپیاں
جن کو چنتی پھر رہی ہیں موتیوں سی لڑکیاں

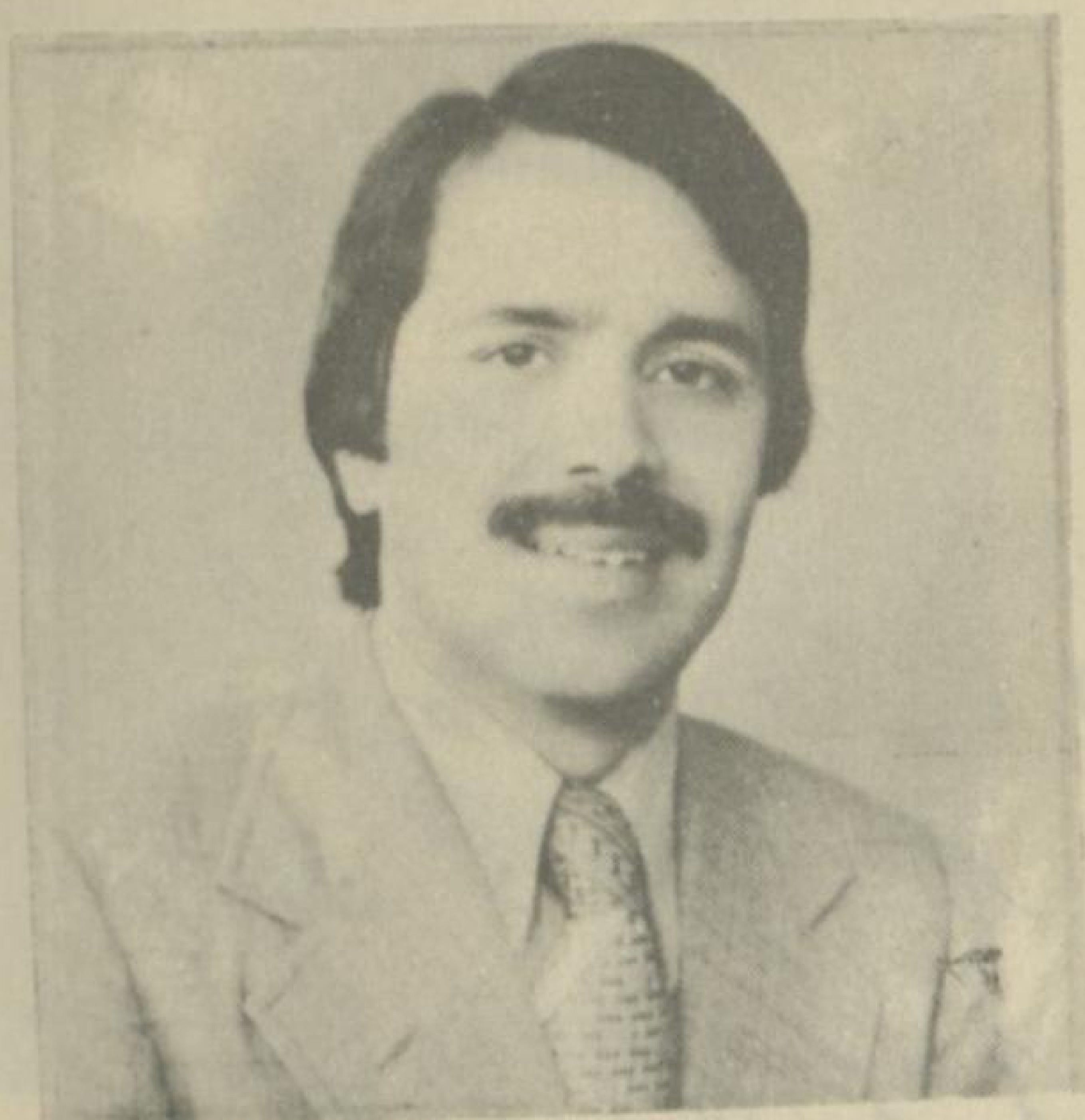
باغ میں ، بچّوں کے گرد و پیش یوں اُڑتی پھریں
جیسے قاتل اپنا اپنا ڈھونڈتی ہوں تتلیاں

وہ مجھے خوشیاں نہ دے اور میری آنکھیں نم نہ ہوں
ہے یہ پیماں زندگی کے اور میرے درمیاں

بام و در اُن کے ، ہوا کس پیار سے چھوتی رہی
چاندنی کی گود میں جب سو رہی تھیں بستیاں

کل یہی بچّے سمندر کو مقابل پائیں گے
آج تیراتے ہیں جو کاغذ کی ننھّی کشتیاں

گھومنا پھروں گھنے ، مہکے ہوئے بَن میں کمالؔ
واپسی میں دیکھنا اپنے ہی قدموں کے نشاں



حسن رضوی

پورا نام سید حسن عباس رضوی ہے۔ آپ ۱۸ اگست ۱۹۴۶ء کو بمقام انبالہ (مشرقی پنجاب) پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ اورینٹیل کالج سے ایم اے کرنے کے بعد، درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے، ان دنوں ایف سی کالج لاہور کے شعبۂ اردو سے متعلق ہیں۔

حسن رضوی، اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے شاعر ہیں۔ اردو میں بیشتر غزلیں اور پنجابی میں نظمیں کہتے ہیں۔ دونوں زبانوں میں حمدیہ و نعتیہ کلام اور سلام بھی لکھے ہیں۔ صحافت، ریڈیو اور ٹی وی سے بھی مختلف حیثیتوں میں وابستہ رہے ہیں۔

اردو غزلوں کا مجموعہ "ساون کی دھوپ" کے نام سے زیر ترتیب ہے۔ آپ کا پنجابی کلام "اکھر" بھی ترتیب و تکمیل کے مراحل میں ہے۔

حسن رضوی

اِس درجہ میری ذات سے اس کو حسد ہوا
جو بھی بیان میں نے دیا مسترد ہوا!

اُس نے ہی دی سزا مجھے صحرا کی دھوپ میں
میرے بدن کی چھاؤں سے جو نابلد ہوا

ایسی ہوا چلی کہ ہر اِک شاخ جل گئی
وہ پیڑ جو ہرا تھا غموں کی سند ہوا

سوچیں ہیں آب آب تو تحریر خواب خواب
ہم کیا کہیں کہ کون یہاں نیک و بد ہوا

اُس کا ستارا میرے ستارے سے یوں ملا
نام اس کا اور نام مرا ہم عدد ہوا

اُس کی ہی جستجو میں یہ چہرے اُداس ہیں
وہ آئنہ کہ جس کا تقاضا اشد ہوا

جس نے صداقتوں کو لہو سے رقم کیا
اُس کا ہر ایک لفظ حسنؔ مستند ہوا



حسن عابدی

حسن عابدی، ۷ جولائی ۱۹۲۹ء کو جون پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شبلی ہائی سکول اعظم گڑھ سے حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ شبلی کالج اور گریجوئیشن الہ آباد یونیورسٹی سے کیا۔

آپ ۱۹۵۴ء سے صحافت کے پیشے سے وابستہ ہیں۔

حسن عابدی کی شاعری کا آغاز دورِ طالب علمی ہی سے ہو گیا تھا جو مختلف وقفوں سے اب تک جاری ہے۔

مجموعۂ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

حسن عابدی

سفر میں ایک جُگ تمام ہو گیا
اب اپنے گھر کا راستہ بھی کھو گیا
پھر اس کے پیرہن کی بُو نہ مل سکی
وہ میرے خوں میں آستیں ڈبو گیا
وہ نیشتر جو اس کے ہاتھ میں نہ تھا
گیا، تو میری سانس میں پرو گیا
اب آنسوؤں کی فصل کاٹتے رہو
جدائیوں کے بیج وہ تو بو گیا
نہ جانے کس نگر میں آج شام ہو
سحر ہوئی تو جی اداس ہو گیا
گذر گئی جو بے گھروں پہ کیا کہیں
زمیں کو ابرِ برشگال دھو گیا
مری تو آنکھ نم نہ ہو سکی مگر
وہ مجھ پہ میرے آنسوؤں سے رو گیا
لکھے گا کون اس صدی کی داستاں
ہر ایک پل ہزار سال ہو گیا



حسن عبّاس رضا

حسن عبّاس رضا، ۲۰ نومبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ یہیں ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی اور یہیں ملازمت کا آغاز کیا۔ یوں تو شعر سننے اور پڑھنے کا شوق زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا مگر شعر گوئی کی ابتدا ۱۹۷۱ء سے ہوئی۔

حسن عبّاس رضا اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ آپ کا کلام پاکستان کے مقتدر ادبی جرائد میں برابر شائع ہوتا رہتا ہے۔

مجموعۂ کلام "ہتھیلی پہ رقص" ترتیب دے چکے ہیں۔ ابھی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

حسن عباس رضا

اپنے ہونے کا کیونکر دلائیں یقیں
ہم ابھی تک گمانوں سے نکلے نہیں

ذہن میں کچھ تھا، اور حرف کچھ لکھ گئے
ساری بے چینیاں اپنے ہاتھوں میں تھیں

ممٹیوں پر نہ پھر دھوپ اتری کبھی
بارشیں مستقل مہرباں ہو گئیں

ق

دو گھڑی کی رفاقت تھی اور لڑکیاں
رقص کرتے ہوئے خواب بننے لگیں

جانتی تھیں، کہ سپنے بکھر جائیں گے
پھر بھی پاگل ہوا سے لپٹتی رہیں

دوڑتے دوڑتے، سب سے بچھڑے، مگر
تتلیاں خواہشوں کی نہ ہاتھ آ سکیں

ہاں رضاؔ، ایسی ہی رُت کی اک شام تھی
اپنی پہچان کی جب پتنگیں کٹیں



حسن عسکری کاظمی

حسن عسکری کاظمی انبالہ (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن میں حاصل کرنے کے بعد لاہور آئے اور یہاں پہلے بی اے اور پھر ۱۹۵۶ء میں ایم اے (اردو) کے امتحانات پاس کئے۔

آپ نے ملازمت کا آغاز بحیثیت افسر تعلقاتِ عامہ ترقیٔ دیہات کیا۔ پھر ۱۹۶۱ء میں جہلم میں لیکچرار ہو گئے، جہاں بھرپور ادبی زندگی بسر کی۔ ۱۹۷۸ء میں لاہور تبادلہ ہو گیا آپ ان دنوں گورنمنٹ کالج باغبان پورہ میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔

حسن عسکری کاظمی نظم ونثر دونوں لکھتے ہیں۔ مجموعۂ کلام ابھی طبع نہیں ہوا۔

حسن عسکری کاظمی

وہ حرف حرف مری روح میں اتر جائے
میں کم نظر ہوں مری عاقبت سنور جائے

میں آبجُو ہوں مگر اس کے فیض سے جاری
سمندروں کے سفر پر جو بے خطر جائے

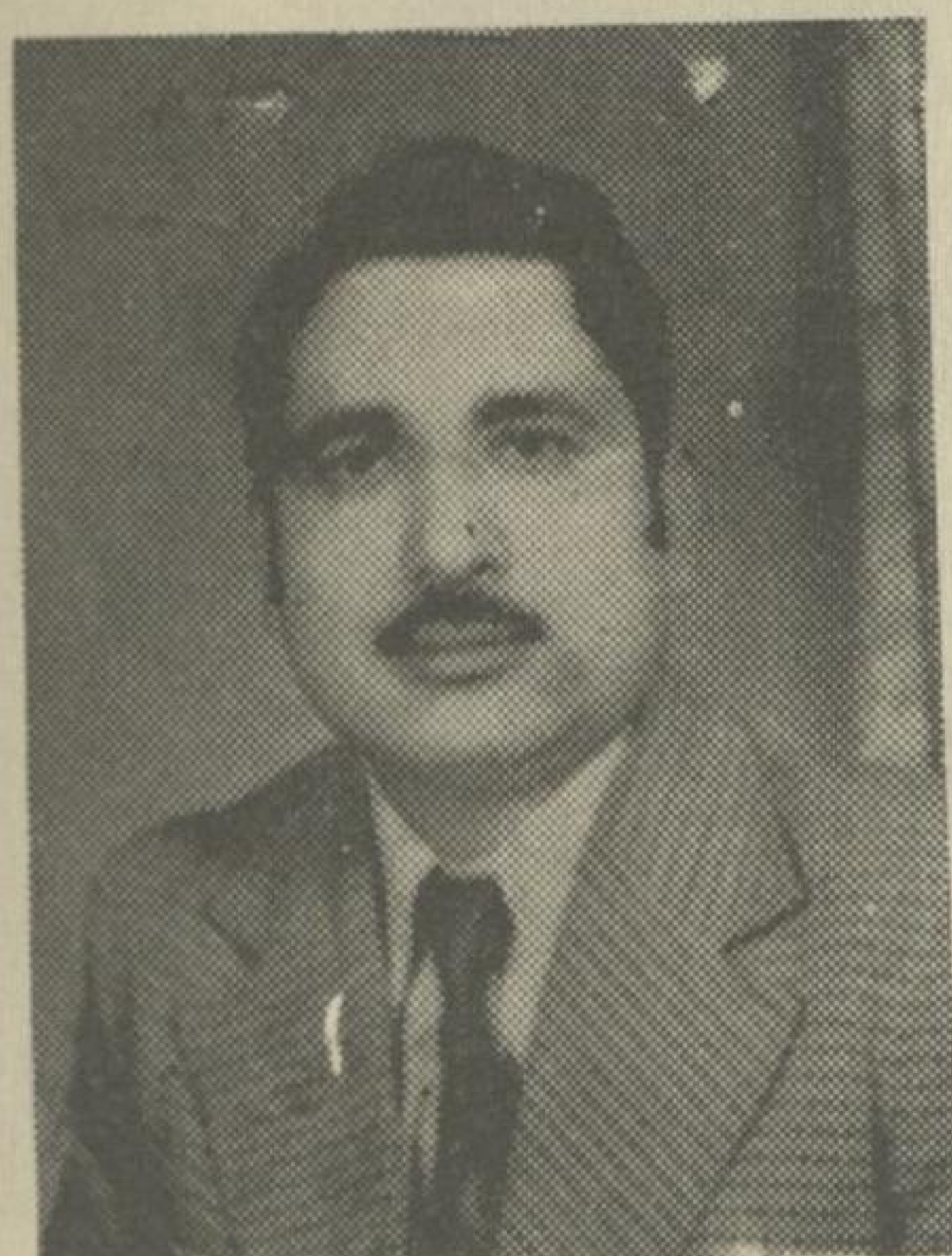
چراغِ لالہ کی صورت رہے سدا روشن!
میں اُس کو دیکھوں مثالِ صبا گزر جائے

خدا کرے کہ بُلائے نہ شہر یار مجھے
خمیدہ سر تو نہ جاؤں گا چاہے سر جائے

وہ جس کے سامنے صبر و رضا کی منزل ہے
تلاشِ رزق میں کیسے وہ در بدر جائے

میں اس کی عظمتِ کردار کا نہیں قائل
جو بات کرکے مرے سامنے مُکر جائے

مرے مقام سے واقف ہیں اہلِ عرش حسنؔ
جہاں نہ جائے فرشتہ وہاں بشر جائے



حسن ناصر

حسن ناصر، ۴ اپریل ۱۹۴۳ء کو نارووال ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آبائی گاؤں کا نام اونچی رسول پور سیداں ہے۔

ان کے والد سید فضل حسن شاہ فضل ایڈووکیٹ ہیں۔ حسن ناصر نے ابتدائی تعلیم مشن ہائی اسکول نارووال میں حاصل کی۔ مرے کالج سیالکوٹ سے ایف ایس سی کرنے کے بعد، لاہور انجینئرنگ کالج میں فنی تعلیم کے لئے داخل ہوئے۔ آج کل پاکستان آرڈیننس فیکٹری واہ میں میکینیکل انجینئر ہیں۔

ادبی ماحول چونکہ گھر میں میسّر تھا اس لئے بچپن ہی سے شاعری کی طرف میلان پیدا ہوگیا جس نے جلد ہی شعرگوئی کی شکل اختیار کرلی۔ واہ کی ادبی اور تنقیدی محفلوں نے ان کے ذوق میں نکھار پیدا کیا۔

حسن ناصر کی شاعری کا پہلا مجموعہ "بنجر زمین میں سفیر" کے نام سے اشاعت کے مراحل میں ہے۔

حسن ناصر

منظر میں اگر کچھ بھی دکھائی نہیں دیگا
کوئی بھی ترے حق میں صفائی نہیں دیگا

وہ چاند جو اترا ہے کسی اور کے گھر میں
مجھ کو تو اندھیروں سے رہائی نہیں دیگا

خود اپنی زبانوں سے لہو چاٹنے والو
ظالم تو ستم کرکے دہائی نہیں دیگا

سہمی ہے سماعت کہ کوئی لفظ ہی گونجے
اک شور کہ پھر کچھ بھی سنائی نہیں دیگا

دہلیز کے اس پار بھی پہنچے گا باآلاخر
کب تک یہ لہو اس کو دکھائی نہیں دیگا

جو شخص کمائے گا وہی کھائے گا ناصرؔ
اوروں کو کوئی اپنی کمائی نہیں دیگا



حضور احمد سلیم

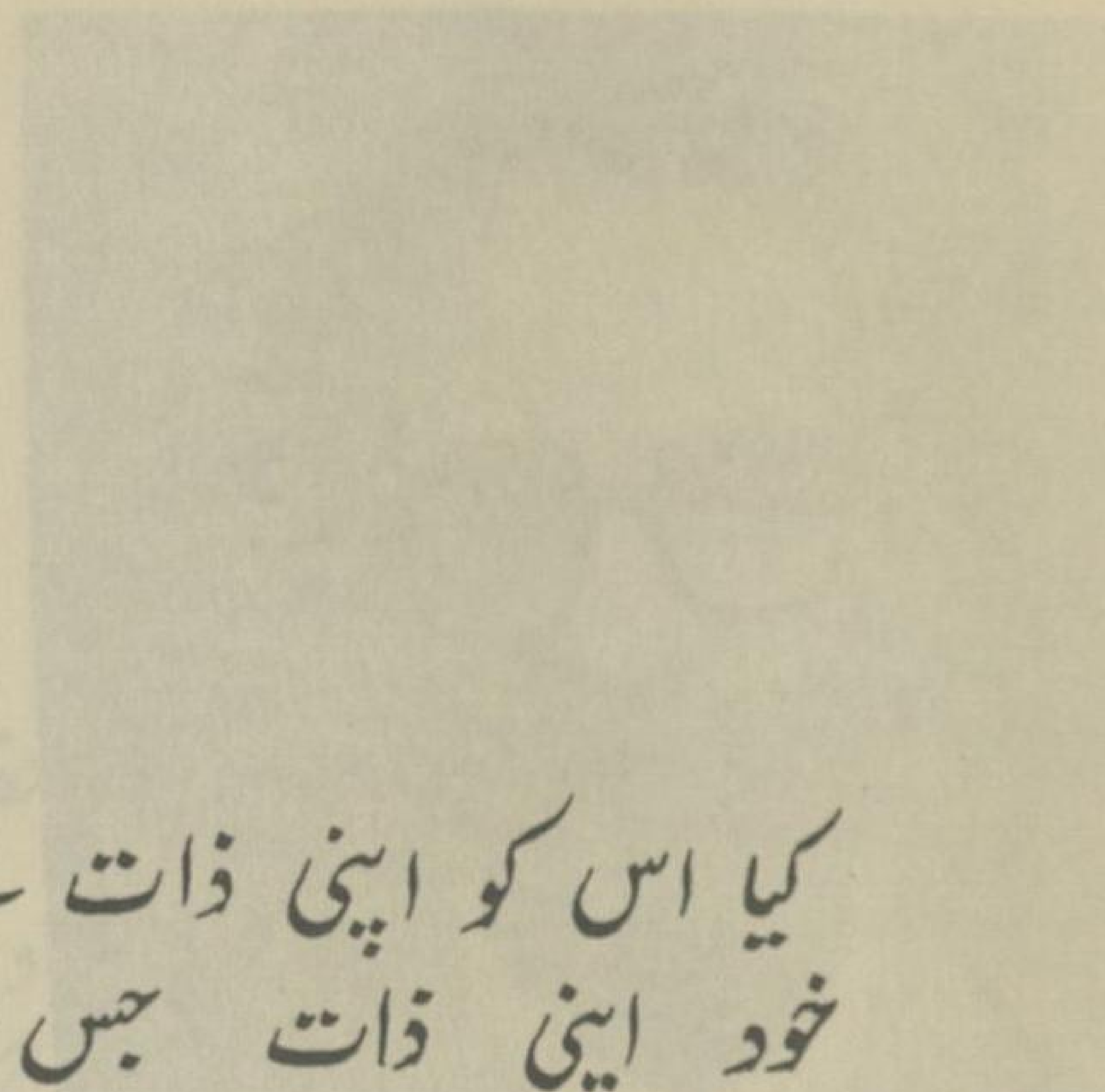
تاریخ ولادت ۱۶۔اگست ۱۹۲۴ء نسباً بھٹی راجپوت ، سابقہ آبائی وطن مہندرگڑھ (مشرقی پنجاب) حال متوطن حیدرآباد (سندھ) پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور ادیب فاضل کی اسناد لیں۔ ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور جدید فارسی زبان و ادب کی تحصیل تہران یونیورسٹی سے کی۔ ۱۹۵۶ء سے سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی سے متعلق ہیں۔

تصانیف : آموزگار فارسی ۔ دو بیتی نامہ باباطاہر۔ انتخاب پیام مشرق (اردو منظوم ترجمہ) حیات قلندر نقشبندی ۔ نسب نامہ الف خان بھٹی ۔ لذّت الارواح (حضرت غلام نبی مجدّدی ۔ قندھار متوفی ۱۸۱۱ء کی سوانح اور منظوم ترجمہ مثنوی)

سلسلہ نقشبندیہ میں شرف بیعت رکھتے ہیں ۔ ۱۹۵۳ء میں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔

اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی اشعار کہتے ہیں۔

مجموعہ کلام طبع نہیں ہوا۔



حضور احمد سلیم

کیا اس کو اپنی ذات سے باہر دکھائی دے
خود اپنی ذات جس کو سمندر دکھائی دے

ہیں وہ بھی لوگ کیا کہ جنہیں گردشِ فلک
اک دلنواز گردشِ ساغر دکھائی دے

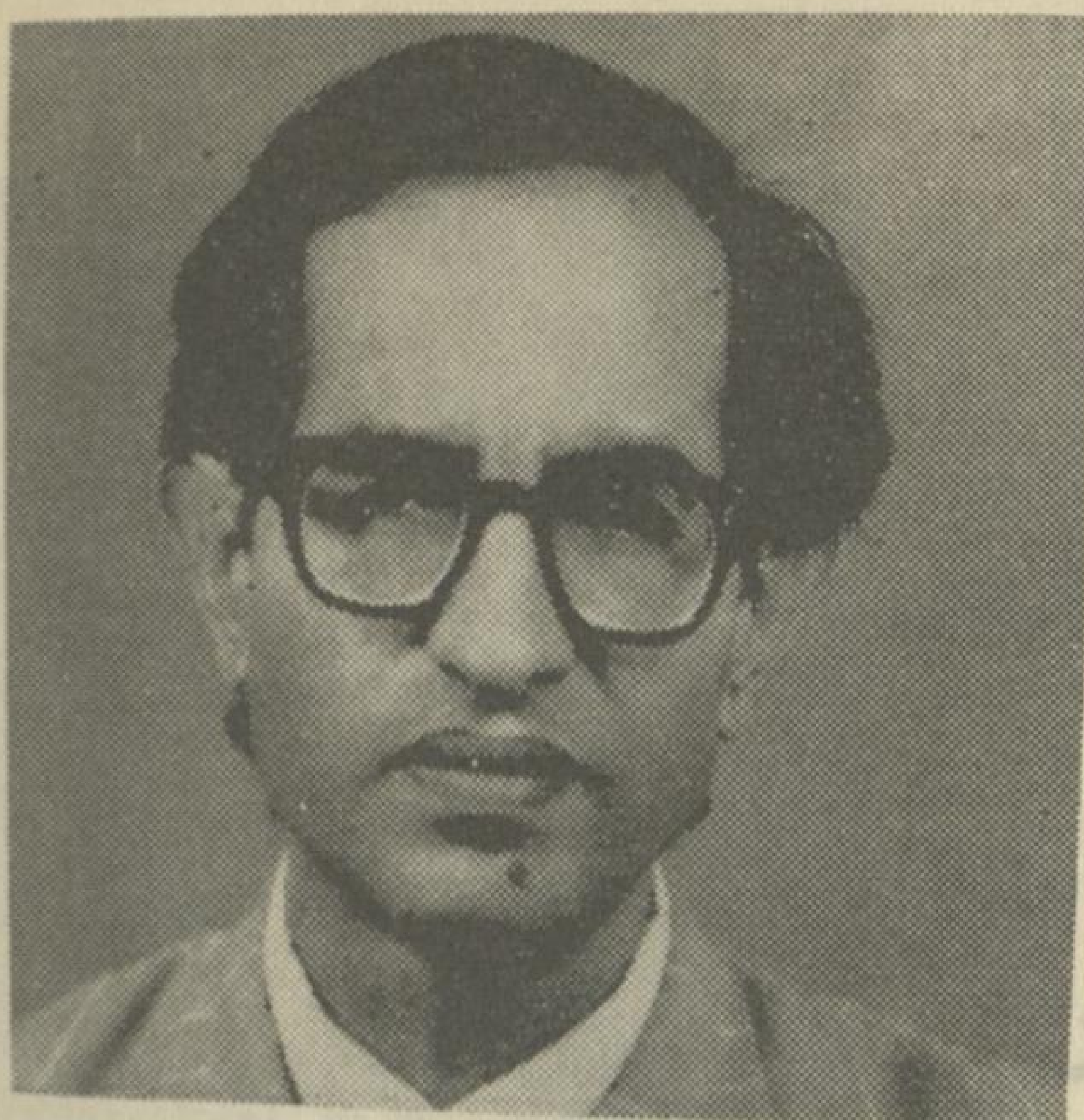
کیا کیجئے کہ ان کو مری عرضِ شوق کا
ہر حرف نوکِ دشنہ و خنجر دکھائی دے

اس بے بصر سے کیا کریں نقد و نظر کی بات
پتھر گہر ، گہر جسے پتھر دکھائی دے

عظمت کا اک نشاں ہیں درختانِ سایہ دار
جن کے سروں پہ دھوپ ہی اکثر دکھائی دے

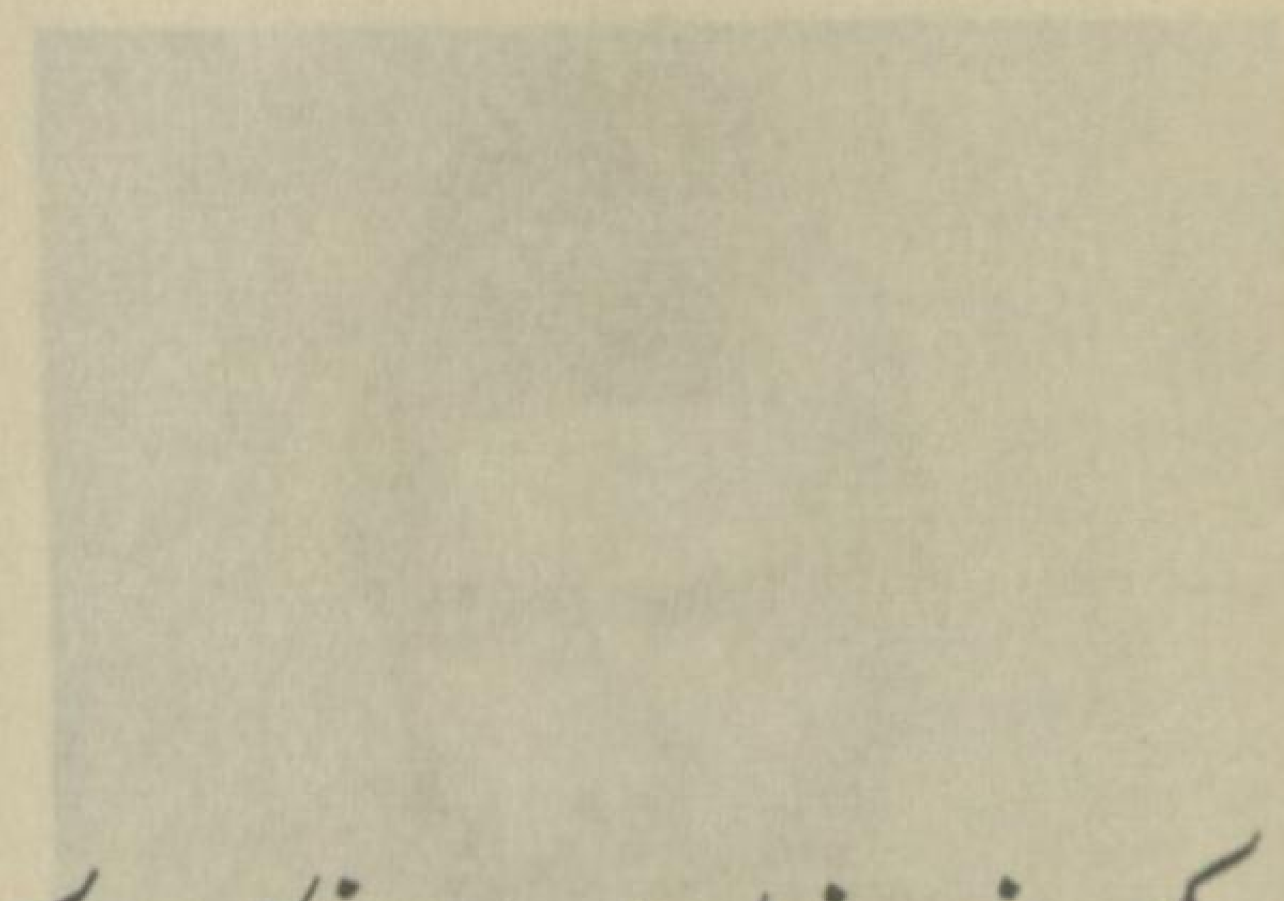
ہستی کہ اک حجابِ دوئی ہے یہ جب اٹھے
ہر سمت حسنِ چہرۂ دلبر دکھائی دے

بیعت کرے خرد جو بدستِ جنوں سلیم
زیرِ فلک بہشت کا منظر دکھائی دے



حفیظ صدیقی

آپ ۲۸ جون ۱۹۳۳ء کو پسرور ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں چوہان قریشیاں میں پیدا ہوئے۔ بقول ان کے دیہات کی سیدھی سادی اور بے ریا زندگی نے سچ بولنا سکھایا اور نامساعد حالات نے صبر و ہمت اور توکّل کے ساتھ مسلسل محنت کا راستہ دکھایا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور اور اسلامیہ کالج لاہور تعلیم حاصل کی۔ آج کل آپ گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور میں صدر شعبۂ اردو کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں درسی کتب کے علاوہ آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، آٹھ کتابیں زیر طبع اور دو زیر ترتیب ہیں۔ آپ ماہنامہ "تحریریں" کے اعزازی مدیر بھی ہیں۔



حفیظ صدیقی

کبھی خود فریبیوں سے نکل، کہ حقیقتوں کا ہو سامنا
دلِ مضطرب! اُسے بھول جا، کہ وہ خواب تھا سو بکھر گیا

ترا کرب اپنی جگہ مگر، نہ عذابِ عمر بنا اسے
کہ ترے خلوص کی آگ سے نہ وہ برف زار پگھل سکا

جہاں سب حقیقتیں ہیچ ہوں، وہاں رشتے نبھتے نہیں کبھی
اُنہیں آج آپ ہی توڑ دے، جنہیں کل کو لکھا ہے ٹوٹنا

ترے پاس صرف اصول ہیں جو عبث ہیں اُس کی نگاہ میں
دلِ حق پرست بتا بھی دے، کہاں تک چلے گا یہ سلسلہ

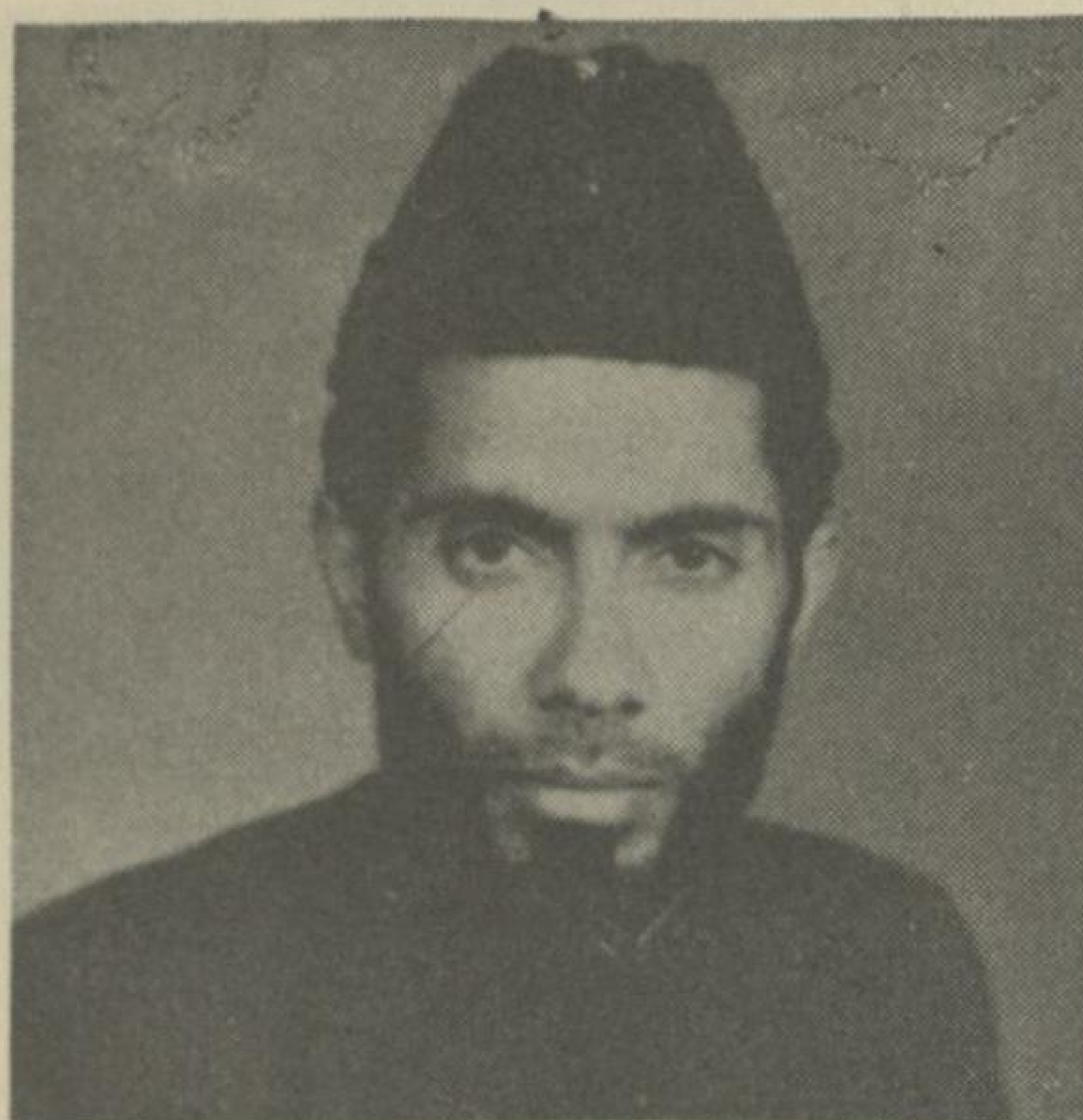
وہ ہزار راحتِ جاں سہی، گر اُسے بچھڑنے کا دکھ نہیں
سرِ راہ بھی وہ ملے کہیں تو نظر اٹھا کے نہ دیکھنا

اگر اُس کا راستہ مختلف ہے تو اس کا کوئی بھی غم نہ کر
مری جان! شہرِ مراد کا فقط ایک ہی نہیں راستہ

وہ کہے اگر کہ وہ بے خبر ہے مری وفا سے، تو جھوٹ ہے
یہ گلہ بجا ہے کہ میں کبھی اپنی سطح سے نہ اُتر سکا

اگر عمر جھوٹی شہادتوں کے دفاع ہی میں گزر گئی
تجھے کیا جو بعد میں وقت نے ترے حق میں دے دیا فیصلہ

وہی آرزو، وہی خواہشیں، وہی حسرتیں، وہی فاصلے
وہی ایک دشتِ فراق ہے، وہی ایک رنگ سراب کا



حکیم افتخار فخر

آپ کی پیدائش ۱۹۳۸ء میں بمقام ساڈھورہ ضلع انبالہ (بھارت) ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور منڈی بہاؤالدین ضلع گجرات میں آباد ہوئے۔ یہیں اسکول کی تعلیم مکمل کی جس کے بعد اپنے والد حکیم سید بشیر احمد سے علمِ طب حاصل کیا اور اب اسی پیشے سے متعلق ہیں۔

شاعری سے شغف اوائل عمر ہی سے تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔

افتخار فخر کا کلام مختلف مذہبی و ادبی جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

مجموعۂ کلام "اقتباسِ درد" کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔

حکیم افتخار فخرؔ

کرن کرن سے ستاروں کے زاویے ٹوٹے
طلسمِ شب کے اجالوں سے رابطے ٹوٹے

ہمارے ساتھ پریشاں تھے پیاس کے منظر
کہ ریگ زار میں ہر اک سے واسطے ٹوٹے

ہوا کے ہاتھ میں ٹھہرا ہوا تھا آئینہ
چلا تو عکس کے سارے معاملے ٹوٹے

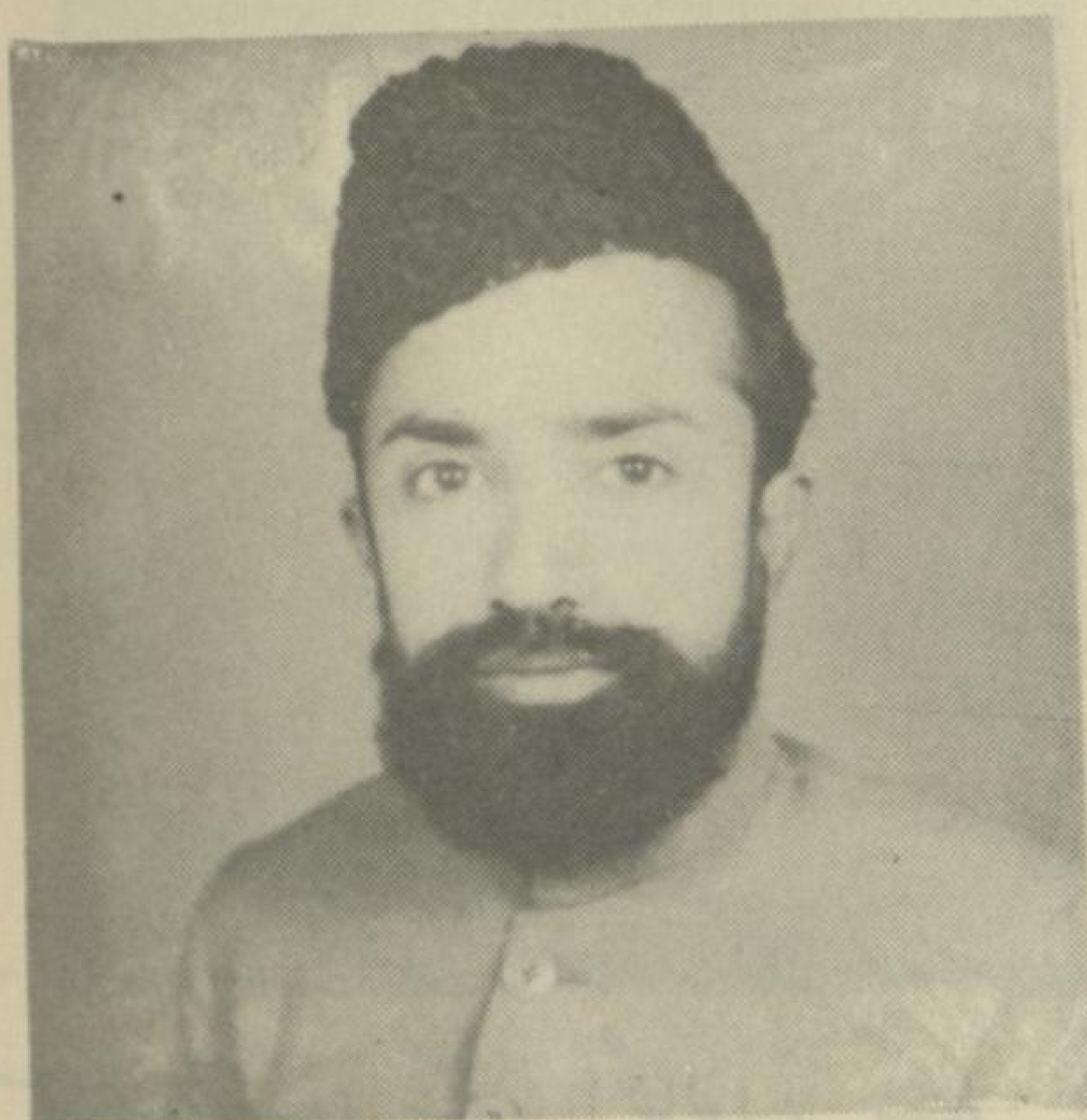
نشاں بھی ملتا نہیں نغمہ زن پرندوں کا
وہ آندھیاں تھیں کہ پیڑوں سے گھونسلے ٹوٹے

اُنہی پہ ناز تھا لیکن فضا نہ روک سکی
کسی کی آنچ سے گرتے ہی آئینے ٹوٹے

بچھڑ کے بھی نہ ہُوا ختم رابطہ دل کا
جدائی سے بھی نہ چاہت کے سلسلے ٹوٹے

میں گامزن بھی نہ ہوتا دُکھوں کے رستے پر
مرے گھروندے مگر میرے سامنے ٹوٹے

اُسے تو خود پہ مگر فخرؔ ہی بلا کا تھا
ڈھلا غرور کا سورج تو واہمے ٹوٹے



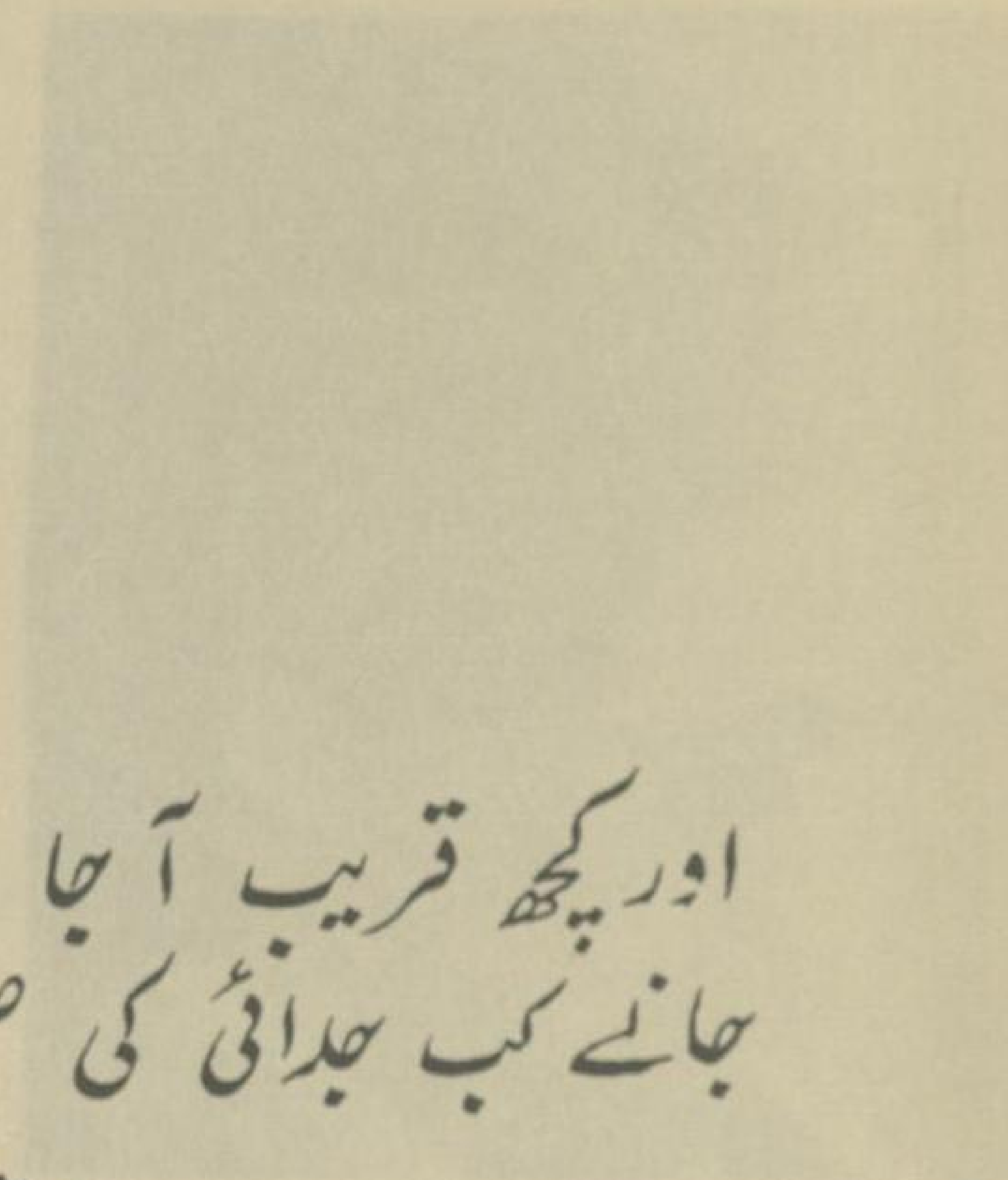
حکیم سرو سہارنپوری

سید محمود احمد نام ، سرو تخلص ۔ آپ ۸ مارچ ۱۹۳۴ء کو سہارنپور (بھارت) میں ایک معروف سادات گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام حکیم سید داؤد بخاری تھا ۔

۱۹۵۰ء میں آپ نے پاک جامع طبیہ لاہور سے طبیبِ کامل کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۵۲ء میں اجمل طبیہ کالج سے طلائی تمغہ حاصل کیا ۔

سرو سہارنپوری کی اس وقت تک دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں "زخمِ دل" جو نعت و منقبت کا مجموعہ ہے ، ۱۹۷۴ء میں منظرِ عام پر آیا ۔ علامہ مشرقی کی فارسی رباعیات کے مجموعہ "خریطہ" کا ترجمہ اردو رباعی میں کیا جو لاہور سے شائع ہوا ۔

علامہ اقبال کے مشہور مجموعہ "پیامِ مشرق" کا منظوم اردو ترجمہ زیرِ طباعت ہے ۔



حکیم ہنرؔو سہارنپوری

اور کچھ قریب آ جا اور کچھ نمایاں ہو!
جانے کب جدائی کی صبح حشر ساماں ہو

دھڑکنوں میں پایا ہے، سانس میں سمایا ہے
لاکھ بے رخی برتے لاکھ تو گریزاں ہو

وارداتِ ہجر آخر کیا کہیں ستاروں سے
حالِ دل سنائیں ہم کاش کوئی انساں ہو

دل کا ٹوٹ جانا کیا اک شکستِ بے آواز
کس لئے کوئی سوچے کیوں کوئی پشیماں ہو

قرب کا تصور بھی ہائے کیا تصوّر ہے
ایسے کھو گئے ہیں ہم جیسے کوئی عرفاں ہو

وادیٔ تمنا میں برف جم گئی، پھر بھی
دل کی ہے وہی حالت جیسے کوئی طوفاں ہو

صبحِ عارض و لب پر شامِ زلف کے سائے
جیسے شب کے ہاتھوں میں روشنی کا داماں ہو

ہنرؔو ہم نے دیکھا ہے جانے اسکو کس چھب میں
آئنہ اگر دیکھے، دیکھ دیکھ حیراں ہو



حمایت علی شاعر

آپ ۲۷ جون ۱۹۳۰ کو اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ سندھ یونیورسٹی سے آپ نے ایم اے کیا۔ آپ نے شاعری کے علاوہ فلمسازی اور ہدایت کاری بھی کی ہے۔ آج کل آپ سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں کام کر رہے ہیں۔

آگ میں پھول، ثلاثی، شکستِ آواز، مہران موج اور مٹی کا قرض، آپ کی تصانیف ہیں۔

حمایت علی شاعر

بہت آسان سہی ، راہ یہ دشوار بھی ہے
پسِ دیوار یہاں سایۂ دیوار بھی ہے

وہ چمکتا ہوا تارا کہ شب آثار بھی ہے
سوچئے تو وہی سورج کا پرستار بھی ہے

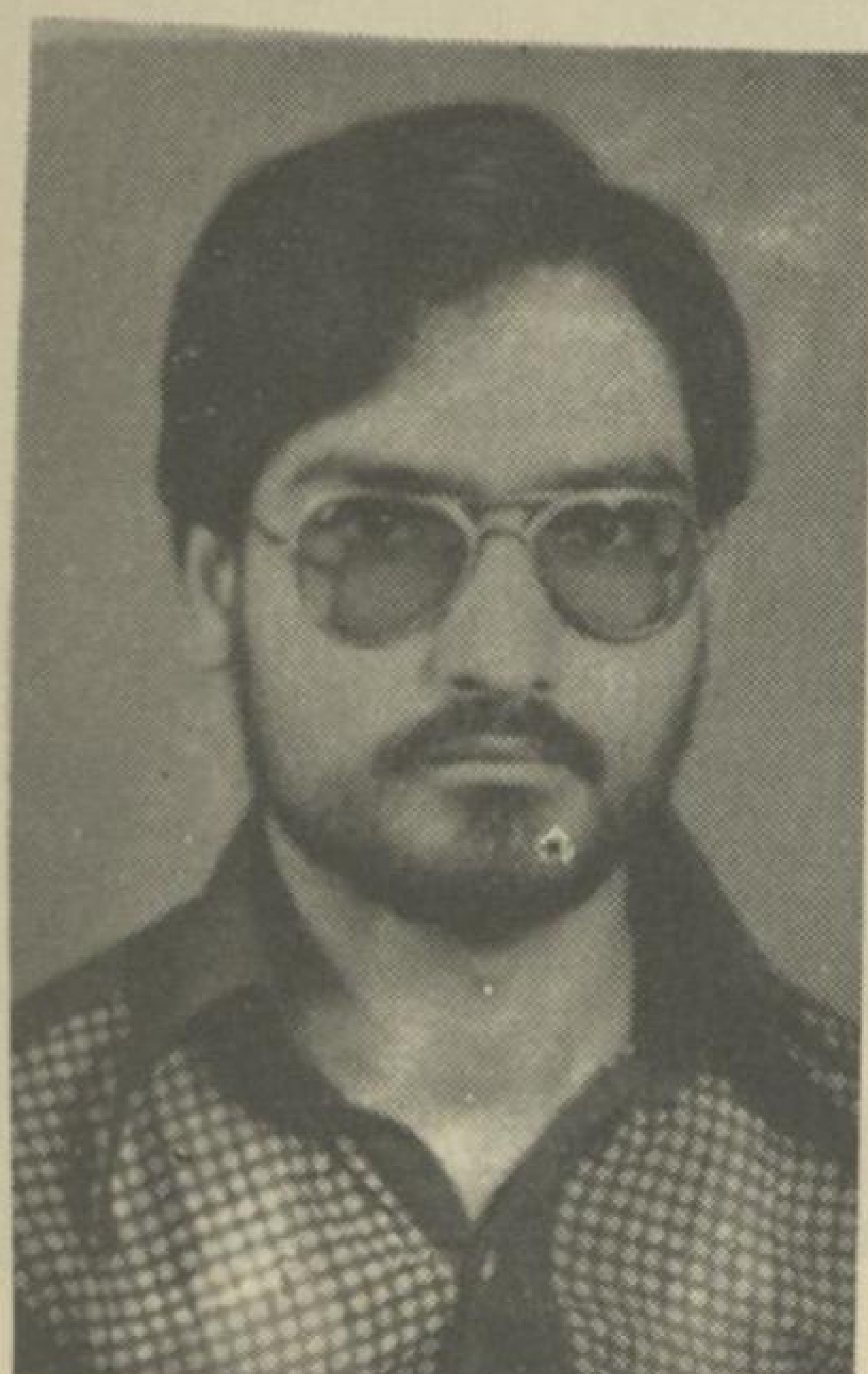
یہ الگ بات کہ میں ہی نہیں یوسف ورنہ
بکنا چاہوں تو یہاں مصر کا بازار بھی ہے

وہ بھلا کیسے سکوں پائے کہ جس کی قسمت
دلِ حسّاس بھی ہے ، دیدۂ بیدار بھی ہے

نقدِ جاں چھیننے والوں کو خبر ہے کہ نہیں
میرے قبضے میں ابھی دولتِ پندار بھی ہے

یہ عجب کیفیتِ دل ہے کہ سب کچھ کہہ کر
اک خلش سی ہے کہ کچھ تشنۂ اظہار بھی ہے

میں تو یوں چپ ہوں کہ آئے نہ ترے ذوق پہ حرف
جو سخن فہم ہے ، غالبؔ کا طرف دار بھی ہے



حیدر قریشی

اصل نام غلام حیدر ارشد ہے، آپ یکم ستمبر ۱۹۵۳ء کو بمقام خان پور پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔

حیدر قریشی اردو کے علاوہ سرائیکی زبان کے بھی شاعر اور ادیب ہیں۔ ادبی مجلّہ "جدید ادب" آپ کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ رحیم یار خان کے شاعروں کی غزلوں کا انتخاب بھی آپ "شفق رنگ" کے نام سے مرتب کر چکے ہیں۔

آپ کا مجموعۂ کلام "ہر اک شخص اجنبی" طباعت کے مرحلہ میں ہے۔

حیدر قریشی

برستے رنگ نگاہوں میں بھر کے لایا ہوں
سلگتے خواب بجھانے بھی خود ہی آیا ہوں

میں بے لباس خیالوں میں اس کو اپناؤں
کوئی تو مجھ کو یہ سمجھائے میں پرایا ہوں

وہ پڑھ سکا کبھی مجھ کو نہ مجھ کو سوچ سکا
میں جس کی روح کا ہر لفظ جھانک آیا ہوں

میں ٹوٹ کر بھی ہوں پہچان وقت کی حیدرؔ
کہ ٹوٹتے ہوئے لمحوں میں آ سمایا ہوں



خاطر غزنوی

اصل نام محمد ابراہیم بیگ، خاطر تخلص - ۱۹۲۵ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔
خاطر نے شاعری، ڈرامہ اور افسانہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ پشاور یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔ جہاں چینی زبان کے استاد کی حیثیت سے تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ آپکی نظم و نثر کی درج ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں :-

پھول اور پتھر (ناولٹ) سرحد کی رومانی کہانیاں، سرحد کے رومان (لوک کہانیاں)، رزم نامہ (رزمیہ نظم) زندگی کے لئے (ڈرامہ) جدید نظمیں (انتخاب) البیرونی (زندگی اور کارنامے)، ننھی منی نظمیں (بچوں کی نظمیں)، خوشحال خان خٹک کا کلام (اردو ترجمہ)۔

خاطر غزنوی

چمک اٹھی ہے جو تحریر ماہ و کوکب کی
شعاعِ مہر نے لکھی ہے داستاں شب کی

عجب ہے قافلۂ دوستاں بہم نہ جدا
کہ ہم سفر ہیں مگر منزلیں جدا سب کی

میں کس کو اپنا کہوں اور کس کو بیگانہ
دھواں دھواں ہے فضا شیشۂ محدّب کی

کسی نے دل میں نہ جھانکا کہ دل کے دکھ سنتا
سبھی نے بات سنی چشم و ابرو و لب کی

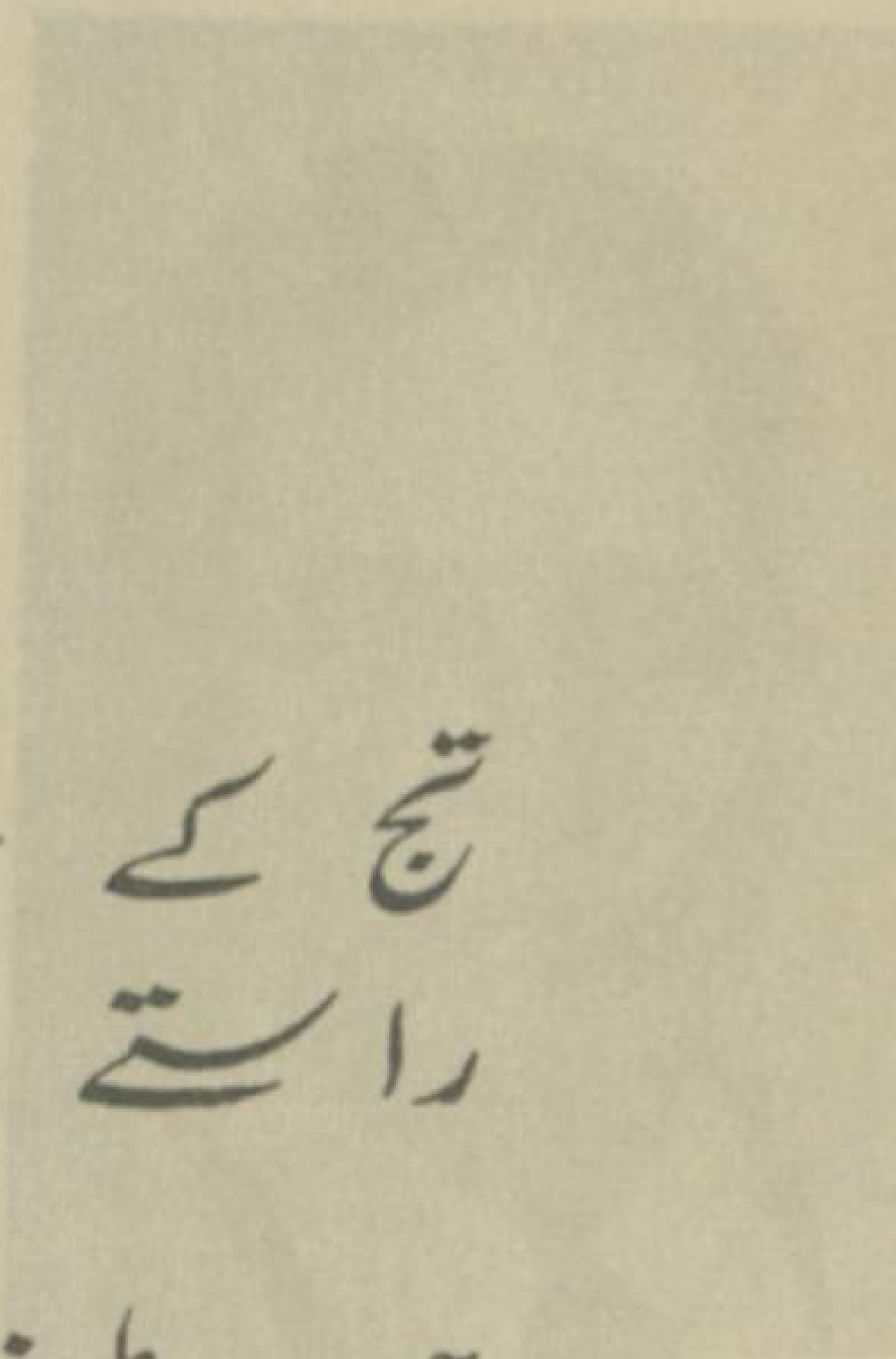
نظر ستاروں پہ لیکن دلوں میں تاریکی
روش زمانے نے اپنائی ہے کچھ اس ڈھب کی

کچھ ان دنوں ہیں بہت مجھ پہ مہرباں وہ بھی
کہ جن کے خوں میں ہے تاثیر نیشِ عقرب کی



خالد احمد

۵ جون ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور سے میٹرک اور ۱۹۶۱ء میں دیال سنگھ کالج لاہور سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔
آپ صحافی، شاعر اور ادیب ہیں۔ کچھ عرصہ روزنامہ "امروز" سے وابستہ رہے اور "لمحہ لمحہ" کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔ ماہنامہ "فنون" سے بھی متعلق ہیں۔ اور آج کل واپڈا میں ملازمت کر رہے ہیں۔
مجموعۂ کلام ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔



خالد احمد

تج کے جب سنگ سہارے نکلے
راستے ساتھ ہمارے نکلے

جس طرف جائیے، مہک چھوڑ آئے
رنگ خوشبو میں تمہارے نکلے

ساتھ چلتے ہیں مگر دوری پر
لوگ دریا کے کنارے نکلے

لہر سے لہر اٹھی، یاد سے یاد
دل کی جھیلوں سے شکارے نکلے

فکر دینے لگی پیغامِ عمل
برف کی سِل سے شرارے نکلے

عزم کی ناؤ سے لگنے کے لئے
موج در موج کنارے نکلے

آنکھ میں نم، نہ کوئی غم، خالد
گھر سے ہم کس کے سہارے نکلے



خاور لدھیانوی

نذیر احمد نام، خاور تخلص۔ ۱۹۲۳ء میں لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کے ایک مغل گھرانے میں آنکھ کھولی۔ والد کا نام رحیم اللہ عرف راہِ مولا ہے۔

ملازمت کا آغاز ۱۹۴۰ء میں میونسپل کمیٹی لدھیانہ سے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی آگئے اور یہاں کچھ مدّت میونسپل کمیٹی میں ملازم رہے، جس کے بعد محکمہ بحالیات سے وابستہ ہوگئے۔

۱۹۶۱ء سے آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد میں بطور سکرپٹ رائٹر کام کر رہے ہیں۔ مجموعۂ کلام ابھی طبع نہیں ہوا ہے۔

خاور لدھیانوی

یہ برف پوش مناظر بھی شعلہ خُو نکلے
یہ کب ہُوا کہ دھرو پاؤں تو لہو نکلے

وہ جب بھی آتے ہیں سورج کے رتھ پہ آتے ہیں
یہ اس لئے کہ کسی کی نہ آرزو نکلے

ہجوم اتنا ہو جس کا نہ ہو شمار کہ جب
میری کتاب کا پرچم بنا کے تُو نکلے

جھپکتے دیکھیں کسی نے نہ منتظر آنکھیں
یہ چاک وہ ہیں جو بیگانۂ رفو نکلے

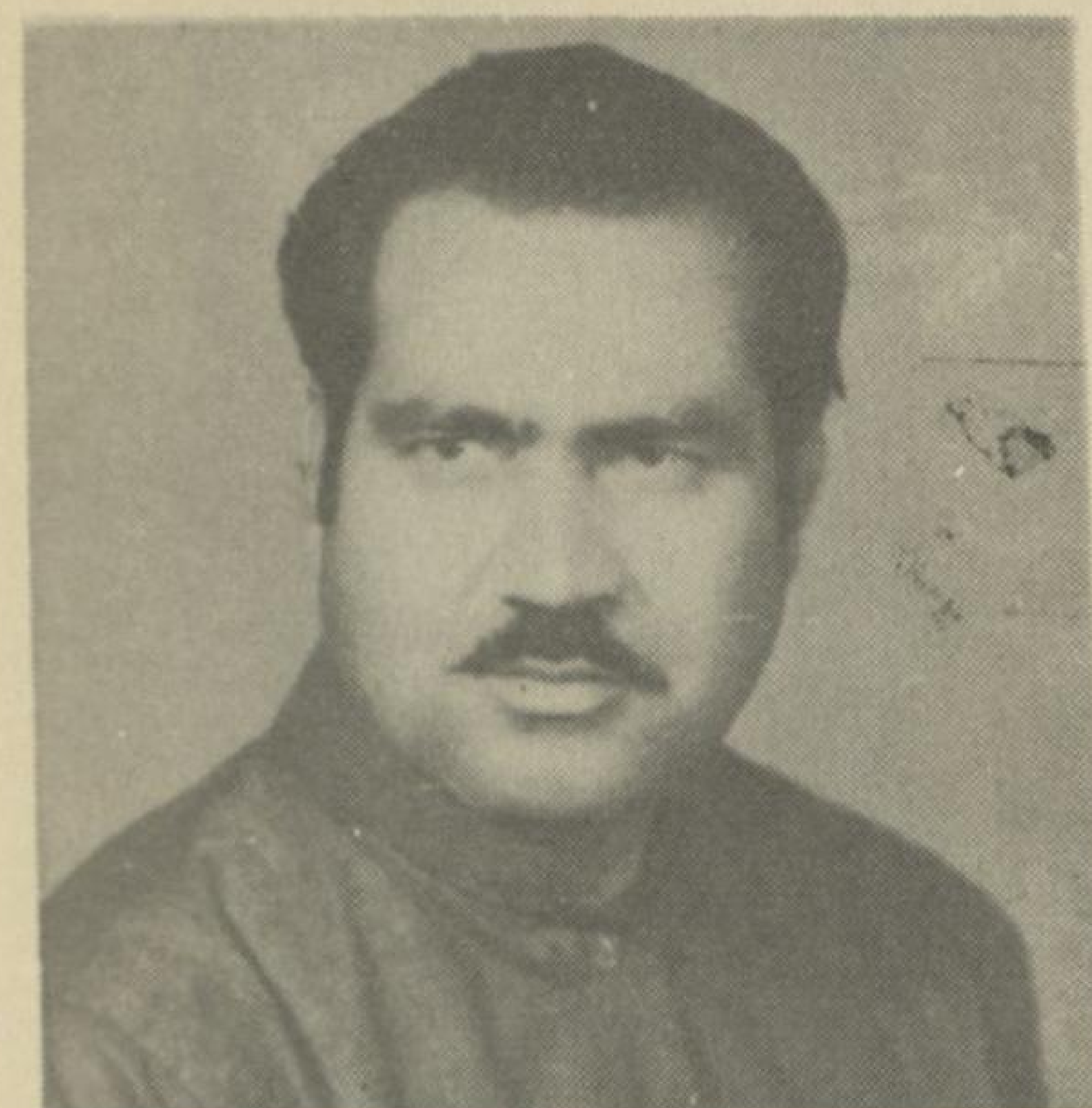
نقاب، تابشِ جلوہ سے آب آب ہُوا
کہ جیسے دھوپ میں کوئی کنارِ جُو نکلے

ہجومِ بادہ کشاں میں بھی ہم نے دیکھا ہے
بہت سے لوگ ہمیشہ ہی باوضو نکلے

ہلاک ہوتا ہے کب کوئی دوسروں کے لئے
کیا جو غور تو ہم اپنے ہی عدُو نکلے

یہ میرے جذبِ نہاں کا ہے معجزہ شاید
کہ دل میں جھانک کے دیکھوں تو تو ہی تُو نکلے

یہ ہے بہار کہ چربہ بہار کا خاورؔ
کہ دُھند اوڑھ کے عشّاق و خوبرو نکلے



خلیل رام پوری

پورا نام خلیل الرحمان خاں ہے۔ ریاست رام پور (بھارت) میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ اسی مناسبت سے رام پوری کہلاتے۔

ملازمت کے سلسلے میں خلیل کا قیام مختلف شہروں میں رہا۔ آج کل سی، ٹی، ڈی، ایم بھکر ضلع میانوالی میں ملازم ہیں۔

خلیل جدید اردو غزل کہتے ہیں آپکا کلام برصغیر کے مختلف رسائل میں چھپتا رہتا ہے۔ مجموعۂ کلام "چراغ پانی میں" ابھی شائع نہیں ہوا۔

خلیل رام پوری

ہر کوئی سر اُٹھا کے چلتا تھا
گھر کی لسّی تھی گھر کا آٹا تھا

جانے کس بات پر خفا تھا وہ
آپ جلتا تھا آپ بُجھتا تھا

اُس کے اندر سے بولتا تھا کوئی
جب کبھی مُوڈ میں وہ ہوتا تھا

شاخ سے آم جس طرح ٹپکے
اس طرح مجھ پہ جان دیتا تھا

اوڑھ لی شال کیوں خموشی کی
وہ تو اک گفتگو کا دھارا تھا

رات سارا مکان ڈول گیا
کیا ہوائی جہاز گذرا تھا

کھو گیا تھا وہ گہری سوچوں میں
دھوپ کے گھر میں کل اندھیرا تھا

چھوڑ دیتے تھے راستہ دریا
آدمی کا چراغ جلتا تھا

ٹھنڈ تھی ریت کے مکانوں میں
ساربانوں میں پیار ملتا تھا

پھُول کھلتے تھے ریگ زاروں میں
ذکر مسجد میں اس کا ہوتا تھا
کوئی سبزے کی لہر تھی شاید
جس نے آرام سے سُلایا تھا

اب وہاں اُونٹ بلبلاتے ہیں
پہلے مُرغابیوں کا ڈیرہ تھا
پیڑ اُگتے تھے اپنی مرضی سے
کوئی تحصیل تھی نہ تھانہ تھا

شہر والے تو پھینک آئے تھے
اُس کو دریا اٹھائے پھرتا تھا
رنگ کروا دیا تھا شیشوں پر
روز سورج جو جھانکا کرتا تھا

ٹیلی وِیژن نوازتا ہے اب
پہلے اخبار پر گذارا تھا
جب پلٹتا تھا اس کے گھر سے خلیلؔ
ایک سایہ سا ساتھ ہوتا تھا

جدید غزل میں رات، اندھیرا، سناٹا، دھوپ، دریچہ، دستک، دھند ۔ سایہ،
پرچھائیں، بادباں، پتھر، ریت وغیرہ بہت سے الفاظ اور علامتیں نئی معنویت کیساتھ
استعمال ہو رہی ہیں۔

(ڈاکٹر شمس الدین صدیقی)



خلیل صدیقی

خلیل صدیقی ۱۹۲۰ء میں بمقام جبل پور (بھارت) پیدا ہوئے۔ ناگپور یونیورسٹی سے اردو اور پھر فارسی میں ایم، اے کیا۔ ۱۹۴۱ء سے تدریس سے وابستہ ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں بلوچستان کے محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ان دنوں چیئرمین بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری۔ ایجوکیشن۔ کوئٹہ ہیں۔

۱۹۴۰ء سے نظم گوئی سے شاعری کا آغاز کیا، لسانیات آپ کا خاص موضوع ہے۔ اس سلسلہ میں "زبان کا مطالعہ"۔ "زبان کا ارتقاء" اور "لسانی مباحث" آپ کی تصانیف ہیں۔

خلیل صدیقی

کون بتائے کیا ہے حقیقت اور بنا افسانہ کیا
دل کی بستی کیا بستی ہے بسنا کیا لٹ جانا کیا
برسوں نے جو رشتے جوڑے، پل بھر نے وہ توڑ دیئے
پیارے! اب ٹوٹے ٹکڑوں سے اپنا جی بہلانا کیا
آج تو جوں توں کٹ جائے گا، کل کی سوچو کیا ہوگا
جو گزری سو گزر چکی اترانا کیا، پچھتانا کیا
کیسا طوفاں کیسی بلائیں یارو! یہ بھی سوچو تو
سیکھا ہے مر مر کے جینا، جیتے جی مر جانا کیا
جانے کتنے ڈوبنے والے ساحل پر بھی ڈوب گئے
پیارے! طوفانوں میں رہ کر اتنا بھی گھبرانا کیا
تنہا تنہا جی کے دیکھا، ساتھ بھی جی کے دیکھ لیا
ہم نے کیا سمجھا ہے جینا اوروں کو سمجھانا کیا
سود و زیاں کی باتیں چھوڑو، اور ہی باتیں چھیڑو بھی
عشق کے ہاتھوں کیا کھویا ہے، کیا پایا دُہرانا کیا
اپنی رام کہانی میں بھی جگ بیتی کا جادو تھا
پلکیں جھکی جاتی ہیں اب ختم ہوا افسانہ کیا



خواجہ حمید الدین شاہد

آپ کا پورا نام خواجہ حمید الدین ہے اور شاہدؔ تخلص کرتے ہیں۔ گزشتہ کئی برسوں سے ادبی ماہنامہ "سب رس" کراچی کی ادارت کر رہے ہیں۔ جس کے کئی خاص نمبر نکل چکے ہیں۔ شاعری کے علاوہ تنقید اور تحقیق کے میدانوں میں بھی آپ نے کام کیا ہے۔

آپ کی تصانیف یہ ہیں۔ ارمغانِ امجد۔ یادگارِ صفی۔ مثنوی تصویرِ جاناں۔ اردو میں سائنسی ادب۔ حیدرآباد کے شاعر۔ ادبی مطالعے اور "نقوشِ ادب" وغیرہ۔ ادبی اور تنقیدی مضامین کا ایک تازہ مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہدؔ

تیری یہ بے رُخی کسی کے لئے
مستقل غم ہے زندگی کے لئے

کیا محبت اِسی کو کہتے ہیں
دوستی کی تھی دشمنی کے لئے

تیری الفت میں سب گوارا ہے
جان دے دی، تری خوشی کے لئے

شیشۂ دل کے توڑنے والے
دل لگایا تھا کیا اِسی کے لئے

وائے قسمت خبر نہ لی جس نے
دل تڑپتا رہا، اُسی کے لئے

آدمی کا ہے آدمی دشمن
کیا قیامت ہے آدمی کے لئے

آدمیّت کہاں گئی یارو
ہم ترستے ہیں آدمی کے لئے

ظلمتِ شب سے چاند نکلے گا
یہ اندھیرا ہے روشنی کے لئے

حُسن والوں کی ہر ادا شاہدؔ
اک معمّہ ہے زندگی کے لئے

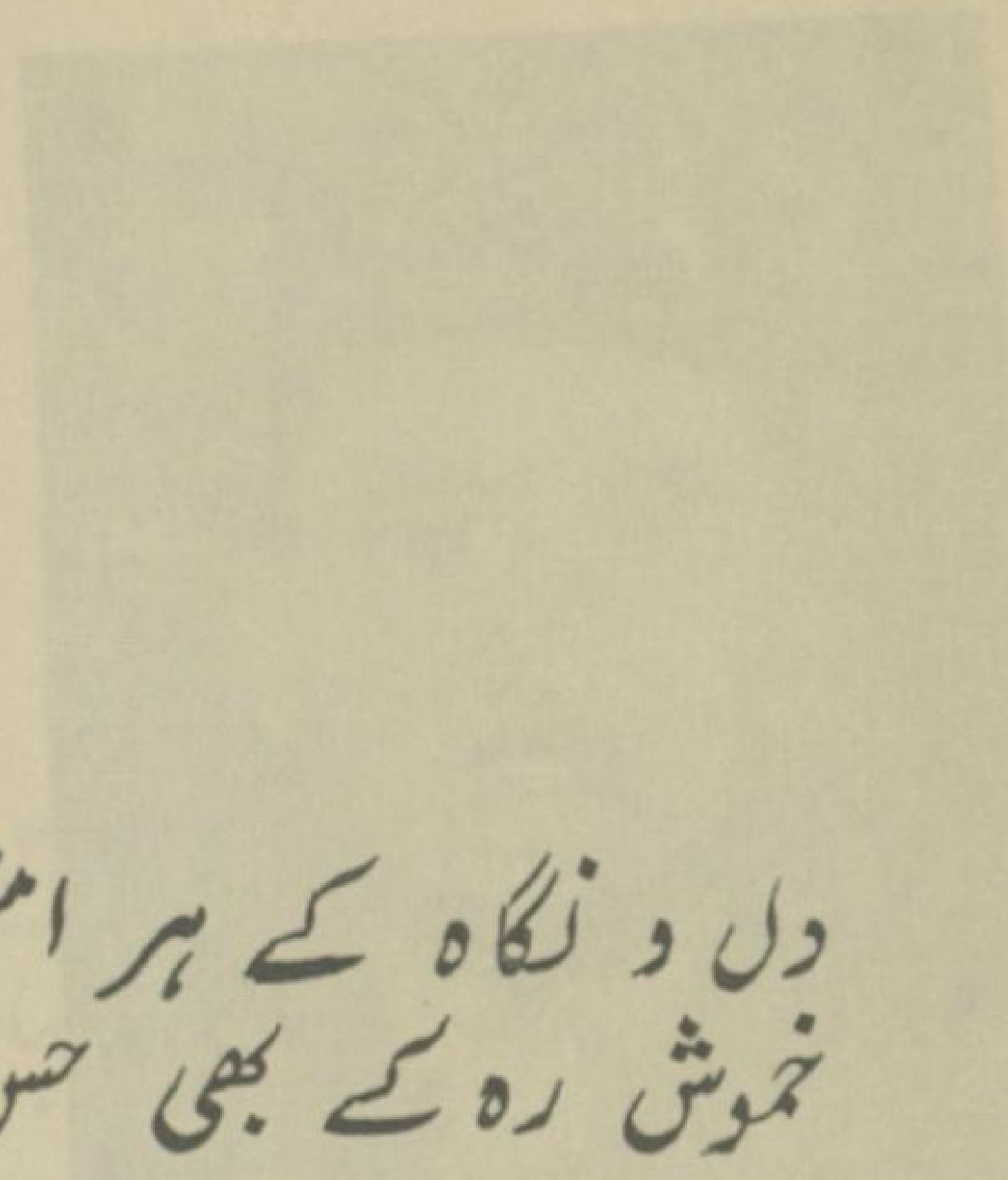


رابعہ نہاں

پیدائش بمقام آگرہ (بھارت)۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے اہل خاندان کے ہمراہ ہجرت کی اور جب سے راولپنڈی میں مستقل قیام ہے۔ بیانؔ میرٹھی جو فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے، رابعہؔ کے تایا تھے، انکے تخلص کی مناسبت سے آپ نے نہاںؔ تخلص اختیار کیا اور اب اسی نام سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔

گھر کے ادبی اور شاعرانہ ماحول نے رابعہ نہاںؔ کے فطری جوہر کو ابھارا۔ پہلا شعر انہوں نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں کہا۔

غزلوں کا ایک مجموعہ "برگِ سخن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نظموں اور نعتوں پر مشتمل ایک اور شعری مجموعہ اشاعت کے مراحل میں ہے۔ تیسرا شعری مجموعہ جو غزلوں پر مشتمل ہوگا، زیرِ ترتیب ہے۔



رابعہ نہاں

دل و نگاہ کے ہر امتحاں سے گذرے ہیں
خموش رہ کے بھی حسنِ بیاں سے گذرے ہیں

حقیقتوں کو نہیں جانتے کہ وہ کیا ہیں
مگر وہ لوگ کہ وہم و گماں سے گذرے ہیں

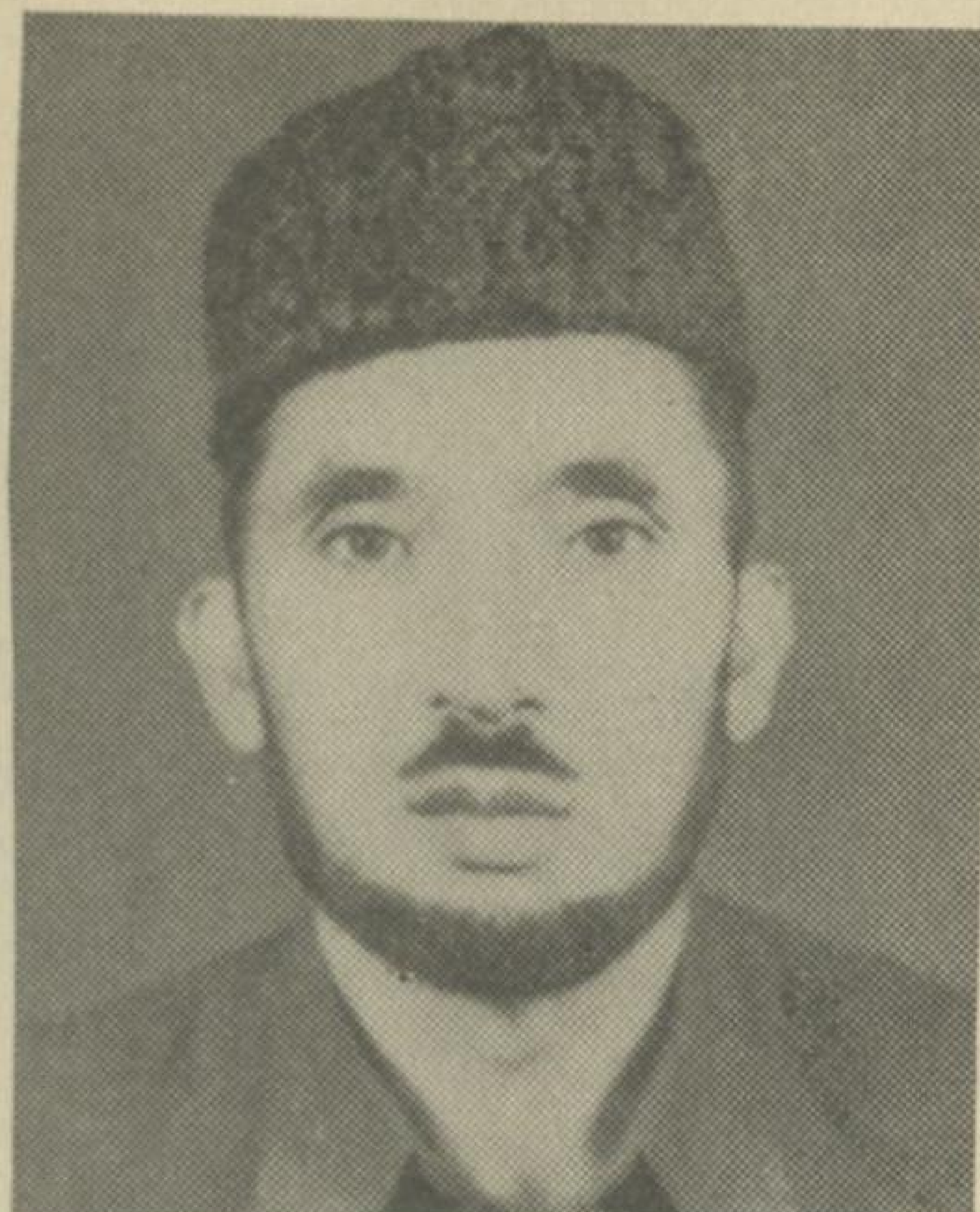
نہ زندگی کی تمنّا، نہ موت کا کھٹکا،
رہِ وفا میں غمِ این و آں سے گذرے ہیں

کسی کے جلوہ کی رنگینوں میں گم ہو کر
وفورِ شوق میں سُود و زیاں سے گذرے ہیں

بھرے ہیں انجم و مہتاب میرے دامن میں
حریمِ حسن و رہِ کہکشاں سے گذرے ہیں

اُداس دل کی طرح موسموں کی بے چینی
فضا میں بکھری ہوئی تھی جہاں سے گذرے ہیں

نصیب میں ہیں نشیب و فرازِ جادۂ غم
وہ ہم کہ لذتِ دردِ نہاں سے گذرے ہیں



راجی الرحمت نظرؔ

راجی الرحمت نام، نظرؔ تخلص۔ آپ ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ضلع دیامیر (شمالی علاقہ جات) کے ایک گاؤں گوہر آباد میں پیدا ہوئے۔ راجی الرحمت کا تعلق اس علاقے کے ایک معروف علمی خاندان سے ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے چچازاد بھائی مولوی عبدالغفار سے حاصل کی جس کے بعد مڈل سکول گلگت میں داخل ہوئے، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد علومِ عربیہ کا شوق آپ کو مدرسہ قائم العلوم امروہہ اور مدرسہ امینیہ دہلی لے گیا۔ جہاں سے آپ نے سندِ فراغت حاصل کی۔ راجی الرحمت نے الہ آباد یونیورسٹی سے آنرز عربی اور پنجاب یونیورسٹی سے آنرز فارسی کے امتحانات بھی پاس کئے۔

۱۹۴۲ء میں آپ اپنے گاؤں واپس آئے اور یہاں ایک مسجد میں درس و تدریس کا کام شروع کیا۔ ۱۹۴۴ء میں آپ مڈل سکول گلگت میں مدرس ہو گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۳ء تک قائم رہا۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۰ء تک آپ گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن سے بطور انسٹرکٹر وابستہ رہے۔ ان دنوں ریٹائرڈ زندگی گذار رہے ہیں۔

شعر و شاعری سے شغف ابتدا ہی سے تھا۔ پہلے اپنی مادری زبان شیناؔ میں شعر کہتے تھے، بعد میں اردو کی طرف آئے۔

ایک کتاب "شہنشاہِ کونین" کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔

راجی الرحمت نظر

گلُہائے دہر اپنی بہاریں دکھا گئے
"وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے"

یہ کیا غضب ہوا بھری محفل میں آج پھر
دانتوں میں ہونٹ داب، وہ آنکھیں دکھا گئے

اعجاز ہائے حُسنِ پریشاں نہ پوچھیے
آنکھوں کی راہ سے وہ جگر میں سما گئے

بے نور بزم دل تھی تو بے کیف زندگی
اُن کا کرم ہے محفلِ دل کو سجا گئے

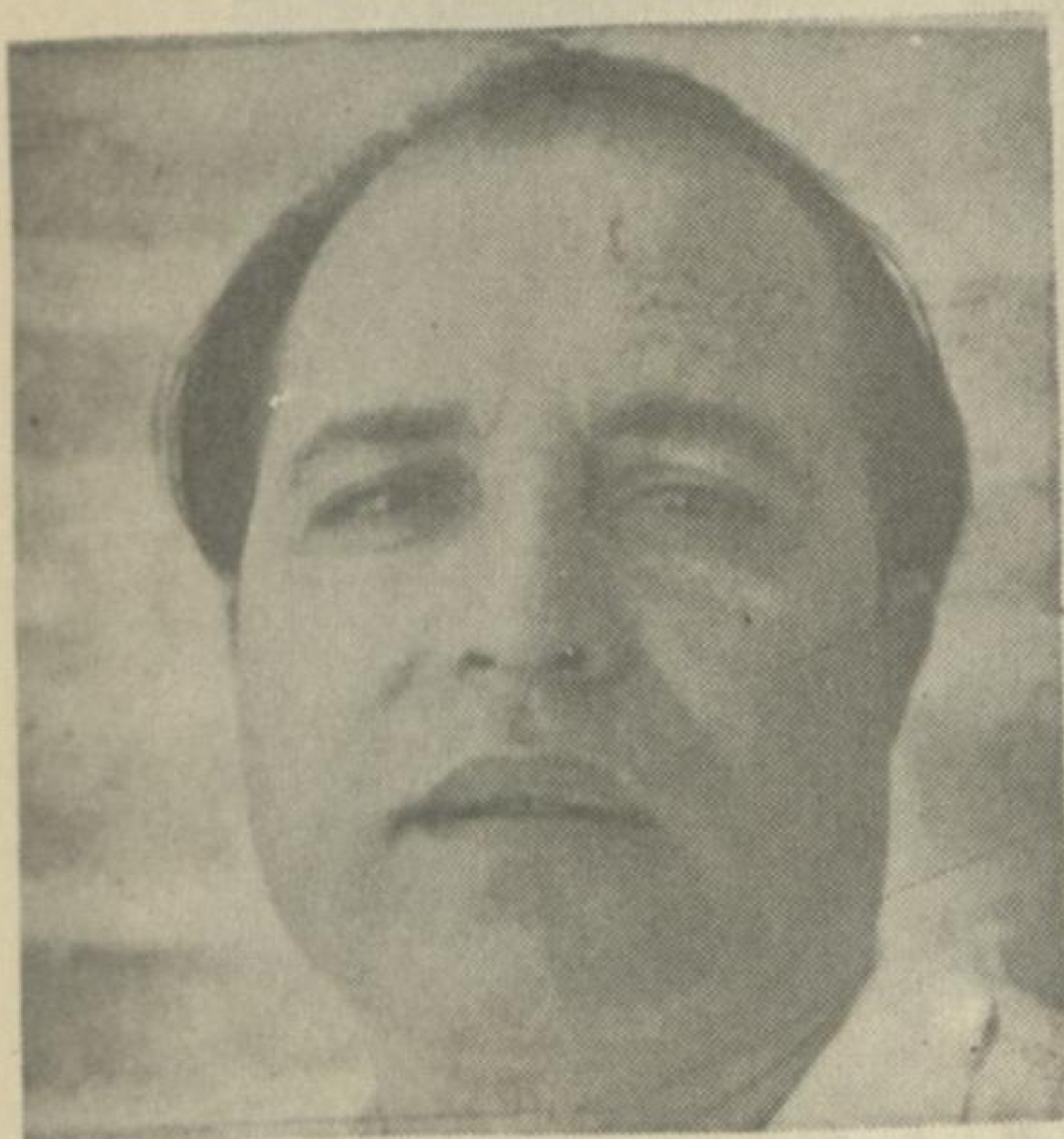
گو جیتتے رہے ہمیں ہر بازیٔ حیات
پر عشق کی بساط میں بس مات کھا گئے

شب بھر اُداس ہی تھی کلی صبح کھل اٹھی
جھونکے سحر کے جانے اُسے کیا سُنا گئے

کتمانِ راز، شوخیٔ تحریر دیکھیے
دلِ بر کے نام کی جگہ نقطے لگا گئے

گھُل مل کے پھر رہے تھے رقیبوں کے ساتھ وہ
دیکھا مجھے تو ہاتھ سے چہرہ چھپا گئے

اُن کی ادا کو دیکھ کے مر مٹ گیا نظرؔ
اوروں کو خُم سے مجھ کو نظر سے پلا گئے



راز مراد آبادی

نام ساجد علی خاں اور رازؔ تخلص۔ ۱۹۱۶ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا آغاز ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ ہوا۔ اسی زمانے میں جگر مراد آبادی کے شاگرد ہوئے جس پر انہیں بجا طور پر فخر ہے۔

۱۹۴۰ء میں علی گڑھ سے اردو میں ایم اے کیا۔ پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا اور پھر ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔

قیام پاکستان سے کچھ قبل ڈھاکہ آ گئے تھے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بارہ بجکر ایک منٹ پر سب سے پہلا نشریہ: "یہ ریڈیو پاکستان ڈھاکہ ہے" آپ ہی کی آواز میں تھا۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۵ء تک، رازؔ بی بی سی کی پاکستان سروس سے متعلق رہے۔ پھر پاکستان واپس آ کر وزارت کشمیر کے محکمۂ اطلاعات میں رسالہ "آزاد کشمیر" کے مدیر اور انفارمیشن آفیسر رہے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۵ء تک پاکستان آرڈیننس فیکٹریز کے شعبۂ نشر و اشاعت کے سربراہ رہے۔ جہاں سے سبکدوش ہو کر اب کراچی میں مقیم ہیں۔

رازؔ مراد آبادی کا مجموعۂ کلام "حرفِ راز" کے نام سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ریڈیو کے لئے قائد اعظم کے بارے میں محفوظ شدہ انٹرویو اور تقاریر سے ایک کتاب مرتب کی ہے جو زیرِ اشاعت ہے۔

راز مراد آبادی

بھری بہار میں دامن دریدہ ہیں ہم لوگ
ہمیں تھا زعم، بہار آفریدہ ہیں ہم لوگ

یہ اور بات کہ دامن دریدہ ہیں ہم لوگ
بہ فیضِ عشق مگر سرکشیدہ ہیں ہم لوگ

ہم آئنہ ہیں مگر عکسِ ذات سے محروم
تری صدا ہیں مگر ناشنیدہ ہیں ہم لوگ

یہ بے رخی۔ یہ تجاہل۔ یہ رنجِ مہجوری
ادھر بھی ایک نظر آبدیدہ ہیں ہم لوگ

جہاں جہاں بھی گئے ہیں مہک اٹھی ہے فضا
ترے فراق کی بوئے رسیدہ ہیں ہم لوگ

کڑی ہے دھوپ، شجر ہے نہ سایۂ دیوار
بچھڑ کے اُس سے سکوں ناچشیدہ ہیں ہم لوگ

یہ کس نے آئنہ سازی کا فن کیا ایجاد
یہ آئنے ہیں کہ چہرہ بریدہ ہیں ہم لوگ



راغب شکیب

۱۶ جون ۱۹۵۰ء کو خانقاہ ڈوگراں ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ ڈیرہ غازی خاں اور خانقاہ ڈوگراں میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۴ء میں ڈیرہ غازی خاں میں محکمہ روڈ کنسٹرکشن سے ملازمت کا آغاز کیا لیکن پھر اسے چھوڑ کر ۱۹۷۵ء میں سرگودھا آ گئے۔ اور تب سے یہیں پر تعلیم و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔

۱۹۷۱ء میں شاعری کا آغاز کیا۔ سرگودھا کی ادبی فضا، شعر و ادب خصوصاً ادبی تنقید کے لئے بڑی سازگار ثابت ہوئی۔ یہاں آ کر غزل کے ساتھ ساتھ، ادبی تنقید کی طرف بھی توجہ کی چنانچہ اب شعر و تنقید دونوں لکھتے ہیں لیکن شاعری بالخصوص غزل انکو زیادہ پسند ہے۔ شاعری میں جدّت کے قائل ہیں مگر روایت سے گہری وابستگی کو نشانِ راہ سمجھتے ہیں۔ اب تک کوئی نثری تصنیف یا شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔

راغب شکیب

حریم دل میں اترتی ہیں آیتیں اُس کی
لہو بھی کرنے لگا ہے تلاوتیں اُس کی

قریب تھا تو رگِ جاں سے بھی قریب رہا
بچھڑ کے، تا بہ فلک ہیں مسافتیں اُس کی

ہوئی ہے شاخِ دل و جاں پہ خواہشوں کی نمو
لہو کے پھول کھلائیں گی قربتیں اُس کی

اسی امید پہ خوابوں کی فصل بوئی ہے
کہ کِشتِ دل میں اگیں گی بشارتیں اُس کی

خیال، رنگ، ہوا، چاندنی، شفق، خوشبو
ہزار رنگ میں دیکھوں میں صورتیں اُس کی

نمو پذیر ہوں، مجھ کو نہ چھوڑ اے دھرتی
مری جڑوں کو ابھی ہیں ضرورتیں اُس کی

لہو تو جم گیا آنکھوں کی پتلیوں میں شکیبؔ
دکھائیں عکس بھلا کیا بصارتیں اُس کی



راغبؔ مراد آبادی

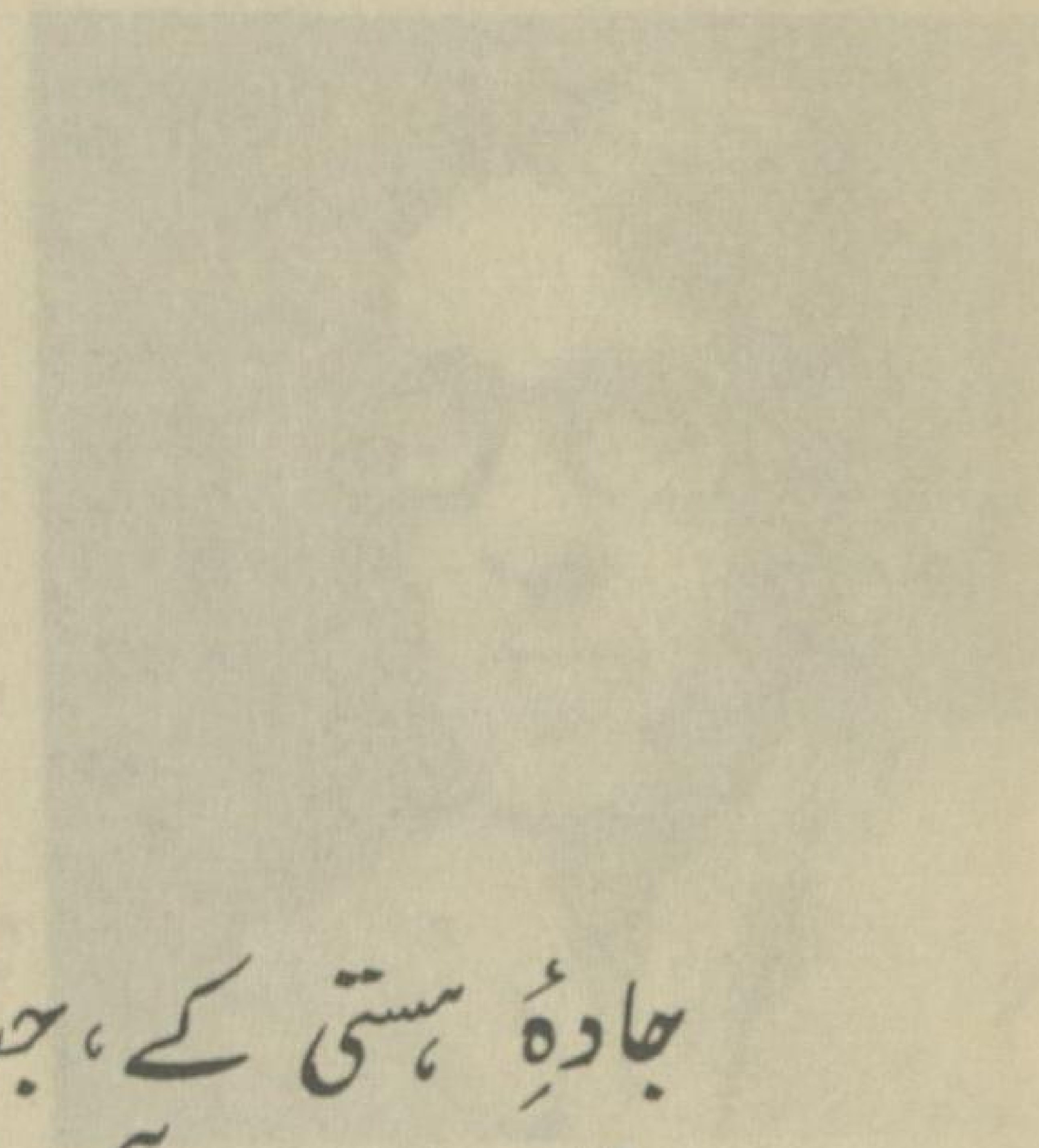
سیّد اصغر حسین نام، راغبؔ تخلص۔ آپ کی تاریخ ولادت ۲۷ مارچ ۱۹۱۸ء ہے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ آپ نے السنۂ شرقیہ کے کئی امتحان پاس کئے۔ طبیہؔ کالج سے طب کی سند بھی حاصل کی مگر سرکاری ملازمت ہی کو ذریعۂ معاش بنایا۔ حال ہی میں آپ سندھ گورنمنٹ کے لیبر ڈپارٹمنٹ سے بحیثیت افسرِ تعلقاتِ عامہ سبکدوش ہوئے ہیں۔

راغبؔ مراد آبادی نے شعر گوئی کا آغاز ۱۹۳۲ء سے کیا، جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، آپ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی نظم و نثر لکھتے رہے ہیں۔ رباعی آپ کی سب سے زیادہ پسندیدہ صنفِ سخن ہے۔

۱۹۴۳ء میں "ساغرِ صد رنگ" کے نام سے آپ کی غزلوں کے سو منتخب اشعار دہلی سے شائع ہوئے۔ قومی اور ملّی منظومات کا ایک مختصر مجموعہ "عزم و ایثار" کے عنوان سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ ہمارا کشمیر، نذرِ شہدائے کربلا، تحریک، ترغیب، مدحتِ خیر البشر آپ کی دوسری مطبوعہ تصانیف ہیں۔

آپ کی زیرِ اشاعت تصانیف کے نام یہ ہیں :۔

"مدحِ رسول" (نعتیہ رباعیات صنعتِ غیر منقوطہ میں) "ہفت آسماں" (فکری رباعیات) "رگِ گفتار" (غزلیات) "حرف بحرف" (حضرت جوشؔ کے بارے میں نثری کتاب) "تاریخِ ہائے رفتگاں" وغیرہ۔



راغب مراد آبادی

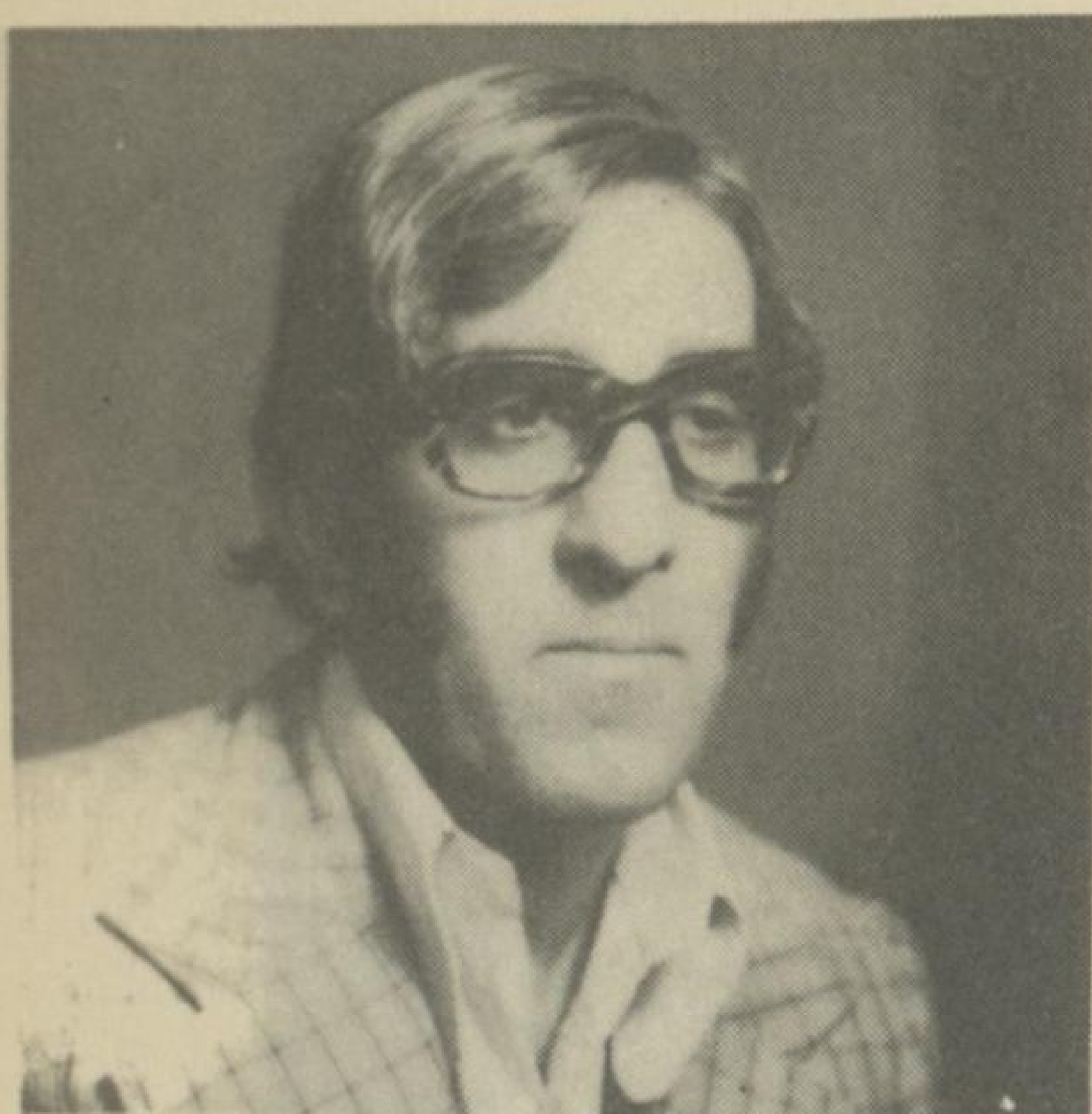
جادۂ ہستی کے، جب بھی، پیچ وخم یاد آئے ہیں
بندہ پرور، آپ کے لطف وکرم یاد آئے ہیں

ہو رہا ہے خیر سے دَار و رسن کا اہتمام
بعد اک مدّت کے شاید اُن کو ہم یاد آئے ہیں

تجربوں کا عکس ہے، آئینۂ احساس میں
شادمانی کی تمنّا کی، تو غم یاد آئے ہیں

بارہا، مجبوریوں کی زد میں آیا عشق بھی
ایک دَور ایسا بھی گزرا ہے وُہ کم یاد آئے ہیں

جب کوئی چنگیز اُٹھا ہے بن کے طوفانِ ستم
خستگانِ جوَر کو، اہلِ قلم یاد آئے ہیں



رب نواز مائل

رب نواز نام، مائل تخلص۔ والد کا نام حکیم بہادر نواز ہے۔ آپ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے۔

ابتداً آپ نے اردو فاضل اور عالم کے امتحانات پاس کئے۔ اس کے بعد اردو میں ایم اے کیا۔ ایم اے کرکے آپ نے محکمۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کی۔ ان دنوں گورنمنٹ انٹر کالج ڈکی میں پرنسپل کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

رب نواز مائلؔ اردو کے علاوہ پشتو کے بھی صاحبِ طرز ادیب اور شاعر ہیں۔ مجموعۂ کلام ابھی شائع نہیں ہوا۔

رب نواز مائلؔ

مناظر میں نیا اِک حسن عیاں ہوتا
فسردہ پا سے لمحوں کا بیاں ہوتا

مگر ہوتے نہ جو اِک یاد کے جگنو
اثاثہ ہستِ شب کا کیا یہاں ہوتا

لہو ٹھہرے متاعِ ہستِ صد اطوار
لہو سے یوں بھی روشن تر جہاں ہوتا

کِسے بتلائیں ایسی تازہ سی خواہش
تسلسل سے، دکھوں ہی کا سماں ہوتا

اِدھر اُکتاہٹیں ہیں، نو بہ نو مائل
ہمیں جینے کو تاروں کا جہاں ہوتا



ربیعہ فخری

ربیعہ فخری حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ دہلی آپ کا وطن تھا۔ ابتدائی تعلیم دہلی اور اعلیٰ تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ آپ کے والد علامہ فخری کو مولانا حالی۔ جوش ملیح آبادی اور مولانا عبدالحق کی صحبت میسّر تھی۔ اسی باعث آپ کو ادبی ذوق ورثے میں ملا۔ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند مصنفین کی محفلوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیں۔ آٹھ برس تک حلقہ ارباب ذوق کی سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ اردو ادب کی خدمت کے صلے میں آپ کو انجمن ترقی اردو کی طرف سے "پرچم اردو" بھی عطا ہوا۔ آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

بارشِ سنگ ۔ تخلیقات ۔ ہم سخن فہم ہیں

"شہرِ جنوں" کے نام سے شعری مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔

ربیعہ فخری

جو گرا لالہ و گل بن کے ہویدا ہوگا
آج مصلوب جو ہوگا وہ مسیحا ہوگا

شور ایسا تھا کہ آوازِ اذاں ڈوب گئی
آبگینہ کہیں احساس کا چٹخا ہوگا

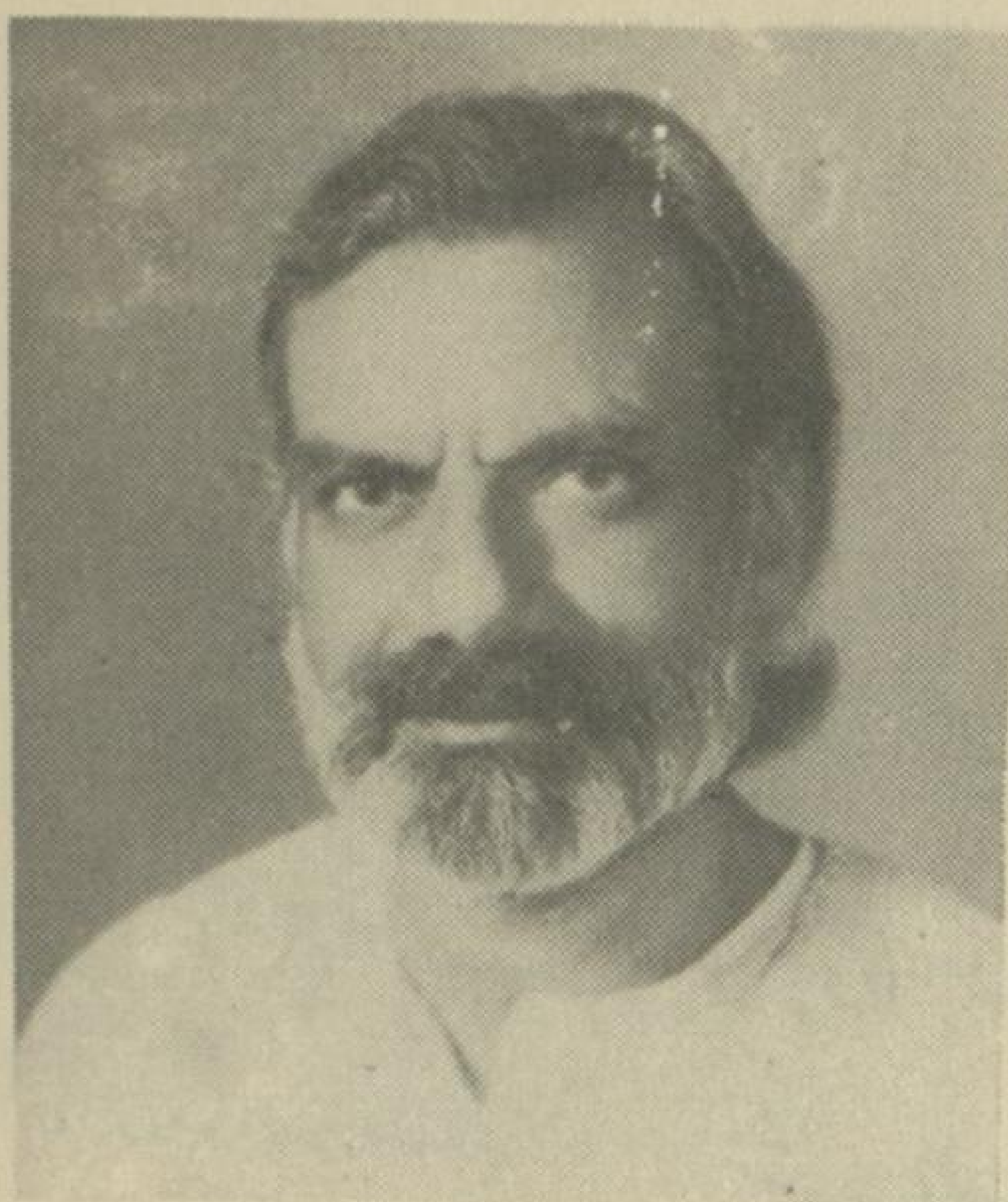
آنکھ بنجر سہی دل بھی سہی پتھر لیکن
ان چٹانوں میں کہیں کوئی تو رستہ ہوگا

بپھری موجوں کو تو ہوتی نہیں تفریق کی خُو
ناؤ ڈوبی ہے تو ملّاح بھی ڈوبا ہوگا

رنگِ گل رنگِ خزاں سرخئ مے جوشِ جنوں
زندگانی نے کوئی روپ تو دھارا ہوگا

تجربہ میرا الگ سوچ میری سب سے جُدا
بات اپنی ہے تو انداز بھی اپنا ہوگا

میں ہوں تنہا کہ انا پاؤں کی زنجیر بنی
تو بھی احساس کے جنگل میں اکیلا ہوگا



رسا چغتائی

آپ کا اصل نام مرزا محتشم علی بیگ ہے اور والد کا نام مرزا محمود علی بیگ۔ رسا چغتائی کے نام سے گزشتہ پینتیس ۳۵ برس سے شعر کہہ رہے ہیں۔ رسا چغتائی کی پیدائش ۱۹۲۸ء کے لگ بھگ بھارت کی ریاست جے پور میں بمقام سوائی مادھو پور ہوئی۔ رسا چغتائی ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور اس وقت سے کراچی میں مقیم ہیں۔

آپ کا شعری مجموعہ "ریختہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

رسا چغتائی

رشتۂ جسم و جاں بھی ہوتا ہے
ٹوٹنے کا گماں بھی ہوتا ہے

اس توہم کے کارخانے میں
کارِ شیشہ گراں بھی ہوتا ہے

ہم سے عزلت نشیں بھی ہوتے ہیں
عرصۂ لامکاں بھی ہوتا ہے

ہم بھی ہوتے ہیں اس کی محفل میں
رقصِ سیّارگاں بھی ہوتا ہے

بادِ صحرائے جاں بھی ہوتی ہے
نغمۂ سارباں بھی ہوتا ہے

جوئے آبِ رواں بھی ہوتی ہے
عکسِ سروِ رواں بھی ہوتا ہے

پھول کھلتے بھی ہیں سرِ مژگاں
چاندنی کا سماں بھی ہوتا ہے

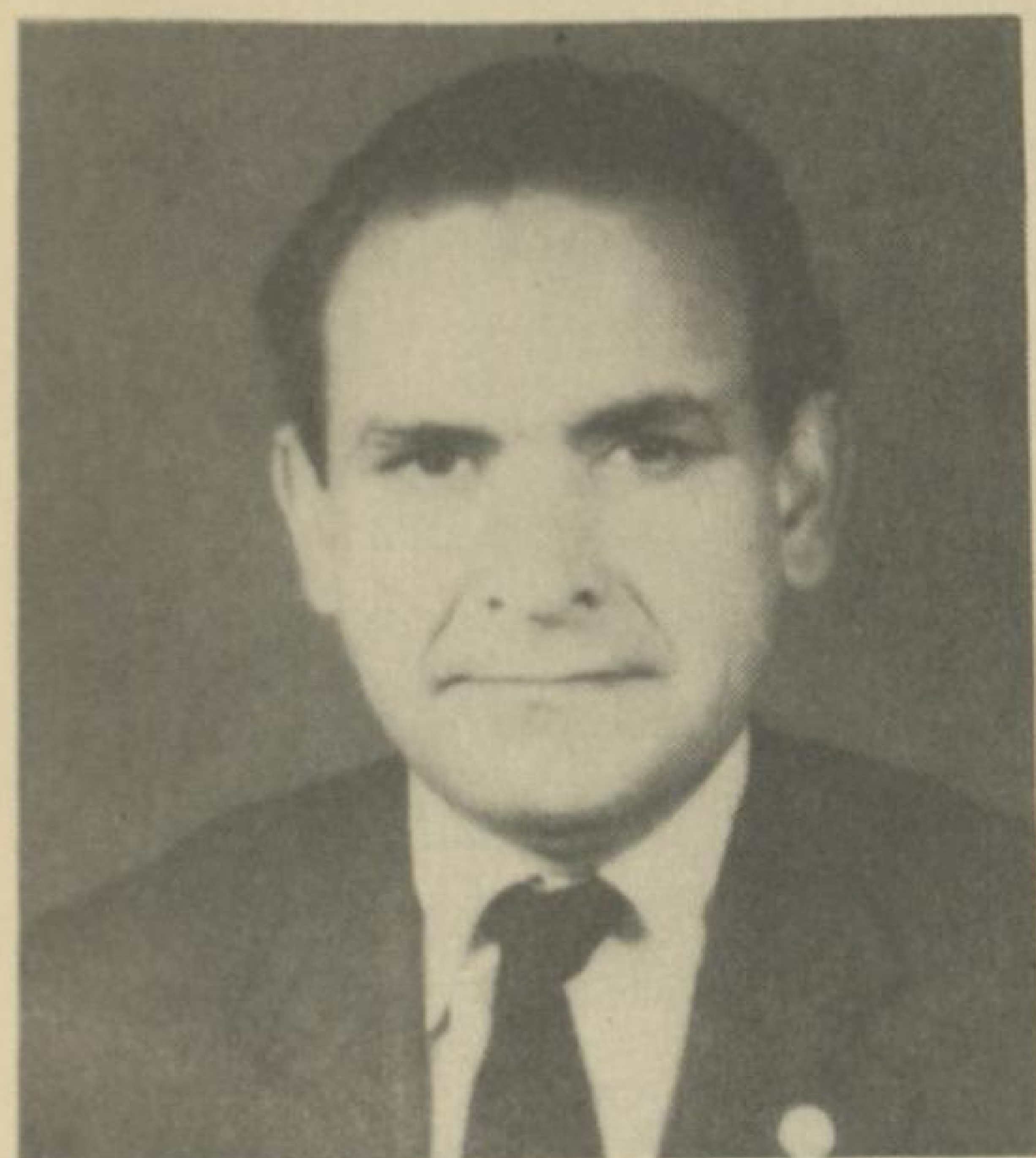
لوگ مل کر بچھڑ بھی جاتے ہیں
اور یہ ناگہاں بھی ہوتا ہے

چشمِ آئینہ ساز میں شاید
آئنے کا گماں بھی ہوتا ہے

جس کو کہتے ہیں برگِ آوارہ!
سنگِ دستِ خزاں بھی ہوتا ہے

غزل میں رمزیت اور ایمائیت پہلے بھی تھی، اور اب بھی ہے، لیکن اب اس کے تار و پود اس قدر لطیف اور ہمہ گیر ہیں کہ زندگی کی تمام تر گھما گھمی اور حیات کی تمام تر ہما ہمی اس میں بسی ہوئی ہے۔

(ڈاکٹر محمد اسلم قریشی)



رشید نثار

نام عبدالرشید اور نثار تخلص - ۱۵ - اگست ۱۹۲۷ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ والد اگرچہ بہ اعتبار پیشہ ٹھیکیدار تھے لیکن خاندان میں علمی روایت موجود تھی - رشید نثار نے سیاست اور سیاحت کے شوق میں ہندوستان کے کئی علاقوں کی سیر کی - قیام پاکستان سے قبل، آپ کراچی کے ایک اخبار سے وابستہ ہوئے اور یوں بحیثیت صحافی اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔

رشید نثار نے شعر کے علاوہ افسانے، ڈرامے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کی بعض غیر مطبوعہ تصانیف کے نام یہ ہیں:

سدا رنگ زینہ، افہام و تفہیم، نغمے، شعلے آوازیں اور دلبستانِ راولپنڈی۔

رشید نثار

گونجی تھی صدا پاؤں کی آیا نہیں کوئی
جینے کی خبر شہر میں لایا نہیں کوئی

سینہ مرا شب تاب ہے آنکھوں میں چراغاں
میں نے کسی شب دیپ جلایا نہیں کوئی

جب لوگ تھے چُپ چاپ بھری بزم تھی خاموش
آنکھوں نے بھی افسانہ سنایا نہیں کوئی

شیشے مرے موجود مرا گھر بھی ہے محفوظ
اک گھر مرے ہاتھوں نے جلایا نہیں کوئی

سجدے بھی کئے زخم بہت کھائے سفر میں
ماتھے پہ مگر داغ سجایا نہیں کوئی

پاؤں مرے زخمی ہیں مرا سر بھی ہے زخمی
راہوں سے مگر سنگ ہٹایا نہیں کوئی

لمحہ مرا مخلص ہے وہی دشمنِ جاں ہے
میں نے بھی کبھی دوست بنایا نہیں کوئی



رضا ہمدانی

مرزا رضا حسین نام۔ پیدائش ۱۹۱۶ء میں بمقام پشاور شہر۔ دینی تعلیم مختلف علماء سے حاصل کی۔ حافظ کفایت حسین مرحوم کی زیرِ نگرانی کلام مجید کے چھ پارے حفظ کئے۔ جس کے بعد میٹرک، منشی فاضل اور پشتو فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ رضا ہمدانی اردو کے علاوہ فارسی، ہندکو اور پشتو زبان میں بھی شعر کہتے ہیں۔ کئی رسائل کے مدیر رہے۔ جن میں ہفتہ وار "شباب"، ماہنامہ "ندا" اور ماہنامہ "سنگِ میل" کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً مختلف ادبی تنظیموں کے عہدہ دار رہ چکے ہیں۔ دو ہندکو فلموں (قصہ خوانی اور بدمعاش) کے لئے گیت بھی لکھے ہیں۔

تصانیف ایک درجن کے قریب ہیں جو ادبی، ثقافتی، تاریخی و سوانحی، دینی و مذہبی سب ہی موضوعات سے متعلق ہیں۔ کم و بیش اتنی ہی کتابیں فارغ بخاری کے ساتھ مل کر نظم و نثر میں تصنیف و ترجمہ کی ہیں۔ رضا کی بعض تصانیف پر رائٹرز گلڈ، اباسین آرٹ کونسل اور یونیسکو کی جانب سے انعامات بھی مل چکے ہیں۔

رضا ہمدانی

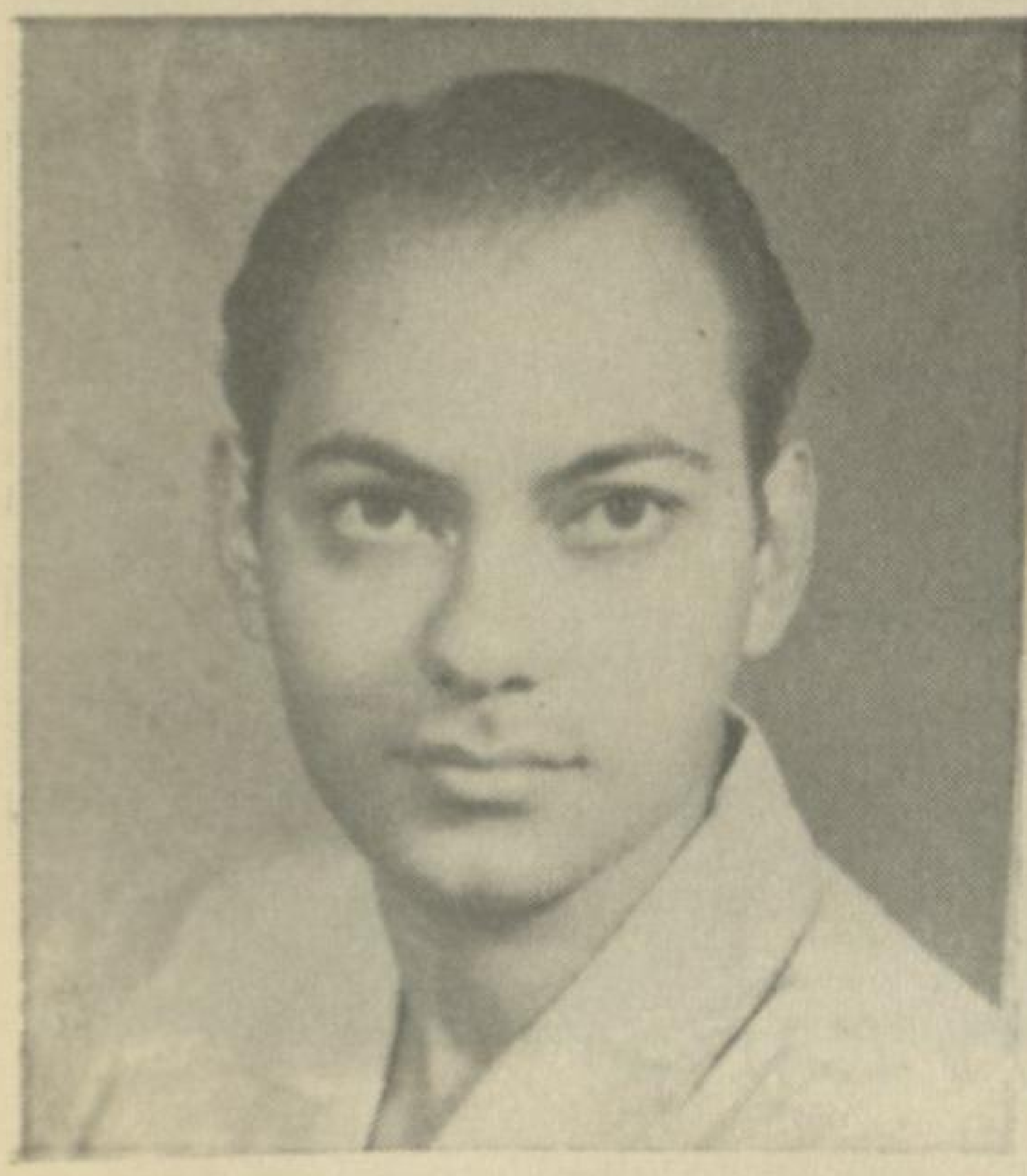
وہ آگ جس کا شرارہ نفس کی حد میں ہے
اب ایک لاش ہے جو جسم کی لحد میں ہے

جنوں ہے، ذہن کی شفاف روشنی کا نام
ہزار طرح کی پیچیدگی خرد میں ہے

بغیر دیکھے کھنچا جا رہا ہوں ان کی طرف
عجیب چیز ہواؤں کے خال و خد میں ہے

خموشیوں کی صداؤں کا شب پہ ہے پہرہ
کہ یہ عدو بھی تو اپنے عدو کی زد میں ہے

کوئی بھی دل کے تقاضے دبا نہیں سکتا
یہ عیب وہ ہے جو ہر ایک نیک و بد میں ہے

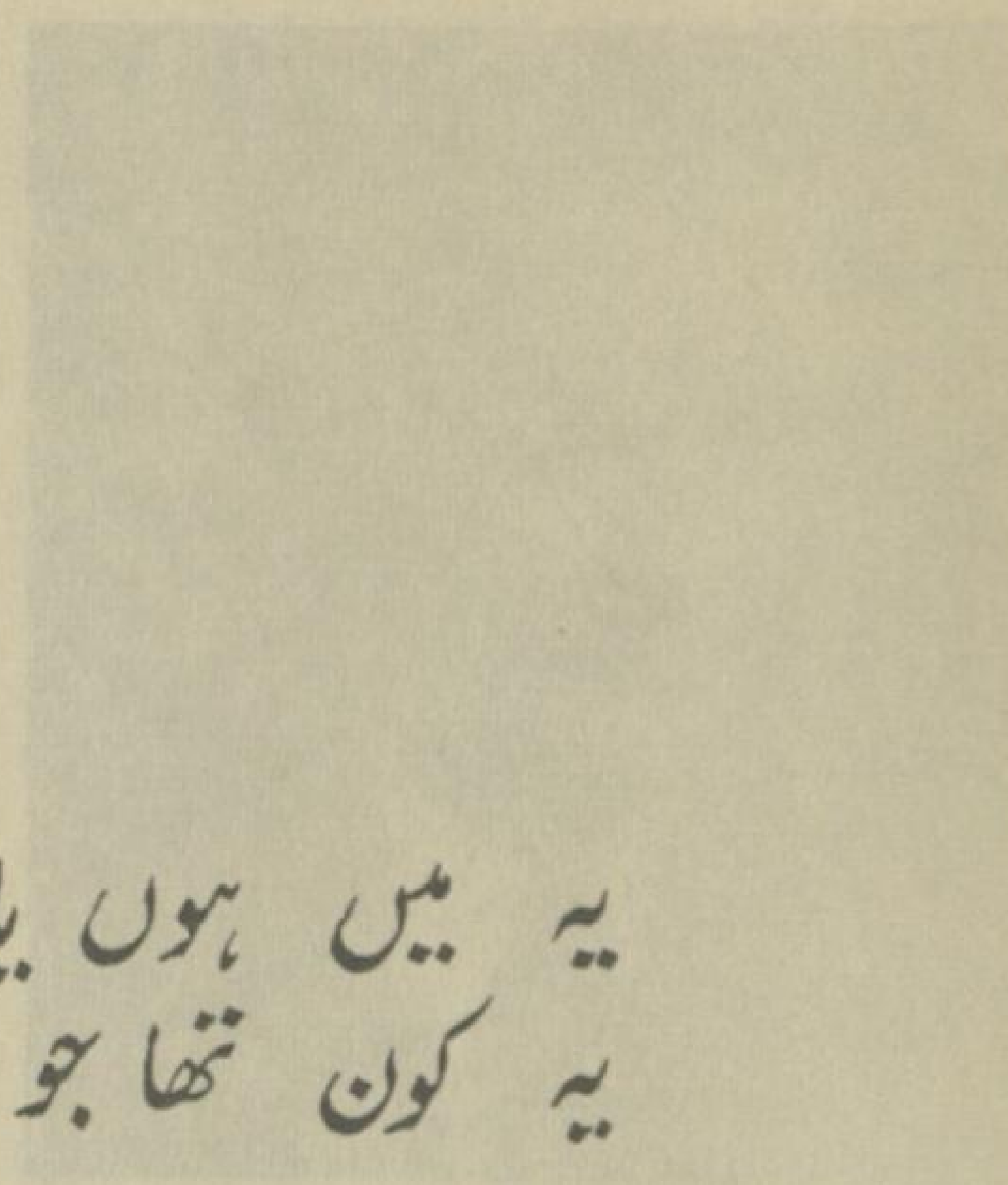


رضی اختر شوق

رضی اختر نام اور شوقؔ تخلص۔ آبائی وطن سہارن پور (بھارت) ہے جہاں آپ ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔

حیدر آباد دکن میں تعلیم حاصل کی۔ جہاں سے بی اے کرنے کے بعد آپ نے ملازمت اختیار کر لی۔ ان دنوں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہیں۔

مجموعۂ کلام طباعت کے مراحل میں ہے۔



رضی اختر شوق

یہ میں ہوں یا ترا پرتو اُتر گیا مجھ میں
یہ کون تھا جو غزل خواں گزر گیا مجھ میں

ترا سخن لبِ اقرار میں بدلنے تک
ہزار طرح کا موسم گزر گیا مجھ میں

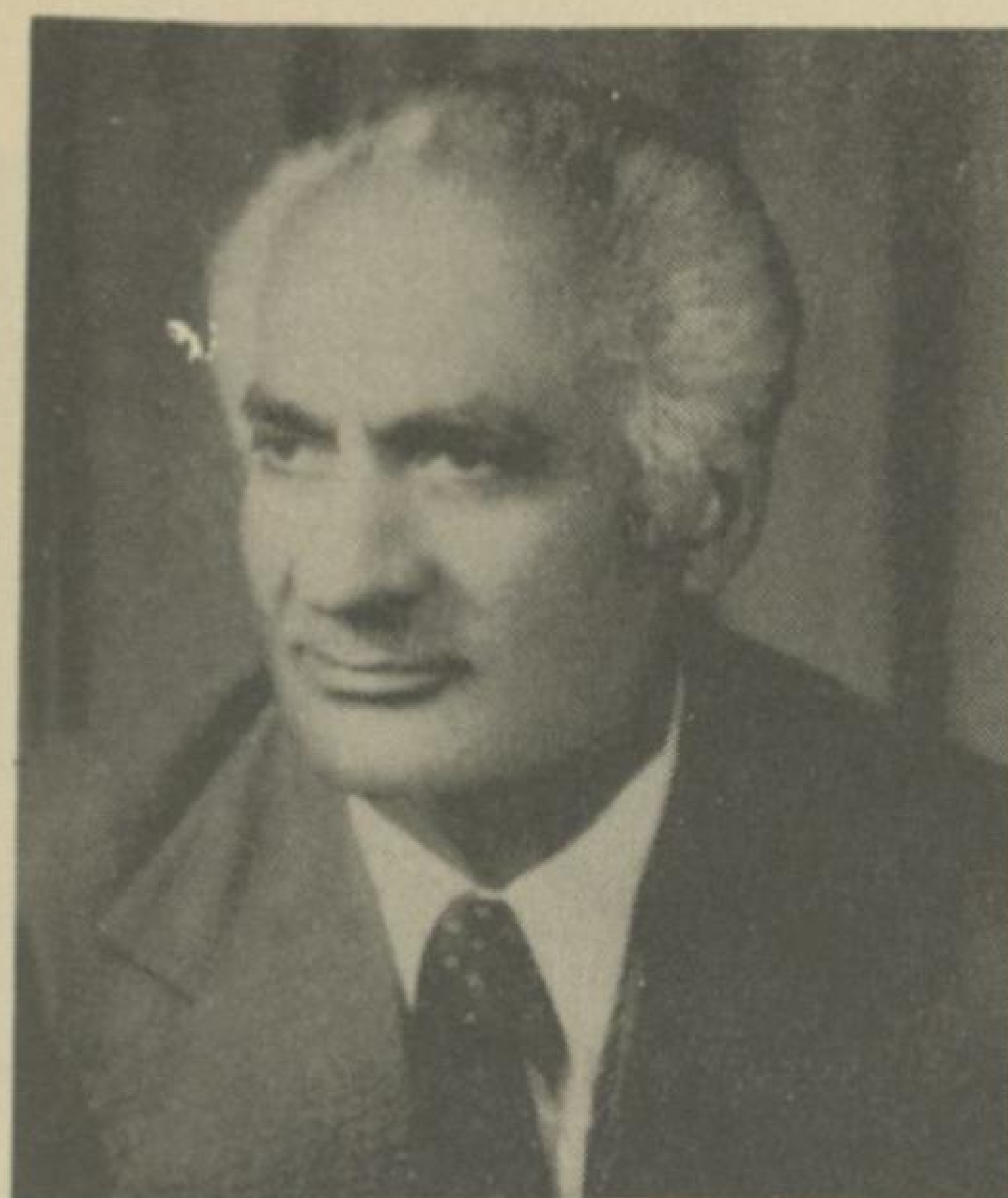
یہ کس کے سوگ میں شوریدہ حال پھرتا ہوں
وہ کون شخص تھا ایسا کہ مر گیا مجھ میں

وہ آدمی کہ جو پتھر تھا جی رہا ہے ابھی
جو آئنہ تھا وہ کب کا بکھر گیا مجھ میں

وصال کیا کہ وہ جب بھی قریب سے گزرا
تو یوں لگا کہ کوئی رقص کر گیا مجھ میں

وہ ساتھ تھا تو عجب دھوپ چھاؤں رہتی تھی
بس اب تو ایک ہی موسم ٹھہر گیا مجھ میں

سلام اسے بھی کہ بے سائباں کیا جس نے
دعا اسے بھی کہ جو چھاؤں کر گیا مجھ میں



رفعت سلطان

رفعت سلطان کے جدِ امجد حضرت سلطان العارفین سلطان باہُو ہیں۔ جو فارسی اور پنجابی کے مشہورِ عالم اور یگانۂ روزگار شاعر تھے۔ اس لحاظ سے رفعت سلطان کو شاعری ورثے میں ملی ہے۔
رفعت سلطان، یکم مارچ ۱۹۲۴ء کو تحصیل شورکوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔ بی اے کرنے کے بعد ملازمت اختیار کی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۷۹ء کو محکمہ خوراک پنجاب سے بحیثیت ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر سبکدوش ہوئے۔ اب صرف زمینداری اور شاعری کرتے ہیں۔
رفعت سلطان کی غزلوں کے دو مجموعے "ایمن" اور "آواز" کے عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعۂ کلام "اظہار" ابھی زیرِ ترتیب ہے۔

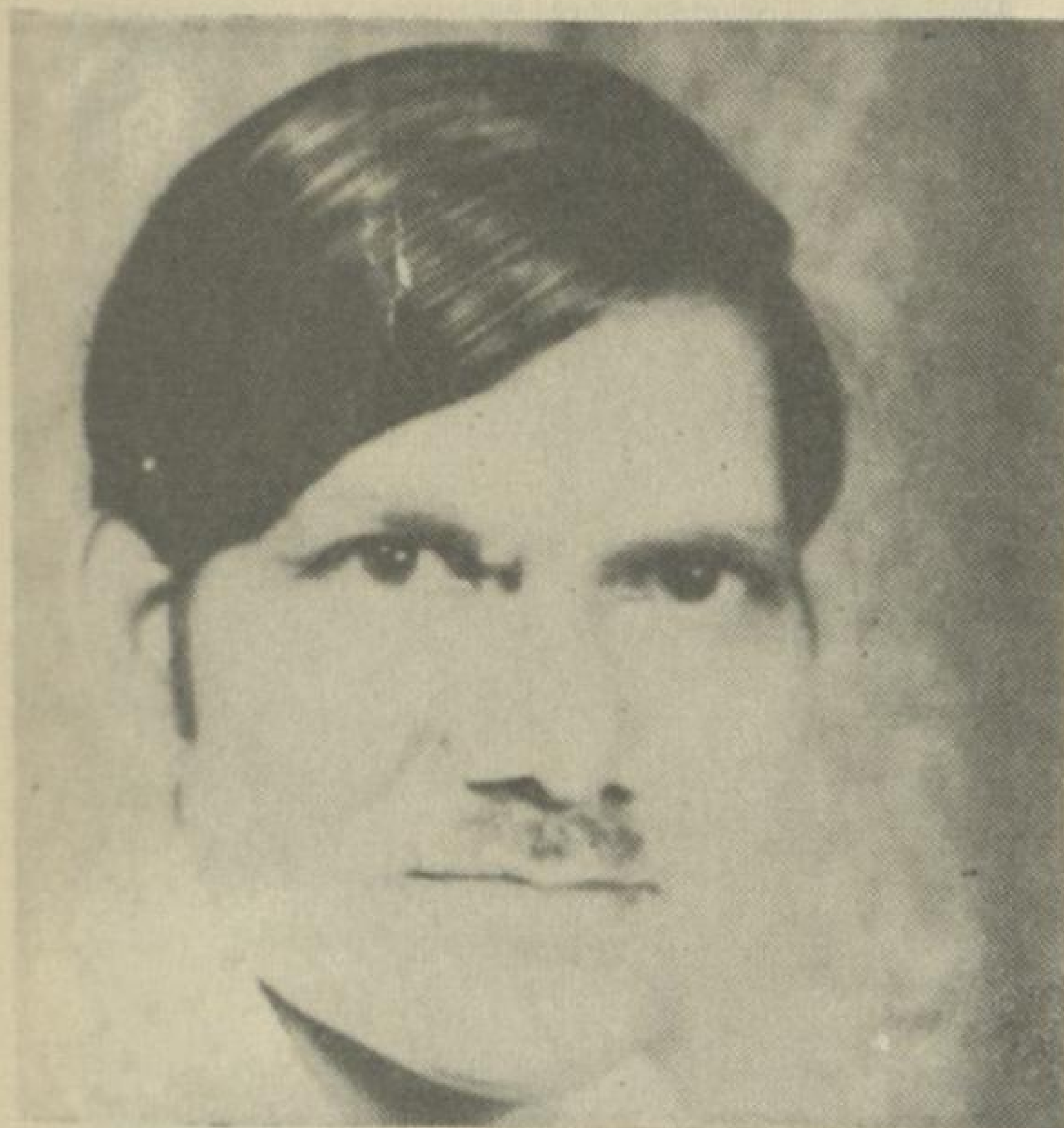
رفعت سلطان

اِک حقیقت بھی ، اِک فسانہ بھی
کتنا فن کار ہے زمانہ بھی
تُم سے مل کر ہُوا ہے یوں محسوس
تُم سے تھا ربط غائبانہ بھی

سونے والے ابھی نہیں جاگے
قافلہ ہو گیا روانہ بھی
اطلاعاً بتا رہا ہوں تمہیں
راہ میں ہے غریب خانہ بھی

ذکرِ دیر و حرم بجا ، لیکن
ہو کوئی بات شاعرانہ بھی
زیست لے آئی ہے وہاں کہ جہاں
سخت مشکل ہے مُسکرانا بھی

تمُ ہی آئے نہ بن سکا تمُ سے
کوئی معصوم سا بہانہ بھی
وہ بھی نازک خیال ہے رفعتؔ
میری غزلیں ہیں عاشقانہ بھی



روحی کنجاہی

اصل نام امر الٰہی اور روحی تخلص۔ آپ ۴ اگست ۱۹۳۸ء کو بمقام کنجاہ ضلع گجرات پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی محمد دین ہے جو کنجاہ کے اسلامیہ ہائی سکول میں مدرس تھے، ابھی روحی آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا نامساعد حالات کے باوجود آپ نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور بی اے تک تعلیم مکمل کی۔ ساتھ ہی ملازمت بھی کرتے رہے۔

میٹرک کے بعد دس برس کوہ نور ٹیکسٹائل ملز فیصل آباد میں گزارے۔ ان دنوں لاہور میں زرعی ترقیاتی و سپلائز کارپوریشن میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں۔

مجموعہ کلام "صدیوں کا سفر" ترتیب دے چکے ہیں۔ جو ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔

رُوحی کنجاہی

ہر بات میں بات ڈھونڈتا ہوں
مفہومِ حیات ڈھونڈتا ہوں

یوُں بھی تو حیات کٹ رہی ہے
میں کیوں ترا ساتھ ڈھونڈتا ہوں

کہنی ہے ہر ایک بات لیکن
لفظوں سے نجات ڈھونڈتا ہوں

وہ شخص تو نیم کا شجر ہے
میں شاخِ نبات ڈھونڈتا ہوں

میں ہو کے الگ حقیقتوں سے
بہتر حالات ڈھونڈتا ہوں

کرتا ہوں تلاشِ صبح شب بھر
دن آتے تو رات ڈھونڈتا ہوں

کِس طرح تجھے بتاؤں روحیؔ
میں کون سی بات ڈھونڈتا ہوں!



روشن نگینوی

نام سید سلطان احمد۔ روشن تخلص۔

۱۵ جولائی ۱۹۲۷ء کو نگینہ (بھارت) میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ پشاور یونیورسٹی سے بی اے کیا اور یہیں سے اردو آنرز کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ آجکل فضائیہ کے ہیڈ کوارٹرز میں جی۔ ایس۔ او کے عہدہ پر فائز ہیں۔

شاعری کا آغاز یوں تو ساتویں جماعت سے ہی ہو چکا تھا۔ مگر ملازمت میں آنے کے بعد شملہ اور دہلی کی رومان پرور فضا اور ماحول میں باقاعدہ اس کی نشوونما ہوئی۔ ادبی رسالوں میں کلام چھپنے لگا اور مشاعروں میں شرکت کے مواقع میسّر آئے۔ باقاعدہ شعر گوئی کی ابتدا ۱۹۴۳ء سے ہوئی۔ ۱۹۶۶ء میں "اوجِ پاکستان" شائع ہوئی۔ جس میں ستمبر ۱۹۶۵ء میں لکھی گئی رجزیہ نظمیں اور کچھ قومی نغمے شامل ہیں۔ ایک مجموعۂ غزلیات "چراغِ فردا" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ قطعات کا ایک مجموعہ "نگینے" کا مسودہ بھی اشاعت کے لئے تیار ہے۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی سے نشر شدہ نغمے اور گیت بھی "شہرِ نگاراں" کے نام سے طباعت کے منتظر ہیں۔ ایک نثری مجموعہ "افسانہ و افسوں" بھی زیرِ ترتیب ہے۔ جس میں ریڈیو سے نشر شدہ افسانے شامل ہیں۔

روشن نگینوی

دام پھیلائے ہوئے حرص و ہوا ہیں کتنے
ایک بندہ ہے مگر اس کے خدا ہیں کتنے

اس سے پہلے کہ جفاؤں پہ کریں ہم تنقید
دیکھنا یہ ہے کہ اربابِ وفا ہیں کتنے!

ایک اک ذرّے میں پوشیدہ ہیں کتنے خورشید
ایک اک قطرے میں طوفان بپا ہیں کتنے

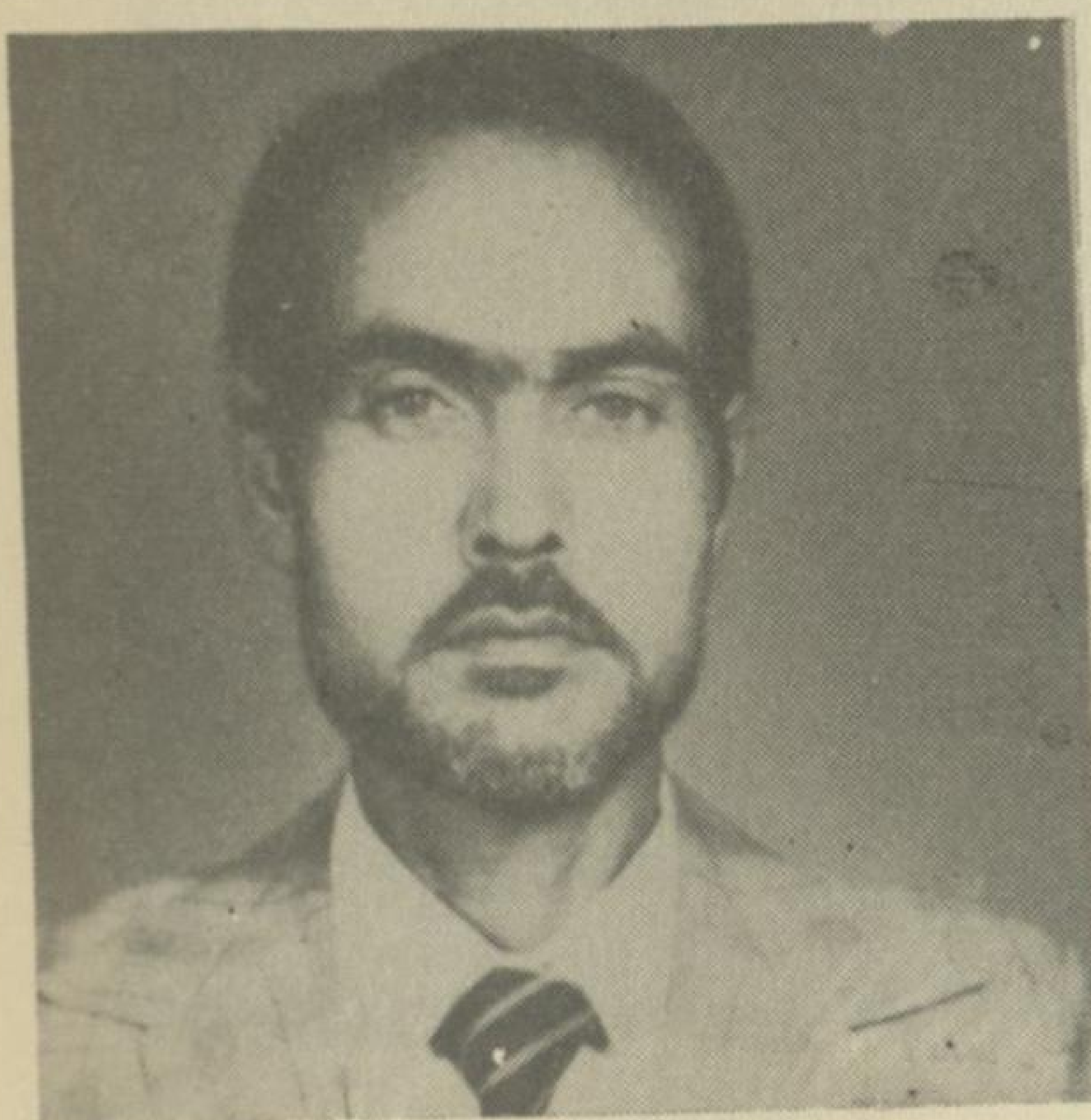
اے ثنا خوانِ بہاراں تجھے معلوم بھی ہے!
چاک دل، چاک جگر، چاک قبا ہیں کتنے

چند ہنستے ہوئے پھولوں کا چمن نام نہیں!
غور سے دیکھ کہ پامالِ صبا ہیں کتنے

چاند سے دور ستاروں میں تب و تاب تو ہے
وہ جو نزدیک ہیں محرومِ ضیا ہیں کتنے

اُن سے ناکردہ جفاؤں کا کیا تھا اصرار
اتنی سی بات پہ وہ ہم سے خفا ہیں کتنے

گامزن ہو کے یہ عقدہ تو کھلا ہے روشؔن
راہزن کتنے ہیں اور راہنما ہیں کتنے



رئیس احمر

پورا نام خواجہ رئیس حسین، والد کا نام خواجہ نذر حسین۔ رئیس احمر، ۱۹۴۰ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور کراچی میں آباد ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں ایم، اے (انگریزی) اور ایل ایل بی کرنے کے بعد بحیثیت لیکچرار ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۷۵ء میں محکمۂ تعلیم کو چھوڑ کر انفارمیشن سروس اختیار کی۔ آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں۔

کافی کم سنی سے شعر کہنا شروع کیا۔ زمانہ طالب علمی میں زیادہ تر توجہ انگریزی نظموں کے تراجم پر مرکوز رہی۔ عملی زندگی میں آ کر غزل اور طویل نظموں کو موضوعِ سخن بنایا اور آزاد نظم میں مکمل مرثیہ بھی کہا۔

"کوششِ رائیگاں" اور "زبانِ یار" ان کی زیرِ طبع تصانیف ہیں۔

رئیس احمر

ہے حسن ظن کہ حسنِ گماں سوچتا ہوں میں
کیوں اُن کی بزمِ ناز میں پوچھا گیا ہوں میں

فکرِ سخن کے وار سے لہجہ کی ضرب سے
مدت ہوئی کہ خون میں ڈوبا ہوا ہوں میں

آواز دے رہا ہوں پھر اے وقت کچھ ٹھہر
چہرے کی جھرّیوں سے اب اکتا چکا ہوں میں

وہ تیزیٔ نفس کہ تموّج ہے جام میں
تاریخ میکشی کی نئی لکھ رہا ہوں میں

اللہ رے یہ کیفِ تعلق کہ آج بھی
اکثر تری نگاہ میں پایا گیا ہوں میں

یہ اتفاقِ حسن ہے راس آگیا ہے عشق
اب چشمِ التفات ہے اور بڑھ رہا ہوں میں

الفاظ کا عمیق سمندر نظر میں ہے
گو تشنۂ سخن ہوں مگر بولتا ہوں میں

پاؤگے اب اماں نہ کہیں بھی بہار میں
اہلِ چمن ، وہ خاک اڑا کر اٹھا ہوں میں

حسنِ خیال ، تجھ کو تراشا ہے مدّتوں
اب تُو مرا صنم ہے تو تیرا خدا ہوں میں

سنسان سی فضا میں یہ بن بولتا ہوا
اس پر بھی مطمئن ہوں کہ تنہا کھڑا ہوں میں

سینہ میں ہے جو سات سمندر کی داستاں
احمرؔ سخن کا شوق ہے اور لب کشا ہوں میں

سادگیٔ بیان اور سہولتِ اظہار کے پردے میں شاعر جب اپنے تجربات کو فطرت اور کائنات کے احوال کے مشاہدات کے مقابل لا کھڑا کرتا ہے تو قلبِ انسانی کے ایسے عجائبات کا مشاہدہ ہوتا ہے جس کے صد ہزار رنگ ہیں۔ وہی ایک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے۔ دلوں کے تجلّی زار سے جو کرن پھوٹتی ہے اس کی ضو کا ہر پہلو ایک نئی جلوہ گاہ کا منظر پیش کرتا ہے۔

(ڈاکٹر سید عبداللہ)



رئیس امروہوی

سید محمد مہدی نام، رئیس تخلص۔ امروہہ ضلع مراد آباد (بھارت) کے مشہور سادات خاندان سے تعلق ہے۔ تاریخ ولادت ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء ہے۔ فیض معنوی اپنے والد علامہ سید شفیق حسن ایلیا مرحوم سے حاصل کیا۔ پہلا شعر ۱۹۲۴ء میں کہا:

یا تو کہہ میں ہی غلط سمجھا ہوں
یا نئے سر سے بہار آئی ہے

ادب و صحافت سے عملی تعلق کی ابتدا ۱۹۳۱ء میں ماہنامہ "حیات" کی ادارت سے کی۔ پھر دوسرے اخبارات میں لکھنا شروع کیا۔ اب تک حسب ذیل اخبارات و رسائل سے متعلق رہے ہیں:

ماہنامہ حیات — روزنامہ اتحاد — قرطاس ویکلی — پبلک گزٹ (امروہہ) — روزنامہ جدت — حکومت — ماہنامہ مسافر — ماہنامہ مشہور — کہکشاں — روزنامہ اور ہفت روزہ انصاری (دہلی) — ہفت روزہ غالب — شیراز — جنگ — انشا (کراچی)

اکتیس ۳۱ سال سے اردو کے مشہور اخبار "جنگ" میں حالات حاضرہ پر روزانہ ایک قطعہ شائع ہوتا ہے۔

رئیس اکادمی سے اب تک تئیس ۲۳ سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں پانچ مجموعے نظم و غزل کے شامل ہیں۔ نثری کتب کے موضوعات نفسیات، مابعد النفسیات، روحانیت اور فلسفہ بشریات ہیں۔ اس وقت تک ایک لاکھ سے زیادہ اردو، فارسی کے شعر لکھ چکے ہیں۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

رئیس امروہوی

مہجورِ ہر انجمن ہیں ہم لوگ
اپنے میں جلاوطن ہیں ہم لوگ

جو سبزہ و برگ سے ہو محروم
وہ شبنمِ بے کفن ہیں ہم لوگ

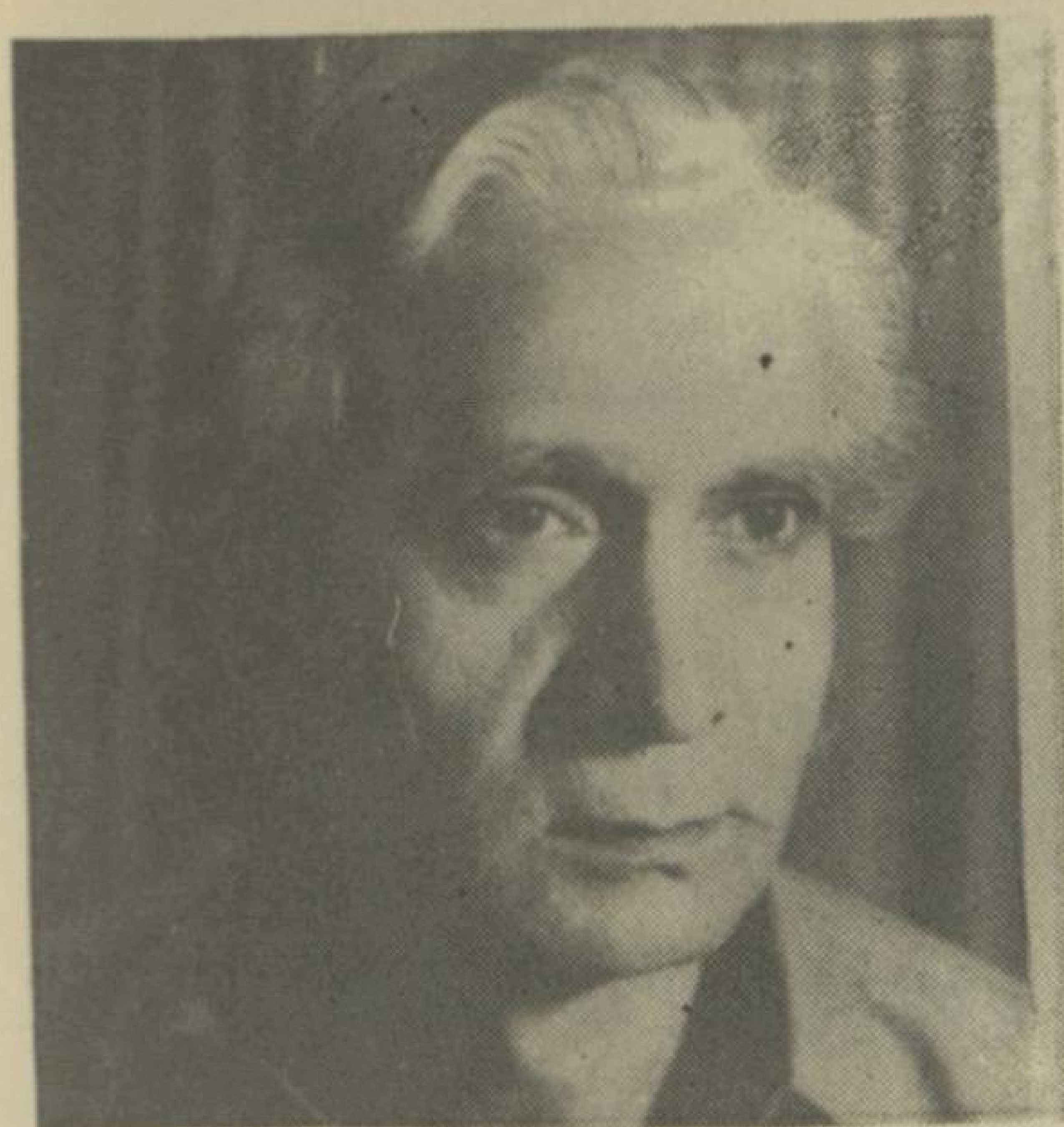
اے اپنی ہی خلوتوں میں محبوس!
شاید تری انجمن ہیں ہم لوگ

خود اپنے وجود میں مقیّد
پابستۂ بے رسن ہیں ہم لوگ

ہر ذرّے میں سامعہ ہے بیدار
کس شخص سے ہم سخن ہیں ہم لوگ

اے عالمِ رنگ رنگ تخلیق!
آزردۂ جان و تن ہیں ہم لوگ

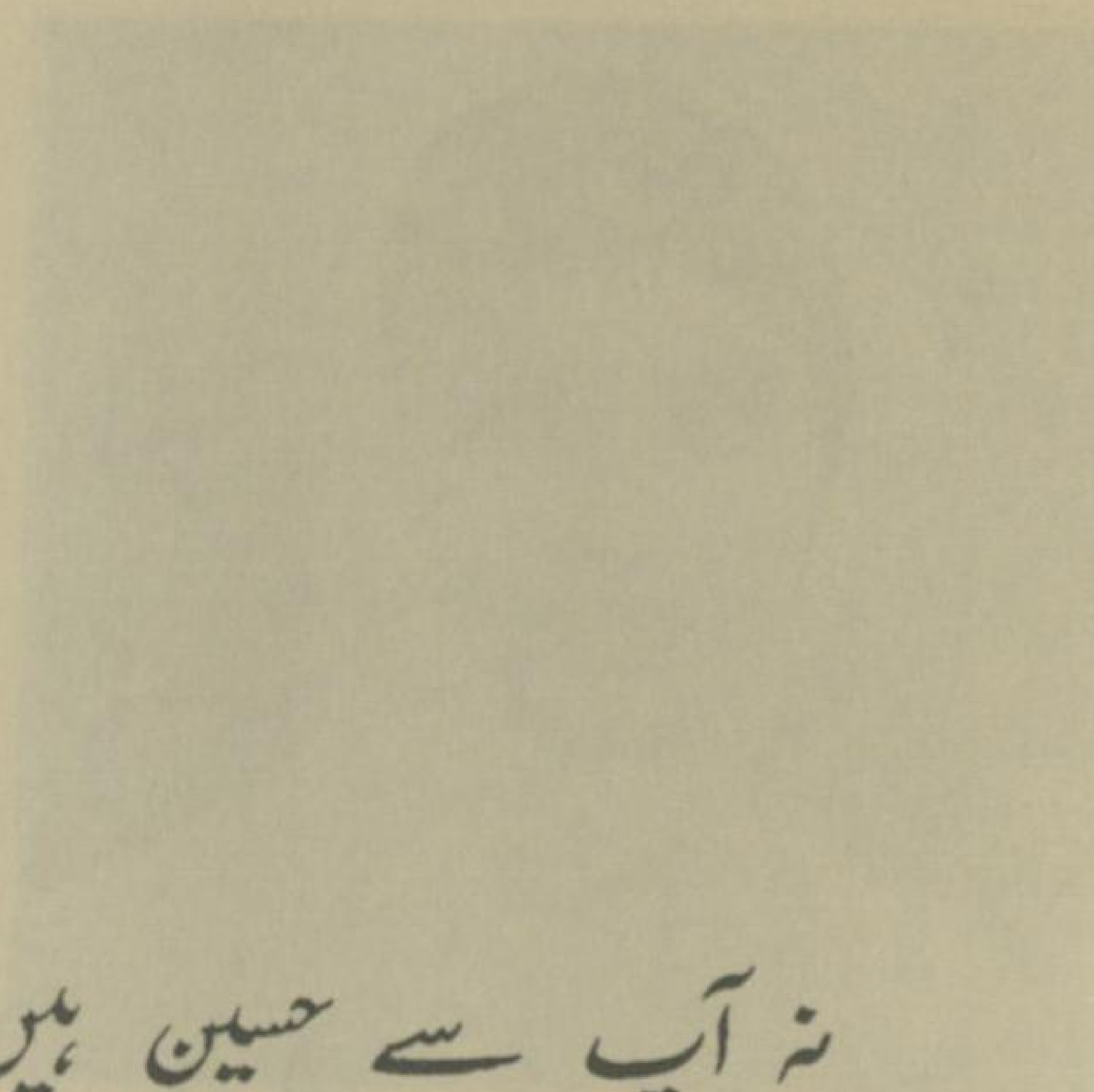
ہر عہد کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ



رئیس فروغ

۱۵ فروری ۱۹۲۶ء کو مراد آباد میں پیدا ہوئے۔
پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کراچی میں بطور اسکرپٹ رائٹر کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ شاعری کے علاوہ طنز و مزاح، افسانے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں، ان کی تصنیف " ہم سورج چاند ستارے " شائع ہو چکی ہے۔

رئیس فروغ



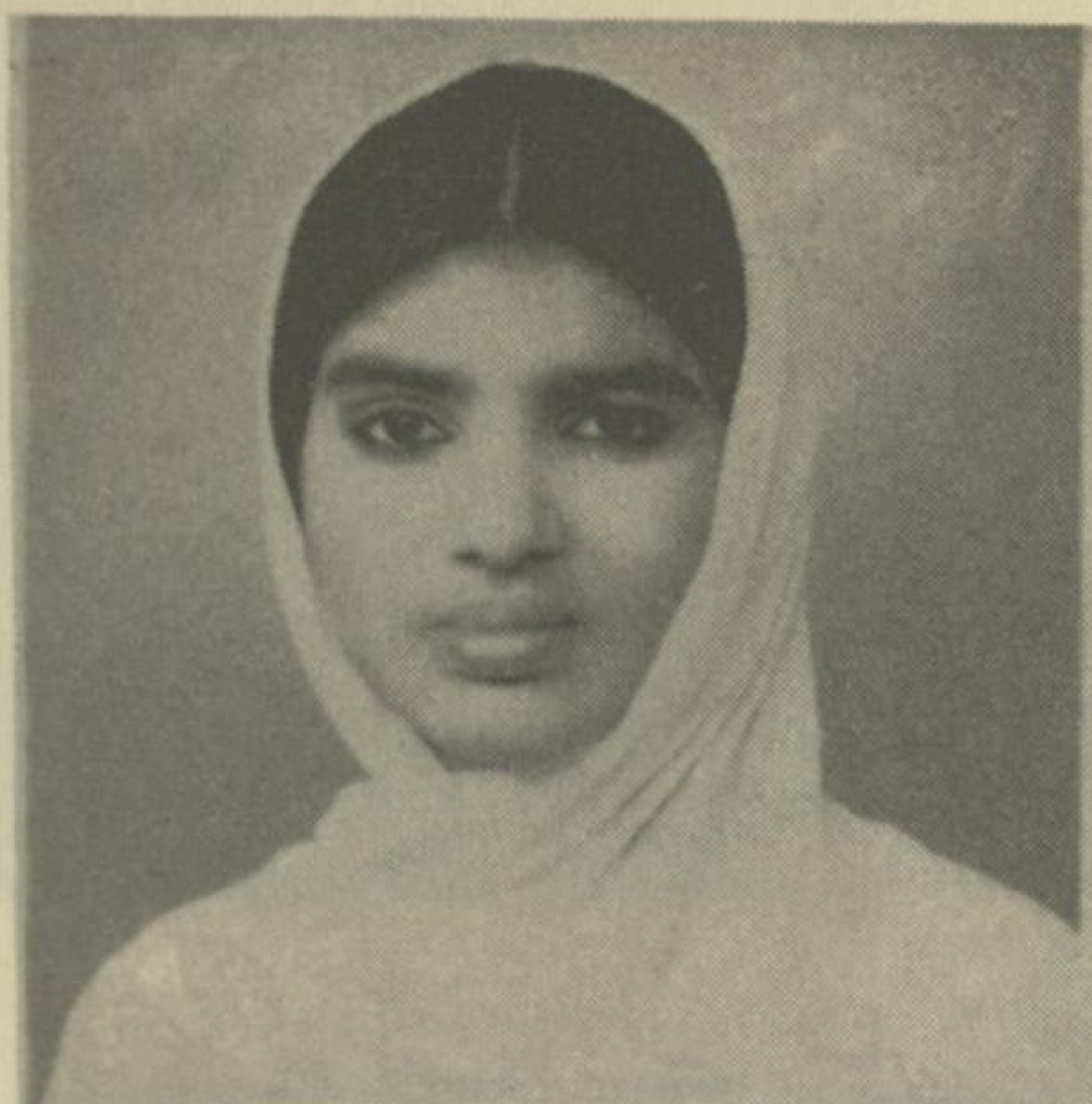
نہ آپ سے حسین ہیں، نہ آپ سے جوان ہیں
مگر وہ پیاری لڑکیاں زیادہ مہربان ہیں

کبھی لباس اور ہوا، کبھی زمین اور گھٹا
ترے دیار کی رتیں محبتوں کی جان ہیں

سفر کی بات کیا کہوں کہ میری دھوپ چھاؤں سے
گزرنے والی بستیاں ہواؤں کے سمان ہیں

منڈیریوں سے صحن تک دیے جلا کے سو گئیں
کبوتروں کی جوڑیاں عجیب میہمان ہیں

تری بہار کا شجر ہرا بھرا رہے مگر
وہ ڈالیاں بھی کھول دے جو میرا سائبان ہیں



زاہدہ صدیقی

آپ ۲۸ جون ۱۹۵۳ء کو پسرور (ضلع سیالکوٹ) کے ایک نواحی گاؤں چوہان قریشیاں میں پیدا ہوئیں۔ سینٹ ونسنٹ اسکول پسرور، گورنمنٹ کالج، باغبانپورہ لاہور اور اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ ادبی ذوق کی نشوونما گھریلو ماحول سے ہوئی۔ آپ ماہنامہ "تحریریں" کی مدیرہ ہیں۔

آپ کا پہلا شعری مجموعہ "جاگتی آنکھوں کا خواب" شائع ہو چکا ہے۔ مزید تین شعری مجموعے زیرِ طبع اور تین کتابیں زیرِ ترتیب ہیں۔

زاہدہ صدیقی

دریا کو پیاس، پیاس کو دریا کہا گیا
منفی ہوئی جو سوچ تو کیا کیا کہا گیا

اس جنگِ زرگری نے شگوفے بہت کھلائے
جو پستہ قد ہوا اُسے اونچا کہا گیا

جس کو ہجومِ خلقِ خدا نے کیا اداس
اس کو بھی اک لحاظ سے تنہا کہا گیا

بینائی بانٹنے کا اُسے شوق تھا بہت
اندھوں کے شہر میں اُسے اندھا کہا گیا

ہم مصلحت سے دُور رہے کذب سے پرے
کب ہم سے روشنی کو اندھیرا کہا گیا

اے روشنیٔ طبع بس اب ساتھ چھوڑ دے
سچّوں کو تیرے شہر میں جھوٹا کہا گیا



سحر انصاری

کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ یہیں سے پہلے انگریزی اور پھر اردو میں ایم اے کیا۔ ایک شعری مجموعہ "نمود" کے نام سے کوئی تین برس پہلے شائع ہوا تھا۔ "ناسخ — حیات اور شاعری" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ مکمل کر لیا ہے جو ابھی تک پیش نہیں کیا ہے۔ گذشتہ سال جرمن کلچرل سینٹر کے تحت، گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں گوئٹے، ہولڈرلن، رلکے، ہائنے اور جدید جرمن شاعروں پر لیکچر دئے جو کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔

سحر انصاری

نہ رہبروں سے، نہ انبوہِ رہرواں سے کہو
ذرا سنبھل کے چلے، گردِ کارواں سے کہو

سوادِ دشتِ تمنّا کی آخری رونق
خرامِ ناقۂ لیلیٰ ہے، ساربان سے کہو

صلیب و نیزہ و زندان و خنجر و زہراب
سنائیں قصۂ جاں داوگاں جہاں سے کہو

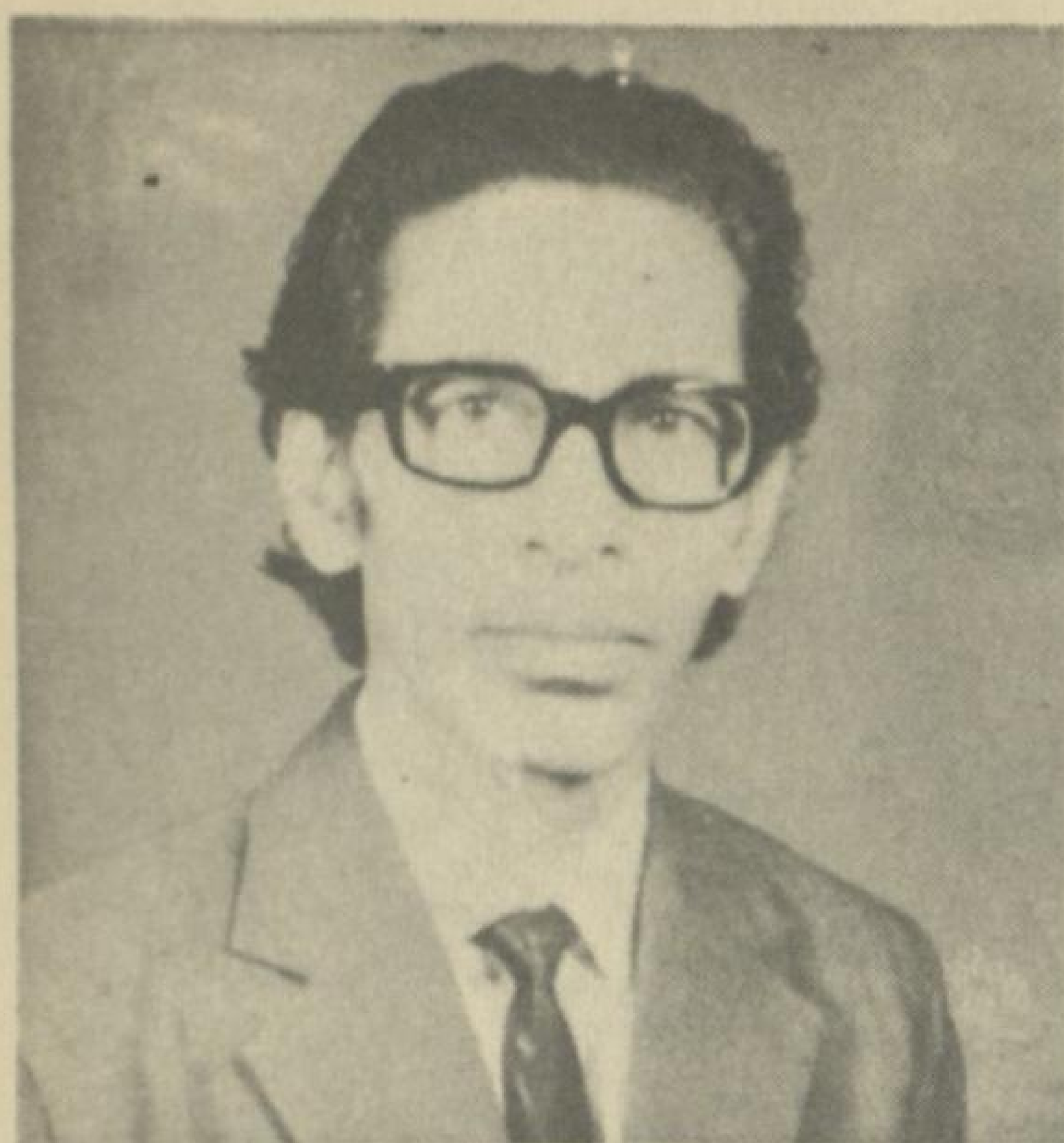
فریب کاریٔ جذب و گریز کے مابین
وجود ایک ہے تقسیمِ جسم و جاں سے کہو

ابھرتے ڈوبتے لمحات کے سمندر میں
ہوا بھی موجِ گریزاں ہے، بادباں سے کہو

سنا ہے میں نے، صدائیں کبھی نہیں مرتیں
پکارتے رہیں یارانِ رفتگاں سے کہو

گرا ہے کوئی تلافی کو تیغِ عریاں پر
جمالِ یار کے اندازۂ زیاں سے کہو

ملا نہ پھر کوئی تجھ سا اداشناس سحرؔ
کہیں ملے تو اسی یارِ مہرباں سے کہو



سرشار صدیقی

۱۹۲۷ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم فیض عام اسکول اور حلیم مسلم انٹر کالج کانپور سے حاصل کی۔

۱۹۵۰ء میں کراچی آ گئے۔ آج کل نیشنل بنک کے جریدے "قومی بینکار" کے مدیر ہیں۔

۱۹۶۲ء میں آپ کا منتخب کلام "پتھر کی لکیر" کے نام سے شائع ہوا اور اس کے تین برس بعد "زخمِ گل" کے عنوان سے ایک منظوم ڈرامہ منظرِ عام پر آیا۔ آپ کے لکھے ہوئے ادبی تبصرے "حرفِ مکرّر" کے نام سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئے ہیں۔ سرشار کے شاعری کے دو اور مجموعے "ابجد" اور "بے نام" کے عنوان سے اشاعت کے مراحل میں ہیں۔

نثار صدیقی

خراب و خستہ و بے آبرو نظر آئے
جو اہلِ ظرف تھے خالی سبو نظر آئے

مرا خلوص سماعت بھی دیدہ ور ٹھہرا
جو سن سکوں مجھے وہ گفتگو نظر آئے

میں اپنی آنکھوں کو اس وقت معتبر جانوں
کہ آئینہ بھی جو دیکھوں تو، تُو نظر آئے

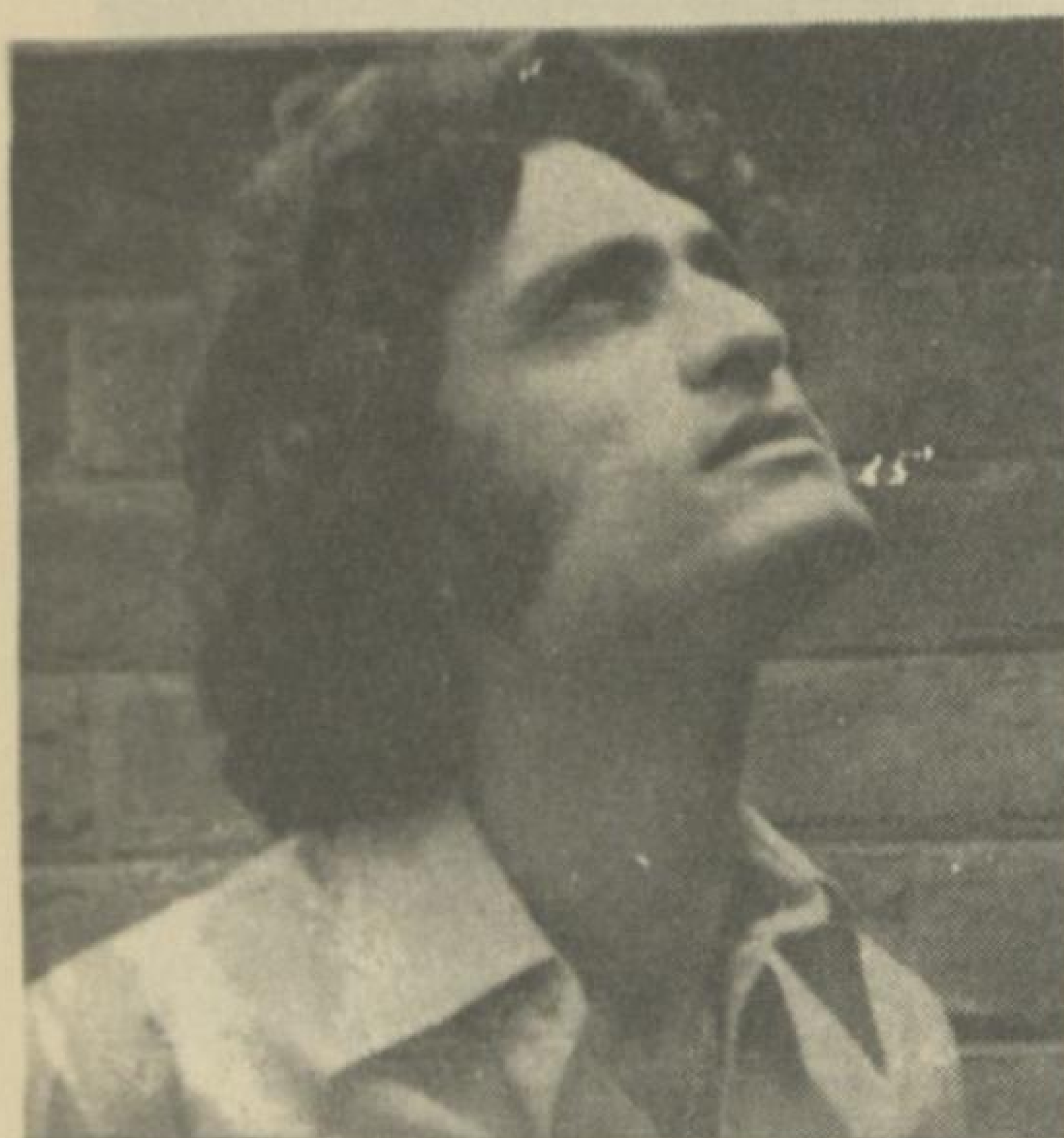
کبھی تو میں جرسِ غنچہ کی صدا بھی سنوں
کہیں تو قافلۂ رنگ و بو نظر آئے

یہ التباسِ نظر ہے کہ اعتبارِ نظر
جسے بھی دیکھوں وہی ہوبہو نظر آئے

شگفتہ گل جسے سب جنّتِ نگاہ کہیں
مجھے تو وہ بھی عذابِ نمو نظر آئے

یہ کیسی آب و ہوا ہے یہ کیسا موسم ہے
کہ پھول بھی ہمیں بے رنگ و بو نظر آئے

انہیں سرابوں نے سیراب کر دیا نثارؔ
جو تشنہ کام لبِ آب جُو نظر آئے



سرمد صہبائی

سرمد صہبائی کا پورا نام خواجہ سرمد سلیم پال ہے۔
آپ نومبر ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ اور لاہور میں حاصل کی۔ ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے کیا۔ جس کے بعد پاکستان ٹیلی وژن میں ملازمت کر لی، آج کل راولپنڈی اسلام آباد ٹیلی وژن میں بطور سکرپٹ ایڈیٹر کام کر رہے ہیں۔
اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔
شاعری کے علاوہ ڈرامہ بھی آپ کا موضوع ہے اب تک آپ کی شاعری اور ڈرامے کی درج ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں :۔
کٹھ پتلیوں کا شہر، ان کہی باتوں کی تھکن، شک شیشے دا ویلہ، توں کون، تیسرے پہر کی دستک۔ نظموں کا ایک مجموعہ "انکار کا دن" زیر ترتیب ہے۔

سرمد صہبائی

شام کے لب پر گیت بہا اک تارے کا
اُگا ہوا کی ڈال پہ پھول پرندے کا

آدھی رات کو اتری نیند بشارت کی
ہونٹوں پر تھا ورد ہوا کے جھونکے کا

کس کی آہٹ ساتھ سفر میں رہتی ہے
جسم کی اوٹ بلاوا ہے کس سائے کا

دل کے اندر گونجی ہُوک صداؤں کی
آنکھ کے اندر چمکا نقش پرندے کا

چوراہے پر بھیڑ ہے ناآشنائی کی
اس میں گم ہے بھید اک غیبی رستے کا

آنکھوں میں ہے نیلی رات سمندر کی
اس کے اندر چاند ہے تیرے سپنے کا

مجبوری کی چادر اوڑھ کے پھرتا ہوں
جگہ جگہ پیوند ہے درد دلاسے کا

اُڑی سیاہی دن میں شوخ عبارت کی
خالی ورق تھا اندر کورے جذبے کا

خواہش آہستہ آہستہ جینے کی
شوق تھا آہستہ آہستہ مرنے کا

نیند بھری کچھ بوندیں میٹھے خوابوں کی
ساری رات سفر ہے تیز بگولے کا

لقمہ لقمہ جسم کو بانٹا گلیوں میں
مجھ پر حق تھا ہر اک بھوکے پیاسے کا

سرمدؔ دھیان کے صحراؤں میں رہتا ہے
وجد مری خواہش کے میٹھے چشمے کا

جسے غزل کہتے ہیں وہ حقیقت میں کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معنی سمو دینے کا فن ہے ۔ حیا کوشش اس لئے کہ غزل، کبھی بے پردہ سامنے نہیں آتی ۔ بات فکر کی ہو یا جذبے کی، تصوّف کی ہو، یا فلسفہ و حکمت کی، روایت کی ہو یا بغاوت کی، غمِ عشق کی ہو یا غمِ روزگار کی، آرائشِ خمِ کاکل کی ہو یا اندیشہ ہائے دورِ دراز کی ۔ غزل ہمیشہ اشارات وکنایات میں اپنا مطلب ادا کرتی ہے

(ڈاکٹر فرمان فتحپوری)



سعید احمد اختر

سعید احمد اختر، ۳ مارچ ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں کے ارائیں گھرانے سے ہے۔ انگریزی اور اردو میں ایم، اے کے امتحانات پاس کرنے کے بعد ۱۹۶۸ء تک صوبہ سرحد کے مختلف کالجوں میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۸ء میں صوبائی سول سروس میں آگئے۔

۱۹۵۰ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "دیارِ شب" اور ۱۹۷۸ء میں دوسرا مجموعۂ کلام "سطحِ آب" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ "چاندنی کے سائے" شاید اس سال کے آخر تک شائع ہو جائے۔

سعید احمد اختر، ان دنوں بنوں (صوبہ سرحد) میں ڈپٹی کمشنر ہیں۔

سعید احمد اختر

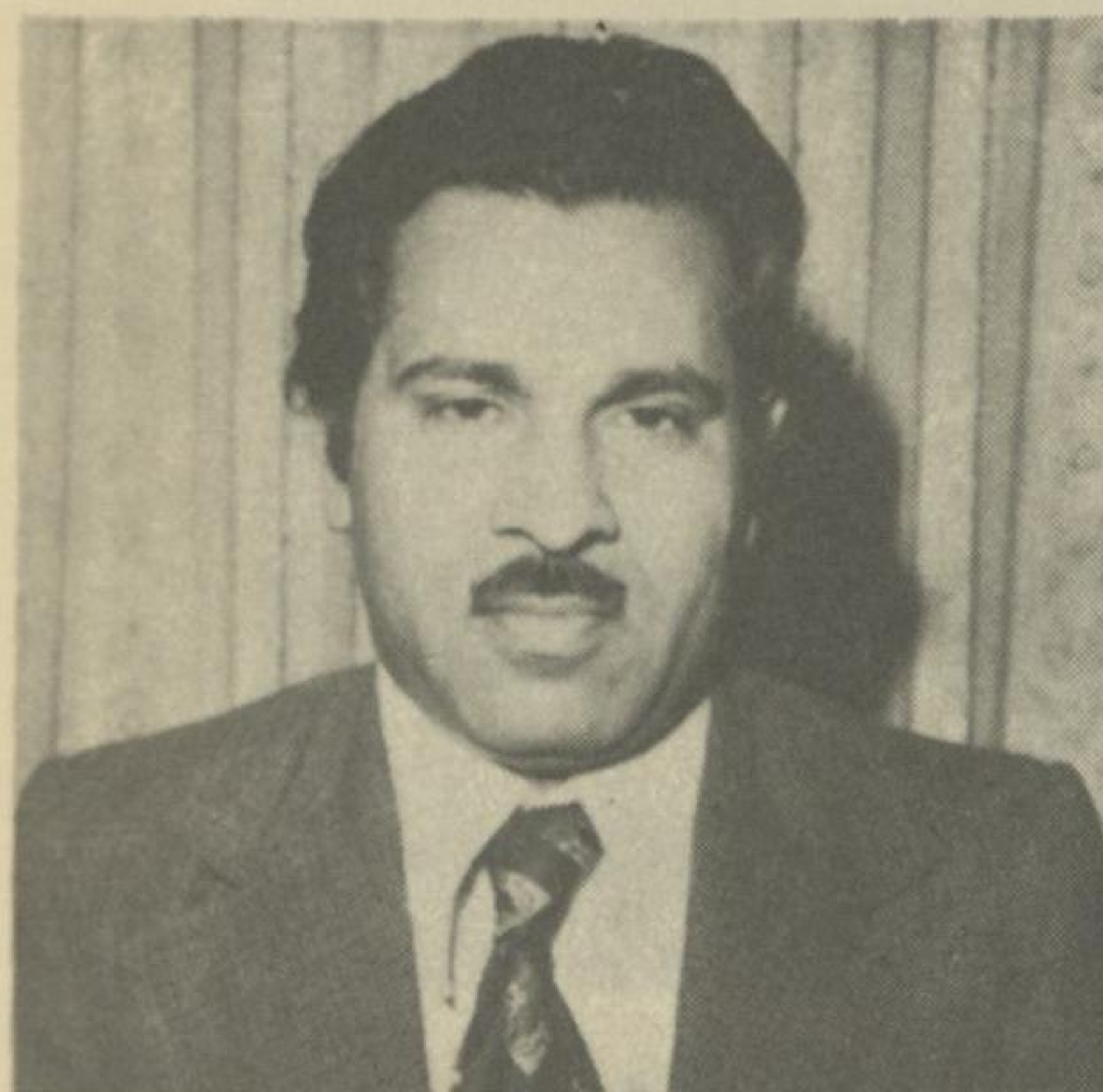
کچھ حقیقت تو ہوا کرتی تھی افسانوں میں
وہ بھی باقی نہیں اس دور کے انسانوں میں

وقت کا سیل بہا لے گیا سب کچھ ورنہ
پیار کے ڈھیر لگے تھے مرے کھلیانوں میں

شاخ سے کٹنے کا غم ان کو بہت تھا، لیکن
پھول مجبور تھے، ہنستے رہے گلدانوں میں

ان کی پہچان کی قیمت تو ادا کرنی تھی
جانتا ہے کوئی اپنوں میں نہ بیگانوں میں

سر بھی ہم پھوڑنے جائیں تو کہاں جائیں گے
کھوکھلے کانچ کے بت ہیں ترے بت خانوں میں



سلطان رشکؔ

پیدائش ۱۰ اپریل ۱۹۴۳ء، دہلی (بھارت)

ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم بالترتیب فیض الاسلام ہائی سکول اور گارڈن کالج راولپنڈی سے حاصل کی۔ ۱۹۶۴ء سے شعر و ادب کی سرگرمیوں میں باقاعدہ حصہ لینا شروع کیا ابتدا میں شعرائے قدیم کے رنگ میں شعر کہے مگر جلد ہی نئے شعری اور ادبی رجحانات کی طرف راغب ہو گئے۔

رائٹرز گلڈ کی صوبائی مجلسِ عاملہ کے کئی برس ممبر رہے۔ بہت سی ادبی انجمنوں کے عہدیدار رہے ہیں۔

"نیرنگِ خیال" جیسے عہد ساز اور وقیع جریدے کی ادارت گزشتہ تیرہ برس سے کر رہے ہیں اور اس دوران کئی گرانقدر خاص نمبر شائع کر چکے ہیں۔

سلطان رشکؔ

رنگ لائی ہے مری ذات سے غفلت میری
میرے اندر متزلزل ہے حکومت میری

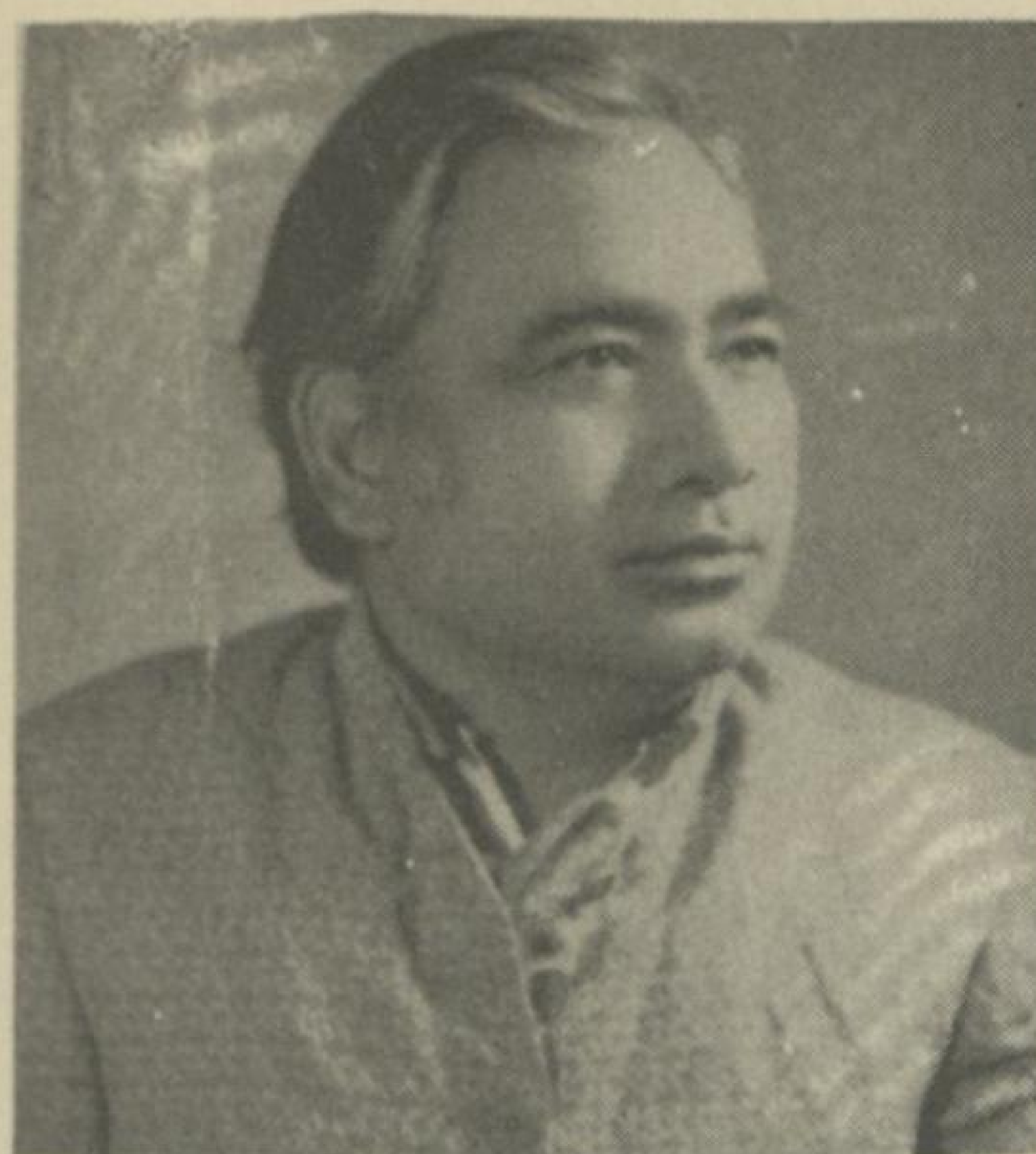
بیچتا پھرتا ہوں خود کو سرِ بازارِ حیات
مجھ کو رُسوا کئے رکھتی ہے ضرورت میری

اپنے چہرے پہ سجائے بھی نہیں زخم مگر
پھر بھی آئینہ ہوئی جاتی ہے صورت میری

ڈوبتا جاتا ہے ہر شخص سرِ ساحلِ شب
بڑھتی جاتی ہے مگر شب سے عقیدت میری

آتے جاتے ہیں مہ و مہر بشر کی زد میں
اور میں خوش کہ درخشاں ہے روایت میری

وقت ایسا کہ ہر اک قدر کا مفہوم نیا
اور بیگانۂ حالات طبیعت میری



سلیم احمد

یکم دسمبر ۱۹۲۷ء کو کھیولی ضلع بارہ بنکی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن میں بطور پروڈیوسر فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ وفاقی حکومت کی وزارت اطلاعات میں بطور مشیر ریڈیو اور ٹی وی رہ چکے ہیں۔

سلیم احمد نامور شاعر اور اعلیٰ پایہ کے نقاد ہیں، ان کی نثری و شعری تصانیف درج ذیل ہیں: ادبی اقدار، ادھوری جدیدیت، بیاض (مجموعۂ کلام) اقبال ایک شاعر نئی نظم پورا آدمی، غالب کون۔

زیر ترتیب کتابوں میں: مشرق، محمد حسین عسکری، انسان یا آدمی۔ بابائے جدیدیت اور عشق اور قحط دمشق (تنقید)

سلیم احمد

خیالِ ترکِ محبت کو آزمانے لگے
اسے بھلاؤں تو کچھ اور یاد آنے لگے

اسے سنبھال کے رکھو خزاں میں لو دے گی
یہ خاکِ لالہ و گل ہے کہیں ٹھکانے لگے

تجھے میں اپنی محبت سے ہٹ کے دیکھ سکوں
یہاں تک آنے میں مجھ کو کئی زمانے لگے

یہ اس کا جسم ہے یا ہے طلسمِ خواب کوئی
ادھر نگاہ اٹھاؤں تو نیند آنے لگے

وہ حرفِ تازہ جو گل سا کھلے کہاں سے ملے
کہ زخم بھر گئے اور درد سب پرانے لگے

نویدِ دوریٔ منزل ثبات دے مجھ کو
کہ قرب سے تو قدم اور ڈگمگانے لگے

میں بھول جاؤں تو وہ راستہ دکھانے کو
نئے چراغ سرِ رہگزر جلانے لگے

کسی بہار سے تسکینِ آرزو نہ ہوئی
جو پھول صبح کھلے شام کو پرانے لگے

وفا بھی حل ہو تو ایسا نہ ہو سلیم کہ پھر
دلِ خراب نئے مسئلے اٹھانے لگے!



سلیم کوثر

اصل نام محمد سلیم - ۱۹۴۸ء میں پانی پت ضلع کرنال (بھارت) میں پیدا ہوئے - والد کا نام عبدالمجید تھا۔ سلیم کوثر نے ملتان ڈویژن سے میٹرک اور پھر سندھ بورڈ سے اردو فاضل کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ روزنامہ "اعلان" میں بطور پروف ریڈر ملازم رہے، جس کے بعد ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۳ء تک روزنامہ "آغاز" میں کالم نگار، کاتب اور قطعہ نگار کی حیثیت سے کام کرتے رہے -

۱۹۷۴ء میں ہفت روزہ اقدام، رازداں اور نئی آواز میں بطور سب ایڈیٹر کے فرائض سرانجام دیئے -

آج کل پاکستان ٹیلی ویژن کراچی میں شعبہ اسکرپٹس سے منسلک ہیں -

سلیم کوثر

عجزِ خاکساری کیوں، فخرِ کجکلاہی کیا
جب محبتیں کی ہیں پھر کوئی گواہی کیا

ہم رتوں کے مجرم ہیں پر ہوا کی نظروں میں
تیری پارسائی کیا میری بے گناہی کیا

تم تو آنکھ والے تھے، عکس مل گیا ہوگا
میں سدا کا بے چہرہ، میرا آئینہ ہی کیا

وصل کا کوئی لمحہ رائیگاں نہیں لیکن
جو الگ نہ کرتا ہو ایسا راستہ ہی کیا

شب گزیدہ لوگوں کو نیند سے اُلجھنا ہے
رات کی مسافت میں رزمِ صبح گاہی کیا

جانے کب بگڑ جائیں، جانے کب سنور جائیں
دستِ کوزہ گر میں ہیں، اپنا آسرا ہی کیا

تم سلیمؔ شاعر ہو شہرتوں پہ مت جاؤ
مسندِ فقیری پر خبطِ بادشاہی کیا

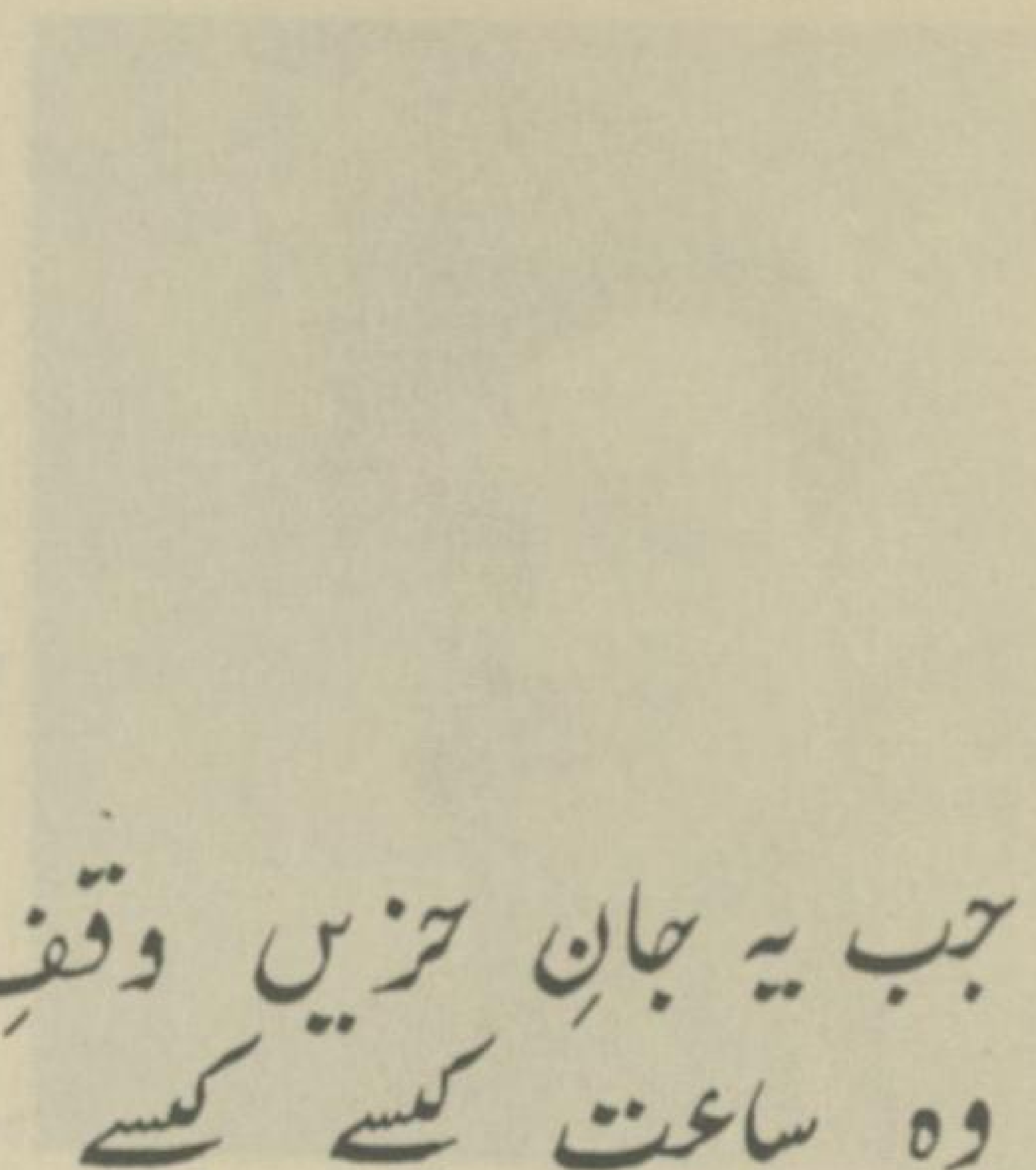


سیّد رضی ترمذی

آپ کا سنِ ولادت ۱۹۲۶ء اور مقام پیدائش لاہور ہے۔ یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور زیادہ تر قیام بھی لاہور ہی میں رہا۔

رضی ترمذی ۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر ہوئے۔ ان دنوں اسی محکمہ میں اسسٹنٹ کنٹرولر ہیں اور لاہور میں تعینات ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں آپ جاپان گئے تاکہ ٹیلی ویژن پروڈکشن کی تیکنیک سیکھ سکیں، واپسی پر ۱۹۶۹ء تک پاکستان ٹیلی ویژن سے وابستہ رہے، جس کے بعد آپ بنکاک میں سیٹو کے تحت ریڈیو ٹیلی ویژن افسر ہو کر چلے گئے اور پاکستان کی سیٹو سے علیحدگی تک وہیں مقیم رہے۔

رضی ترمذی نے اپنے شعری سفر کا آغاز غزل گوئی سے کیا لیکن بہت جلد نظم کی طرف آگئے۔ پہلے پہل ریڈیو کے لئے منظوم غنائیے اور فیچر لکھے اور پھر منظوم تمثیلات۔ منظوم تمثیلات کا پہلا مجموعہ "مثال کے طور پر" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ دو کھیل نثر میں "زندگی کی مہلت" اور "مہمان" الگ الگ کتابی صورت میں طبع ہو چکے ہیں۔



سیّد رضی ترمذی

جب یہ جانِ حزیں وقفِ آلام ہوئی
وہ ساعت کیسے کیسے بدنام ہوئی

دل میں میٹھے میٹھے درد کے پھول کِھلے
پھر یادوں کی ہوا چلی، پھر شام ہوئی

ہائے وہ کیسا خواب تھا، برسوں بیت گئے
جب سے آنکھیں کھولیں، نیند حرام ہوئی

تیری خاطر تیرا نام نہ لیتے تھے
لیکن چُپ کی بات بہت بدنام ہوئی

عشق سفر تھا تنہائی کے صحرا کا
اُن سے رسم و راہ تو دو اِک گام ہوئی

جیسے صدیوں سے اک خالی بند مکان
یوں اس شہر میں اپنی عمر تمام ہوئی

شہروں شہروں مال و زر کی چیخ پکار
درد کی دولت اک ہم کو انعام ہوئی

کون پکارے گا یوں تجھ کو، دیکھ نہ جا
دل کی اِک اِک دھڑکن تیرا نام ہوئی



سید ہاشم رضا

پیدائش ۱۶ فروری ۱۹۱۰ء۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے ایم اے پولیٹیکل سائنس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں منعقدہ امتحان میں انڈین سول سروس کے لئے منتخب ہوئے جیسس کالج (آکسفورڈ یونیورسٹی) میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک کی مدت بحیثیت آئی سی ایس پروبیشنر کے گذاری۔ اس دوران آپ سیکرٹری آکسفورڈ مجلس، صدر آکسفورڈ آئی سی ایس سوسائٹی اور صدر مسلم سوسائٹی آکسفورڈ بھی رہے۔

پاکستان آنے کے بعد پہلے آپ وفاقی دارالحکومت کے ایڈمنسٹریٹر مقرر کئے گئے ۱۹۶۱ء میں کچھ مدت کے لئے آپ مشرقی پاکستان کے گورنر بھی رہے۔ متعدد اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے بعد جن میں وفاقی حکومت کا سیکرٹری ہونا بھی شامل ہے۔ آپ ۱۹۶۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ علاوہ ازیں آپ نے بیرونی ممالک اقوام متحدہ اور دوسری کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔ آپ فیڈرل پریس کمیشن، اردو ترقی بورڈ، نیشنل سیرت کمیٹی کے ممبر اور قرآن کونسل آف پاکستان کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ ان دنوں آپ قائداعظم اکیڈیمی بورڈ آف گورنرز کے رکن ہیں۔

سیّد ہاشم رضا

وہ سب میں ہم کو بارِ دگر دیکھتے رہے
ہم ان کا انتخابِ نظر دیکھتے رہے

دامن بچا کے اشکوں سے وہ تو نکل گئے
ہم دیر تک زمیں پہ گہر دیکھتے رہے

ہم بے نیاز بیٹھے ہوئے ان کی بزم میں
اوروں کی بندگی کا اثر دیکھتے رہے

آئی سحر تو اور بڑھا بجلیوں کا زور
شب بھر ہم انتظارِ سحر دیکھتے رہے

پیہم جدھر سے تیر چلے، بجلیاں گریں
ہم آسرا لگائے کدھر دیکھتے رہے

منزل سراب بن گئی ہم جس طرف بڑھے
اک کاروانِ شعبدہ گر دیکھتے رہے

شعلوں کی زد پہ سب ہی تھے کس کو پکارتے
ہر سمت خرمنوں میں شرر دیکھتے رہے

کیا پار اتارتے ہمیں وہ ناخدا جو خود
ساحل کی عافیت سے بھنور دیکھتے رہے

کیا بزمِ دوستاں میں پڑا تفرقہ کہ آج
بدلی ہوئی ہر اک کی نظر دیکھتے رہے

انساں کی قدر گھٹ گئی ذرّے کے سامنے
کچھ کر سکے نہ اہلِ نظر دیکھتے رہے

رازِ حیات کس پہ کھلا اور کیوں کھلے
ہم آگہی کے خواب مگر دیکھتے رہے

منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے
اور شہ سوار گردِ سفر دیکھتے رہے

ہم لوگ تو اب شعری روایت سے، بالخصوص غزل کی روایت سے اتنے نا واقف ہو گئے ہیں کہ غزل کے مخصوص الفاظ، مترادف الفاظ کے معانی کا اختلاف اور ان کی دلالت کی پرچھائیاں ہماری نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئی ہیں۔ آج ادا، ناز، انداز، نخرہ، عشوہ، جلوہ کا شمار ایسے ہی الفاظ میں ہوتا ہے جن کے معانی کچھ غیر متعین سے ہو گئے یا بہ امتدادِ زمانہ دھندلا گئے ہیں۔

(سید عابد علی عابد)



سیّدہ حنا

سیّدہ سکینہ اختر نام، حنا تخلص۔ سادات امیٹھی سے تعلق ہے۔ ددھیال لکھنؤ میں تھا۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آنا ہوا۔ حنا نے پشاور یونیورسٹی سے ایم، اے (اسلامیات) اور پھر ایم، اے (اردو) کا امتحان پاس کیا۔

شعر و ادب سے لگاؤ بچپن ہی سے تھا۔ گھر کے علمی و ادبی ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ملک کے معیاری ادبی رسائل میں نگارشات چھپتی رہتی ہیں۔

ایک ناول "وہ دن، وہ راتیں"۔ اور ایک ناولٹ "تنہا اداس لڑکی" شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ "بری عورت" زیرِ طبع ہے۔ مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔

آپ ان دنوں پی اے ایف کالج سے وابستہ ہیں۔

سیّدہ حنا

سوزِ جگر بھی دیدۂ نم بھی اسی کا ہے
میری خوشی وہی میرا غم بھی اسی کا ہے

بکھرے ہوئے ہیں رنگ مری کائنات میں
ممنون کیوں نہ ہوں یہ کرم بھی اسی کا ہے

اس کی عطائے خاص تب وتابِ زندگی
دل کا گداز روح کا غم بھی اسی کا ہے

شامل ہے اس کا نام بھی ہر فردِ جرم میں
شہرِ وفا میں میرا بھرم بھی اسی کا ہے

سچّائیوں کے نام پہ جو میرے حلق سے
اترا ہے قطرہ قطرہ، وہ سم بھی اسی کا ہے

جس کی خلش رہی مجھے جاں سے عزیز تر
کیوں کر کہوں وہ خارِ الم بھی اسی کا ہے

اس کی تلاش میں ہے رواں کاروانِ زیست
جو تھک کے رہ گیا وہ قدم بھی اسی کا ہے

حرف اس کے، نطق اس کا، زبان و بیاں بھی وہ
میری بیاض، میرا قلم بھی اسی کا ہے



شاعر لکھنوی

نام حسن پاشا اور شاعرؔ تخلص۔ تاریخ پیدائش ۱۶ نومبر ۱۹۱۷ء بمقام لکھنؤ۔ آبائی وطن امیٹھی بندگی۔ میاں قطب الاقطاب حضرت بندگی نظام الدین اولیاء ثانی سے خاندانی نسبت کا شرف حاصل ہے۔

پانچ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ کوئی سرپرست نہ تھا اس لئے سلسلۂ تعلیم ترک کر کے ملازمت کرنی پڑی۔ فارسی، ہندی اور انگریزی زبان و ادب سے واقفیت رکھتے ہیں۔

۱۹۳۲ء سے باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز کیا۔ استاد شاگردی کے روایتی تعلق کے قائل نہیں اس لئے اپنے ذوقِ شعری ہی کو اپنا رہبر بنایا۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئے اور لاہور میں قیام کیا۔ جہاں ریڈیو لاہور سے باقاعدہ فیچر پروگرام بہ عنوان: "پاکستان ہمارا ہے"۔ لکھتے رہے۔

فی الوقت ادارہ ہمدرد کراچی میں ڈویژنل مینجر اسٹورز کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مجموعۂ غزل "زخمِ ہنر" طباعت کے مراحل میں ہے۔

شاعر لکھنوی

اپنی طلب کا نام ڈبونے کیوں جائیں میخانے تک
تشنہ لبی کا اک دریا ہے شیشے سے پیمانے تک

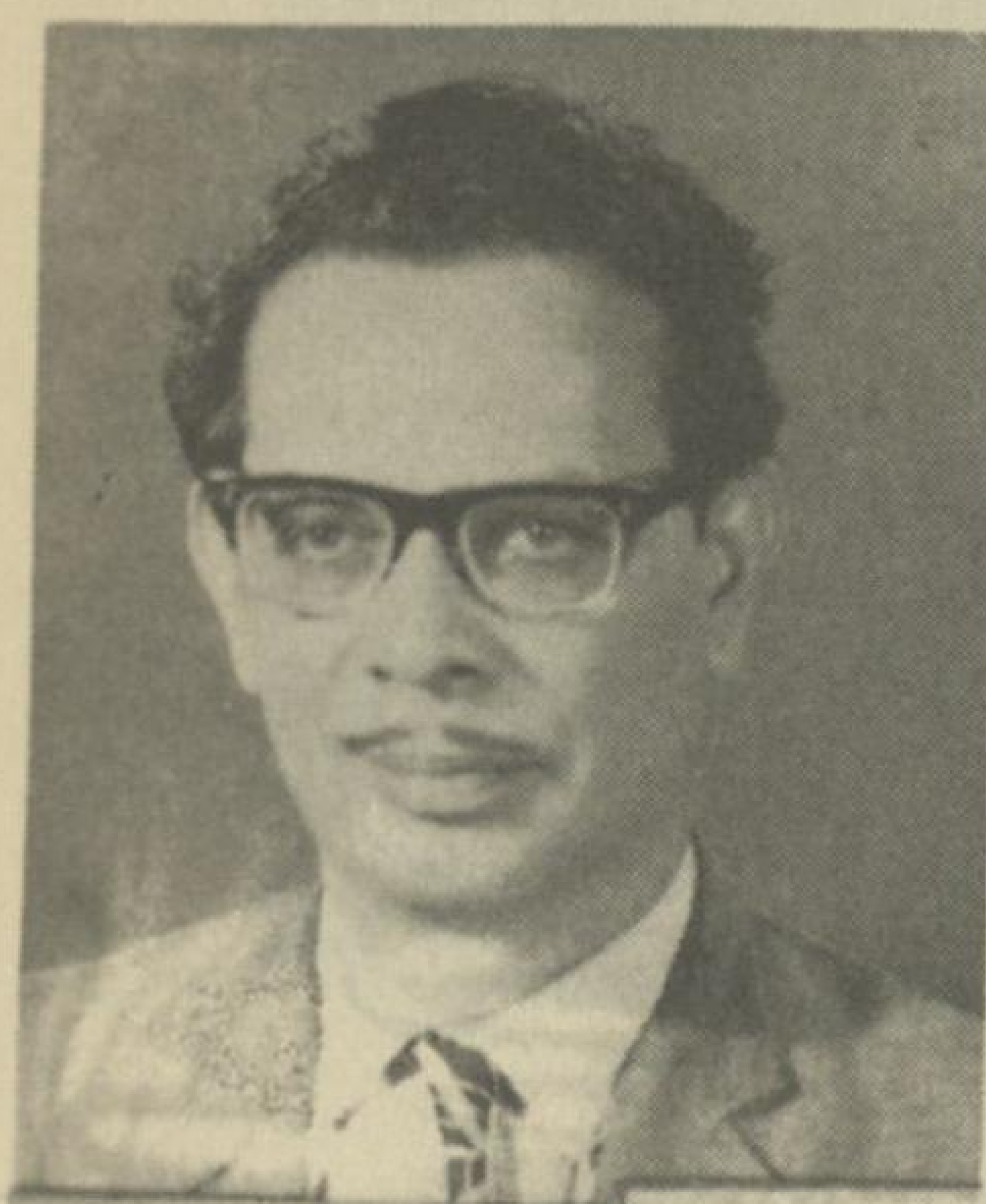
حسن و عشق کا سوزِ تعلق سمتوں کا پابند نہیں
اکثر تو خود شمع کا شعلہ بڑھ کے گیا پروانے تک

ساقی کو یہ خوش فہمی تھی، ہم تک موج نہ آئے گی
پیاس کا جب پیمانہ چھلکا ڈوب گئے میخانے تک

مٹی سے جب پھول کھلائے کارِ جنوں کی محنت نے
شہر کچھ اس انداز سے پھیلے آ پہنچے ویرانے تک

زخمِ ہنر کا رنگ سلامت، سب کو خبر ہو جائے گی
کتنے چہرے ہم نے تراشے ہاتھ قلم ہو جانے تک

اس غربت کی دھوپ میں شاعر اپنوں کا سایہ بھی نہ تھا
جس غربت کی دھوپ میں ہم کو یاد آئے بیگانے تک



شان الحق حقّی

۵ ستمبر ۱۹۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، اعلیٰ تعلیم سینٹ سٹیفنز کالج دہلی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں لندن میں ذرائع ابلاغِ عامہ کا کورس بھی مکمل کیا۔ حقّی اپنی زندگی میں متعدد ادبی، ثقافتی اور ابلاغِ عامّہ کے اداروں سے وابستہ رہے ہیں۔

قیامِ پاکستان سے قبل مترجم مانیٹر نشریات، نائب مدیر ماہنامہ "آجکل" کی حیثیت سے کام کیا اور کلکتہ میں کاپی رائٹر گرانٹ ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے متعلق رہے۔

۱۹۵۰ سے ۱۹۶۸ء کی درمیانی مدّت میں آپ مدیر اعلیٰ "ماہِ نو" کراچی و نگران مطبوعات ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ اشتہارات و مطبوعات و فلم سازی حکومتِ پاکستان اور رکن سابق انفارمیشن سروس آف پاکستان رہے۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۸ء تک بحیثیت جنرل مینجر، کنٹرولر سیلز پاکستان ٹیلی وژن خدمات انجام دیں۔ ان دنوں کراچی میں یونائیٹڈ ایڈورٹائزر کے ڈائریکٹر ہیں۔

۱۹۵۸ سے ۱۹۷۶ء تک آپ ترقی اردو بورڈ کراچی کے رکن اور معتمد بھی رہے۔ ۱۹۴۹ سے ۱۹۵۱ء کی مدّت کے لئے حلقہ اربابِ ذوق کراچی کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۸ء سے تاحال پاکستان آرٹس کونسل کی مجلس انتظامیہ کے رکن ہیں۔

آپ کی تصانیف و تالیف میں: انتخابِ ظفر، نشید حرّیت، خیابانِ پاک، انجان راہی (ترجمہ امریکی ناول)، تارِ پیراہن (منظومات) اور نکتہ راز (مضامین) کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

شان الحق حقّی

جلے گا اب نہ چراغِ ستم کہو کہ نہیں
کہیں گے ہم نہ جفا کو کرم، کہو کہ نہیں

یہ سرنوشتِ ازل ہے تو میٹ دو اس کو
کہاں کی لوح، کہاں کا قلم، کہو کہ نہیں

ابھی تو مل نہیں پایا وجود ہی کا سراغ
اجل دکھائے جو راہِ عدم، کہو کہ نہیں

اٹھا رہے ہیں وہ رسمِ جفا، کہو کہ غلط
بڑھا رہے ہیں وہ دستِ کرم، کہو کہ نہیں

وہ پھر اٹھائیں گے نکتے، کہو کہ نامنظور
وہ دینے آئیں گے پھر دل کو دم، کہو کہ نہیں

ہم آپ اس رہِ ظلمات سے نکل لیں گے
بھروگے تم نہ رفاقت کا دم، کہو کہ نہیں

بہار باغ میں آتی ہے گھیر لو اس کو
یہاں سے پھر جو اٹھائے قدم، کہو کہ نہیں

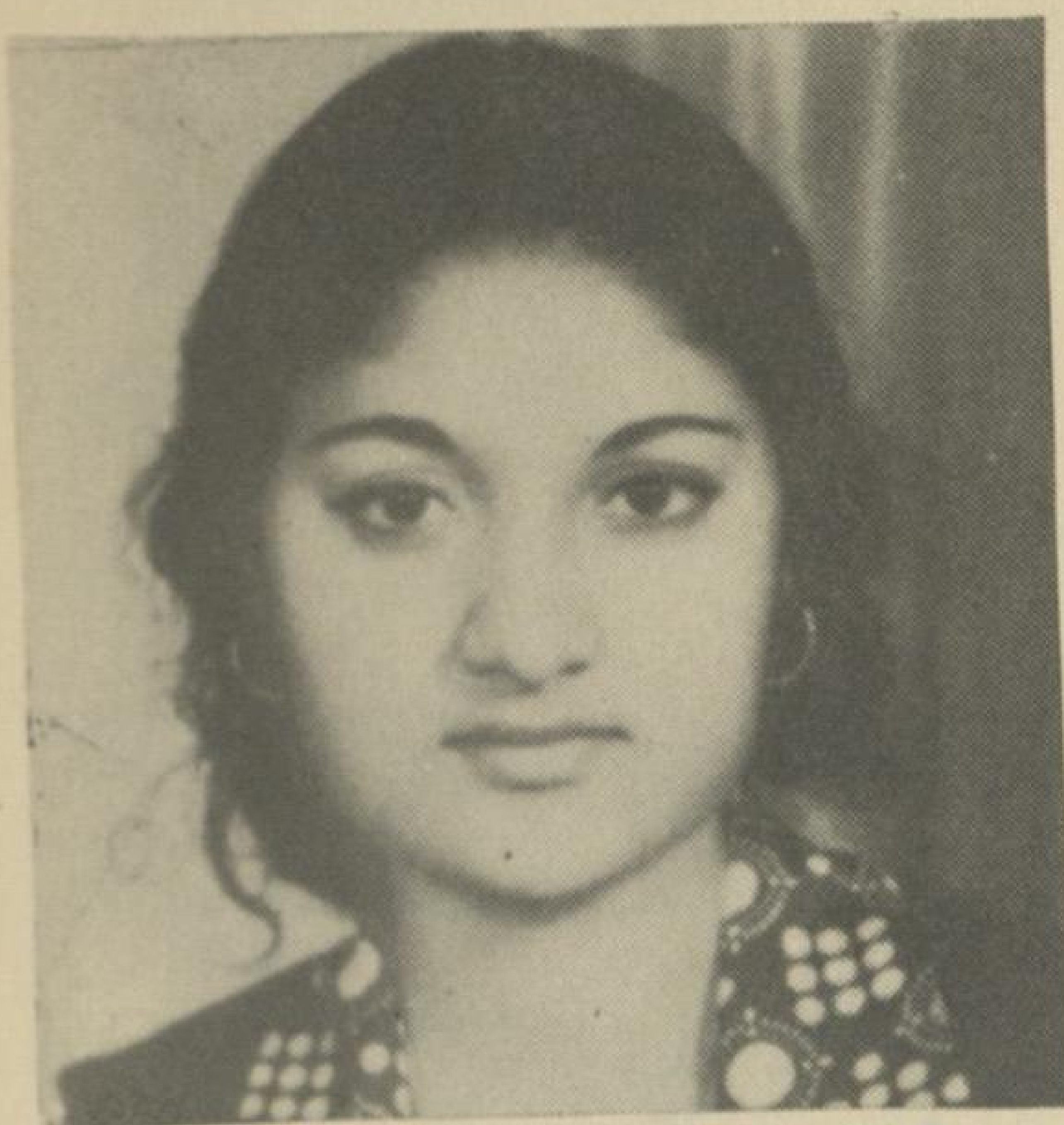
گیا دلوں سے محبت کا مان کب سے گیا
نہیں جہاں میں وفا کا بھرم، کہو کہ نہیں

نگاہِ آخرِ بسمل میں کچھ تو تھا آخر
کہ ہے تمہاری بھی آنکھوں میں نم، کہو کہ نہیں

دباؤ دہر کا مشکل ہے ٹالنا حفیؔ
تم اپنے آپ ہی سے کم سے کم، کہو کہ نہیں

غزل کی روایت بڑی ظالم چیز ہے۔ کوئی غزل گو شاعر اس سے دامن بچا کر نہیں گزر سکتا۔ لیکن اگر وہ روایت کے چنگل میں پھنس گیا تو پھر وہ انہیں باتوں کو دہرانے لگے گا۔ جو اس سے کہیں بہتر طریقے پر پرانی نسل کے شعراء کہہ چکے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسے لاتعداد شعراء ہیں جو مسلسل غزل کہہ رہے ہیں۔ لیکن ان کی غزل سُن کر یا پڑھ کر نہ صرف طبیعت مکدر ہو جاتی ہے بلکہ غزل کے باسی پن سے کفن و کافور کی بُو آتی ہے۔ برخلاف اس کے وہ غزل گو جو روایت کا شعور حاصل کر کے اسے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کے تجربات سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ ان کی غزل کی جاذبیت سُننے والوں کو پُر کیف کر دیتی ہے۔

(ڈاکٹر جمیل جالبی)



شاہدہ حسن

چٹاگانگ (سابق مشرقی پاکستان) میں پیدا ہوئیں۔ نوعمری ہی میں کراچی آ گئیں اور یہیں تعلیمی مراحل طے کئے۔ گورنمنٹ گرلز کالج کراچی سے انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد کراچی یونیورسٹی سے پہلے انگریزی ادب میں بی اے (آنرز) اور پھر ۱۹۷۵ء میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ ان دنوں کراچی میں انگریزی کی لیکچرار ہیں۔

شعر گوئی کا آغاز دورِ طالب علمی سے ہوا مگر ابتدائی کلام روایتی رنگ و آہنگ کا حامل ہے اور اُن کے آج کے شعر سے مختلف ہے۔ اس سفر کی کہانی، وہ خود یوں بیان کرتی ہیں:

"پھر بچپن کے ان میٹھے میٹھے خوابوں سے نکل کر آنکھیں
اچانک رت جگوں میں گرفتار ہو گئیں۔ اور ذہن بہت سی
نئی سوچوں کی رہ گذر بن گیا"

اب تک بڑی تعداد میں نظمیں اور غزلیں لکھ چکی ہیں۔ جن میں بیشتر کلام غیر مطبوعہ ہے۔ وقتاً فوقتاً ان کا کلام ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

شاہدہ حسن

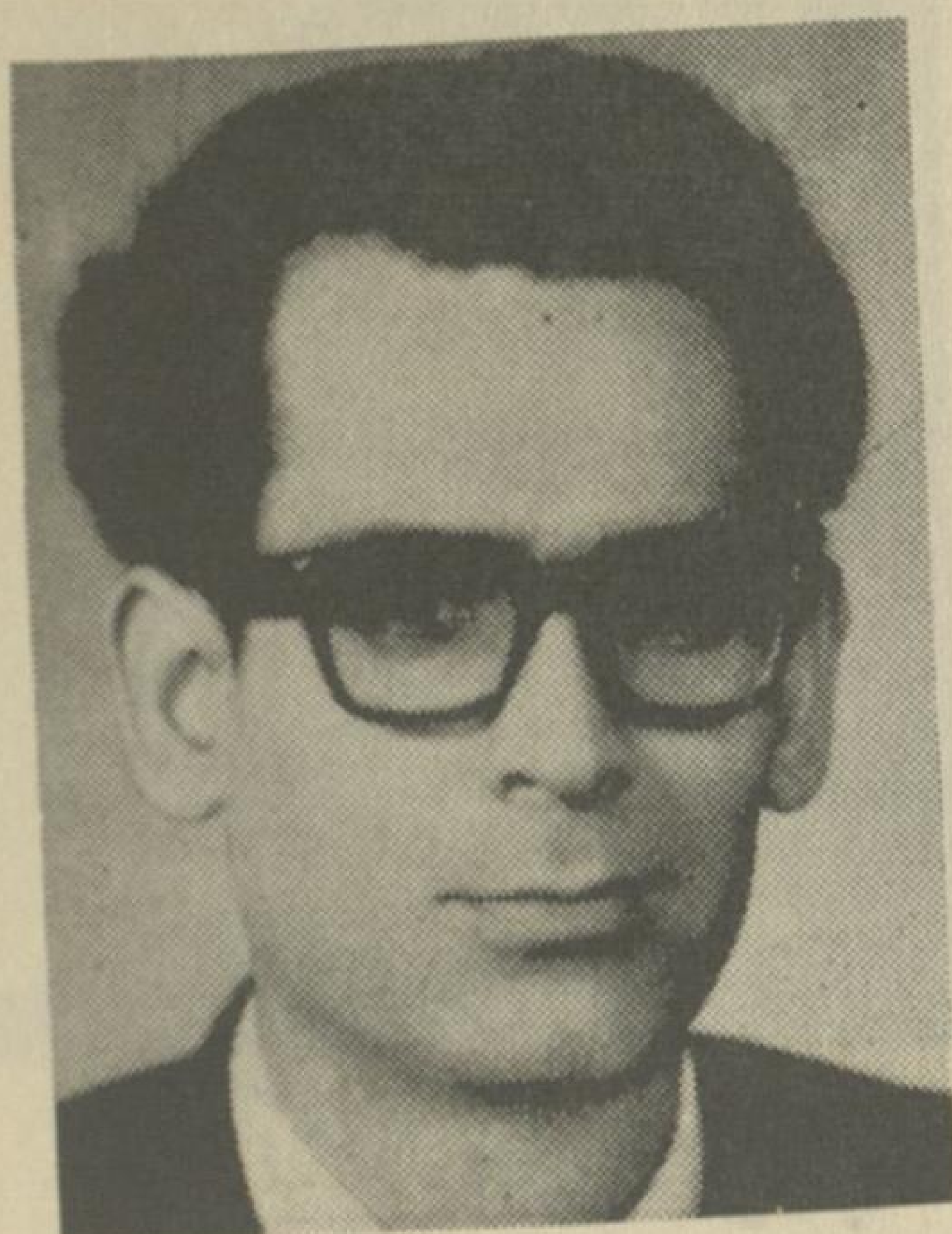
دیواروں • پر سارے سائے بوجھل ہیں
آنکھوں کی دہلیز پہ موسم جل تھل ہیں

ان دیکھے شہروں میں سانسیں اڑتی ہیں
بن سوچے یہ سارے خواب مسلسل ہیں

کس کی بات ہے کس کی راتیں کچھ تو کہو
پوچھ رہے ہیں لوگ بھی کتنے پاگل ہیں

آنکھ کھلی تو میلوں پھیل گئے رستے
شاید لوٹ کے آنے والے گھائل ہیں

اتنی زور سے بادل برسا کل کی رات
اب تک سارے چلنے والے پیدل ہیں



شبنم رومانی

اصل نام مرزا عظیم محمد بیگ چغتائی، قلمی نام شبنمؔ رومانی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۲۸ء کو شاہجہانپور (یوپی) کے ایک مغل گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ والد کا نام مرزا اظہر بیگ چغتائی تھا۔ ۱۹۴۰ء میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ان کے نانا حاجی حافظ نعمت اللہ خاں اور والدہ صدر النساء بیگم نے آپ کی پرورش کی۔ ۱۹۴۴ء میں میٹرک، ۱۹۴۶ میں انٹر کامرس اور ۱۹۴۸ء میں بریلی کالج سے بی کام کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۴۸ء میں درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں کوآپریٹوز کے اکاؤنٹنٹ اور پھر اسسٹنٹ سیکرٹری رہے۔ اسی سال ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ ۱۹۵۰ء سے اب تک مرکزی حکومت سے متعلق ہیں۔

شعر گوئی سنِ شعور سے اختیار کی۔ شاعری کے علاوہ افسانے، انشائیے، طنزیئے اور تنقید سبھی کچھ لکھا ہے۔ بچوّں کے لئے نظمیں بھی کہی ہیں۔ کئی سال سے روزنامہ "مشرق" میں ادبی کالم لکھ رہے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں شبنم رومانی کی پہلی کتاب "مثنوی سیرِ کراچی" شائع ہوئی جو بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں ان کی شاعری کا اولین مجموعہ "جزیرہ" کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ شبنمؔ ایک اشاعتی ادارے "اربابِ قلم" کے بانی اور سربراہ بھی ہیں۔

شبنم رومانی

چپ ہوں خود اپنے باب میں جیسے
آگ برسی ہو خواب میں جیسے

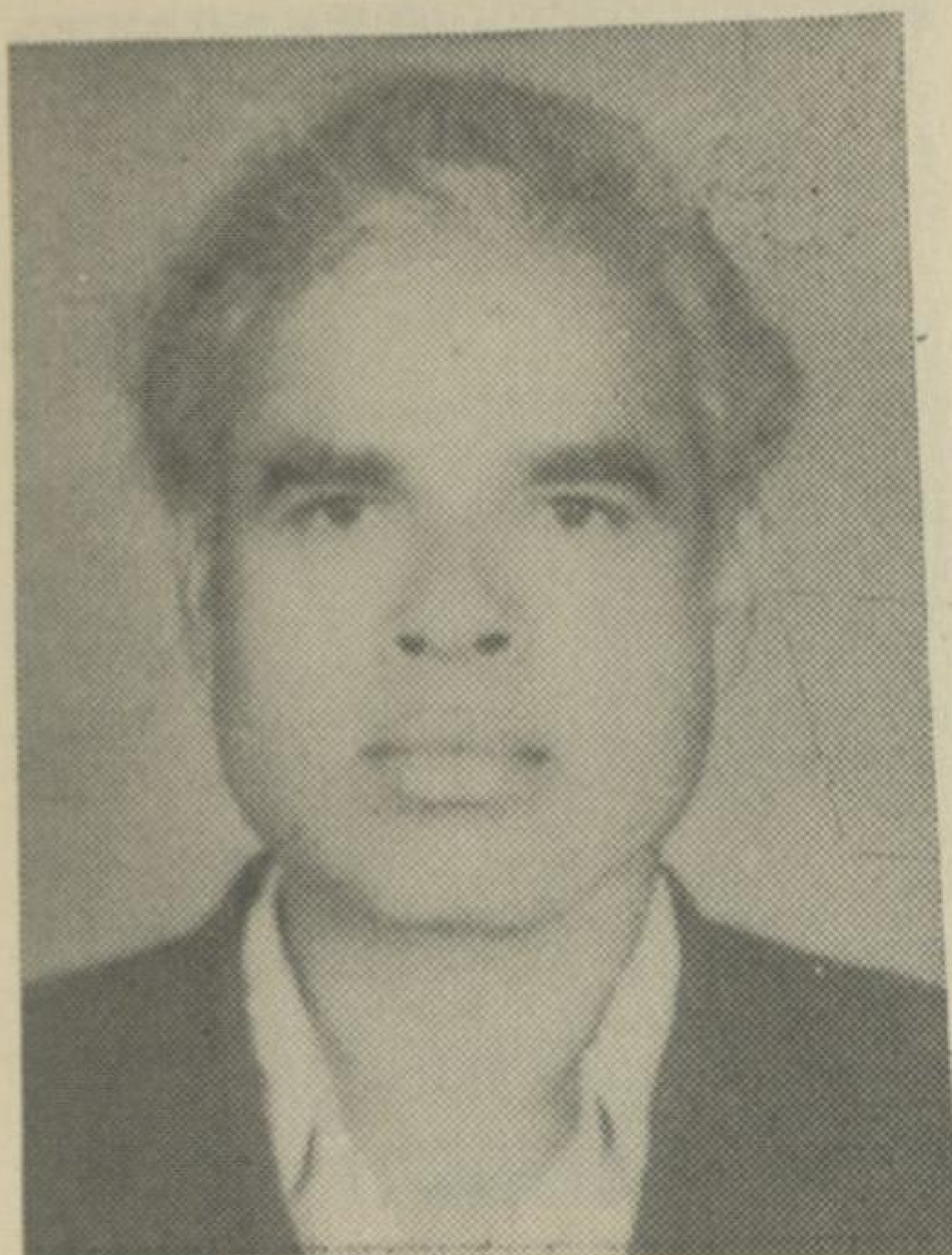
آئنہ آنسوؤں سے بھیگ گیا
عکس ہو جوئے آب میں جیسے

زندگی کا سفر، عجیب سفر
کوئی چلتا ہو خواب میں جیسے

وہ نظر، وہ نظر ہے کتنی بلیغ
سادہ کاغذ جواب میں جیسے

خواہشوں کے تراشتا ہوں بدن
روحِ آزر سحاب میں جیسے

ربط کرتا ہوں زندگی میں تلاش
غلطی ہو کتاب میں جیسے



شبیر تبسم

آپ کا اصل نام شبیر احمد خان اور تخلص تبسم ہے۔ آپ ضلع جونپور (بھارت) کے موضع "کجگاؤں" کے ایک پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بارہ بنکی میں حاصل کی۔ ۱۹۴۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں لکھنؤ میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ آزادی کے بعد پاکستان آ گئے۔ کچھ عرصہ چاٹگام (سابقہ مشرقی پاکستان) میں بسلسلہ ملازمت مقیم رہے۔ ۱۹۶۰ء سے کوئٹہ میں ہیں۔ بلوچستان یونیورسٹی سے بی اے اور پھر ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل کوئٹہ ریلوے اکاؤنٹس میں ملازم ہیں عارف رئیس اکبر آبادی سے آپ کو شرف تلمذ حاصل ہے۔

مجموعۂ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

شبیر تبسم

آ کے منزل پر بھی جو منزل سے بیگانے ملے
عشق کی راہوں میں کچھ ایسے بھی دیوانے ملے

کوئی بھی آیا نہ ہنگامِ سیہ بختی میں کام
لوگ یوں تو ہر قدم پر جانے پہچانے ملے

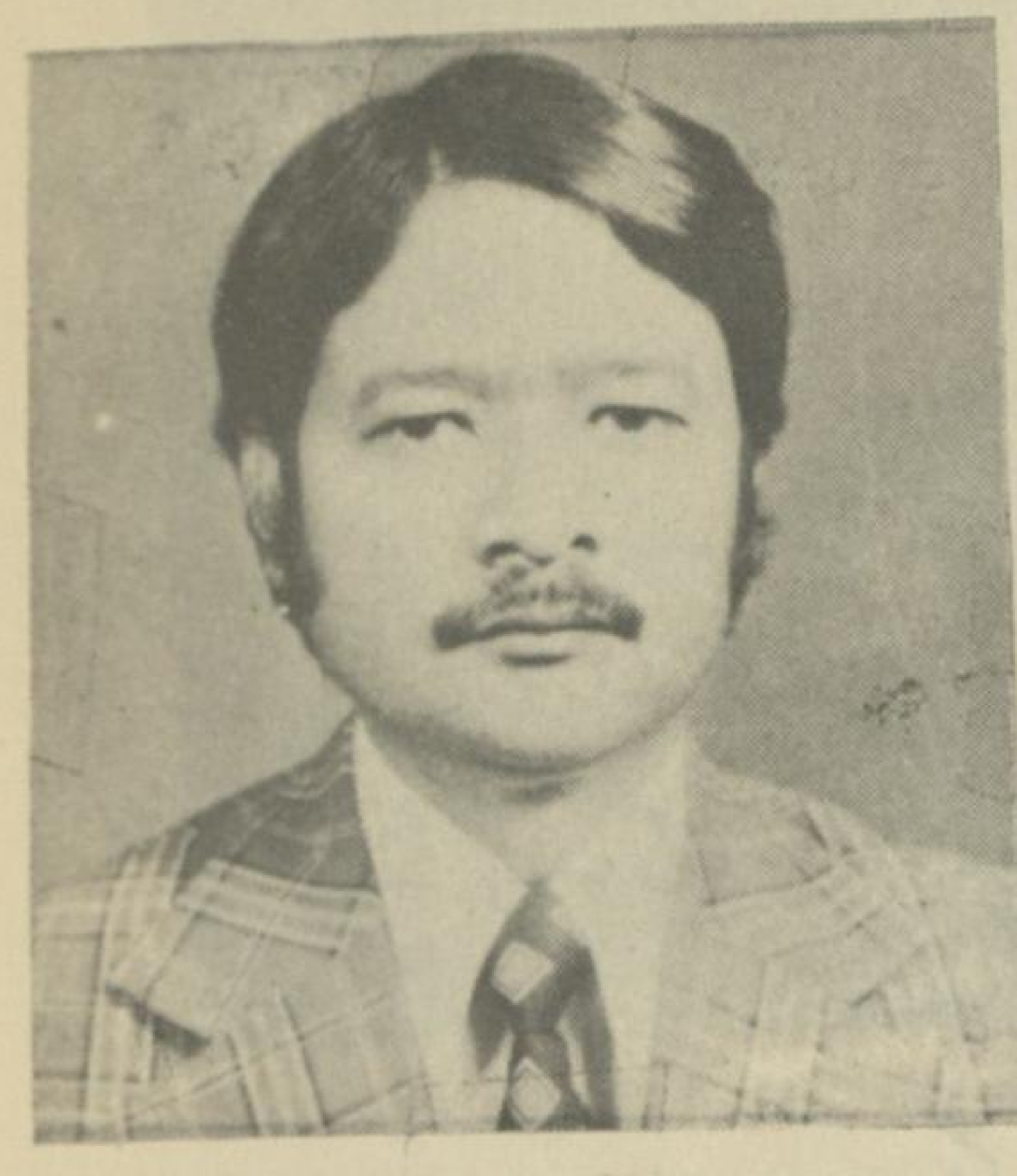
آنکھوں ہی آنکھوں میں افشا ہو گیا سب دل کا راز
لاکھ بزمِ غیر میں ہم اُن سے انجانے ملے

معتبر سمجھوں کسے۔ کس کو کہوں نا معتبر
دوستوں کے بھی یہاں غیروں سے یارانے ملے

اب کسی میں جرأتِ اظہارِ مے نوشی کہاں
شہر میں سنسان میخانے کے میخانے ملے

بیقراری۔ اشکباری۔ آہ وزاری۔ بے خودی
کیسے کیسے مجھ کو تیرے غم کے نذرانے ملے

بات کچھ تو ہے تبسم جو جنونِ عشق میں
شمع کی مانند جلتے بجھتے پروانے ملے



شبیؔ فاروقی

پورا نام محمد شعیب فاروقی اور شبیؔ تخلص۔ آپ ۵ جولائی ۱۹۴۰ء کو ضلع بنارس (بھارت) کے قصبہ گیان پور میں پیدا ہوئے۔

شبیؔ فاروقی، جامعہ کراچی سے معاشیات میں ایم اے کرنے کے بعد تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے، آپ ان دنوں گورنمنٹ سراج الدولہ کالج کراچی میں لیکچرر ہیں۔

شبیؔ، غزلوں کے علاوہ نظم، گیت اور دوہے بھی لکھتے ہیں۔

مجموعۂ کلام زیرِ ترتیب ہے۔

شبّی فاروقی

اتنا احسان اور کرتا کون
مجھ سے بڑھ کر مجھے سمجھتا کون

دین و دنیا سے ماورا تھا میں
میری باتوں پہ کان دھرتا کون

میں نہ ہوتا تو یوں لبِ دریا
آبرو تشنگی کی رکھتا کون

جو کسی نے لکھا نہیں وہ حرف
میں نہ لکھتا تو اور لکھتا کون

کھوٹ مجھ میں تو سب نے دیکھ لیا
اپنا سونا مگر پرکھتا کون

جس کی منزل ہو خوابِ دربستہ
اس مسافر کے ساتھ چلتا کون

آئنہ اپنے رو بہ رو رکھ کر
میں نہ ہنستا تو مجھ پہ ہنستا کون



شفیع منصور

۱۲ مئی ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ میں زندگی کا ابتدائی زمانہ گذرا۔ تقسیم ملک سے پہلے، بسلسلہ ملازمت دہلی اور شملہ میں ایک عمر بسر کی۔ شملہ کی ادبی زندگی میں بھرپور حصّہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی آ گئے۔ یہاں افواجِ پاکستان کے شعبۂ ترجمہ و تالیف کے سربراہ کی حیثیت سے رہے۔ اس ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد، تدریس کے پیشہ کو اپنایا۔ ان دنوں سرسید پبلک اسکول کے پرنسپل ہیں۔

غزل گوئی کے علاوہ ان کو لفظی و لسانی مسائل سے خاص لگاؤ ہے۔ "عمرِ رائیگاں" کے نام سے غزلوں کا انتخاب کر چکے ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوا۔ ان کی دوسری غیر مطبوعہ تصنیف "مسئلہ رسم الخط" ہے۔ طبیعت میں حسِّ مزاح بہت ہے۔ ورنہ دو سو سے زائد غزلیں کہنے والا شاعر کبھی یوں نہ کہتا:

"شعر گوئی کا ذوق طالب علمی کے ابتدائی مراحل میں ہے زندگی کے ہر دور میں شعر پڑھتا رہا ہوں، سنتا رہا ہوں اور کہتا رہا ہوں۔ لیکن چھپنے کا شوق کبھی نہیں ہوا۔ تصویر ایسی دیدی ہے کہ عمر صیغۂ راز میں نہ رہے میری تازہ ترین تصویر یہی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا ہی ایک شعر یاد آ گیا ہے:

پڑی ہے اس پہ گردِ عمر کتنی
مرا چہرہ نظر آتا کہاں ہے"

شفیع منصور

کوئی موتی سرِ ساحل نہیں لانے دیتا
دل بھنور ہے، مجھے تہ تک نہیں جانے دیتا

دیدہ و دل کو تو آواز کہاں سے ملتی
لبِ گویا ہی مجھے شور مچانے دیتا

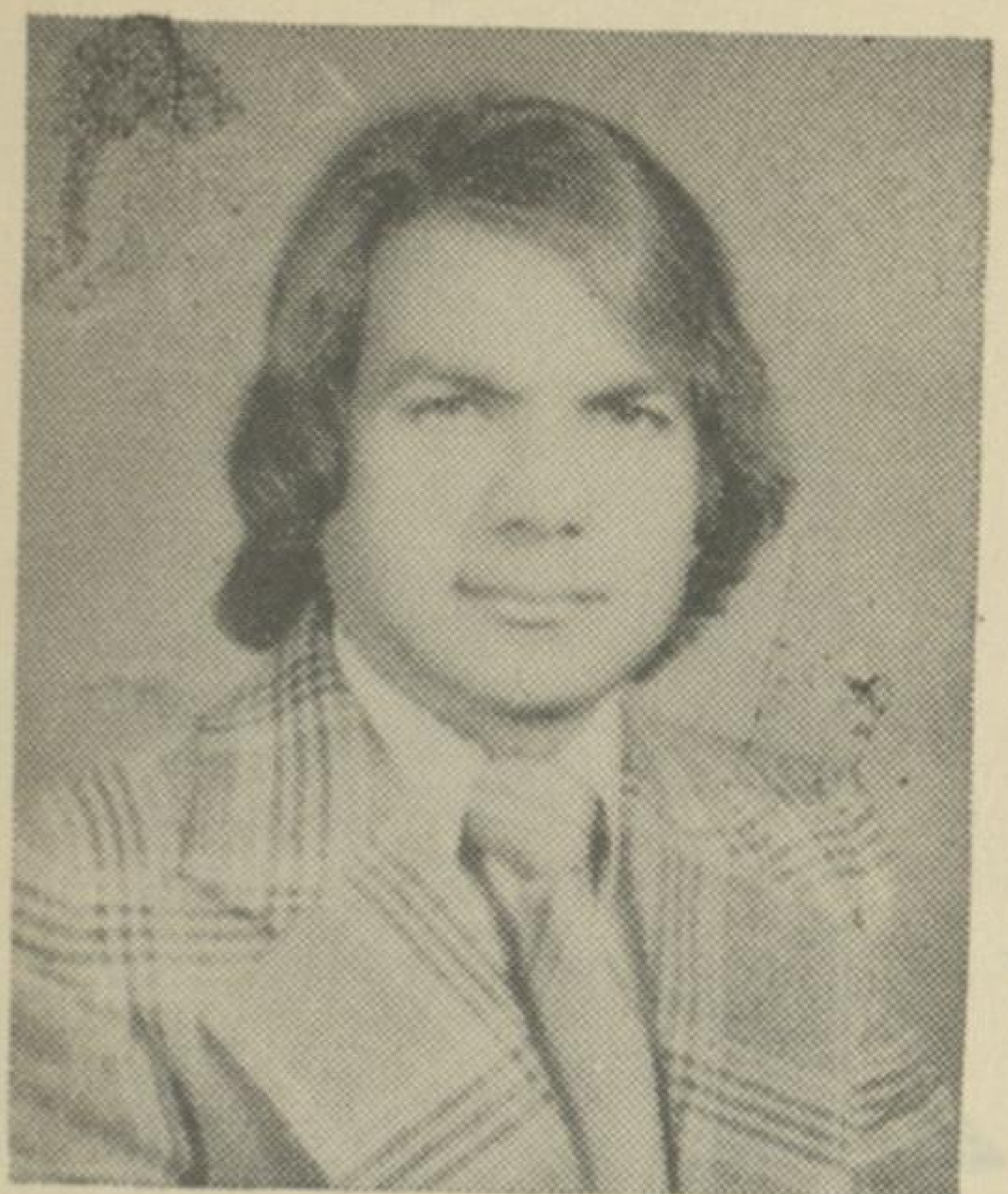
گھر سے نکلوں تو وہی شہرِ خموشاں دیکھوں
در بھی دیوار ہے باہر نہیں جانے دیتا

اے جنوں! وسعتِ مشرب میں تو ہے نام ترا
اپنے صحرا کو ذرا شہر میں آنے دیتا

طول کھینچے کوئی لمحہ تو ابد تک پہنچے
عشق زندہ مجھے اب اور زمانے دیتا

اے زمیں خاک مری تجھ سے ہم آغوش ہوئی
بس میں ہوتا تو کئی اور خزانے دیتا

ہے مرا اپنا ارادہ بھی سفر کا منصورؔ
ورنہ یاروں کو بہت دور نہ جانے دیتا



شفیق سلیمی

محمد شفیق سلیمی ۵ نومبر ۱۹۴۱ء پریت نگر (ویرو کے) امرتسر میں پیدا ہوئے
بی۔کام (آنرز) تک تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ آپ کا مجموعۂ کلام
زیر طبع ہے۔ آپ نے گارمنٹس کارپوریشن اور دیگر اداروں میں ملازمت کی، اردو اور
پنجابی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ آج کل آپ لاہور میں مقیم ہیں۔

شفیق سلیمی

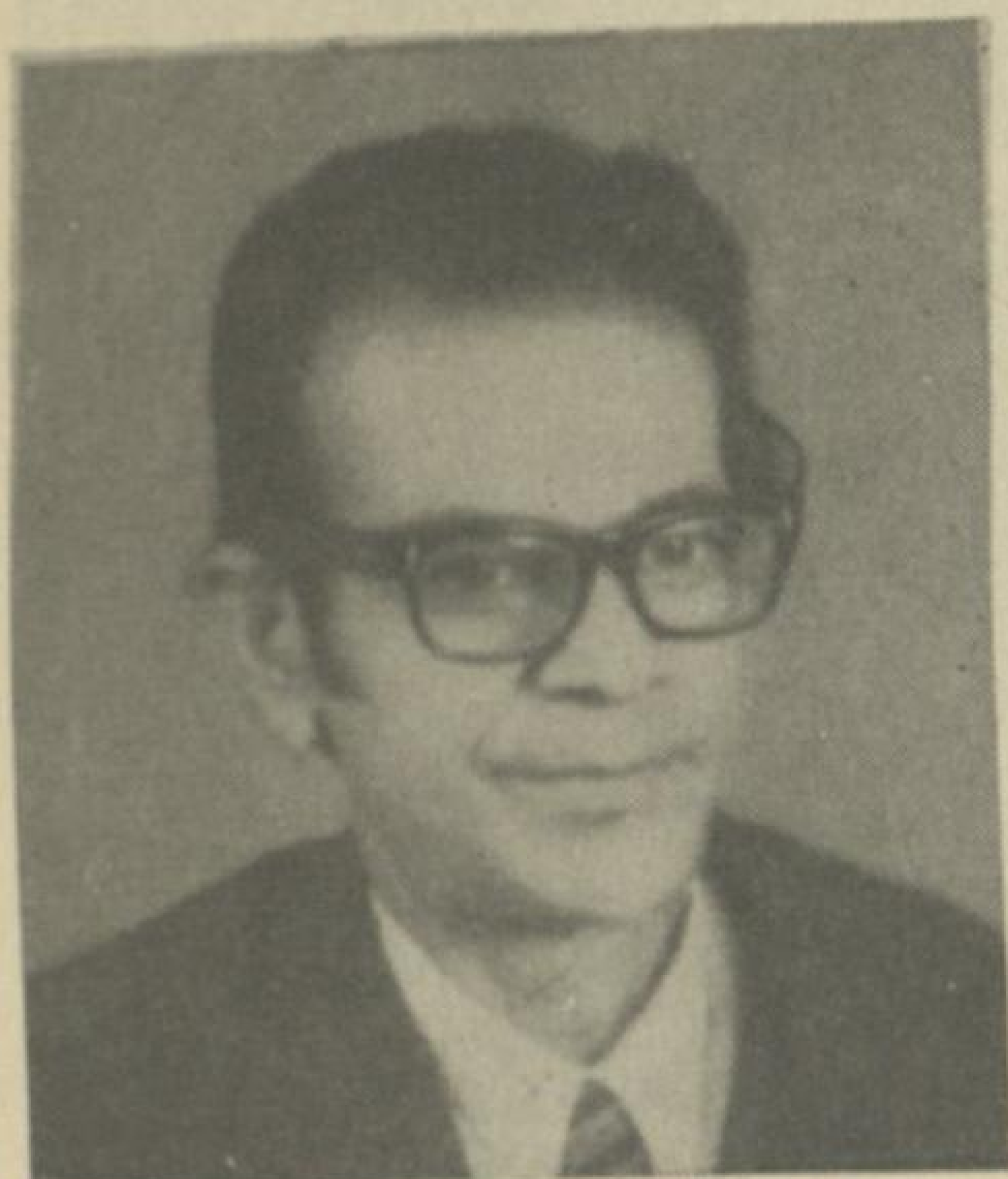
بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لَوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

کیسا تھا وہاں گرم دوپہروں میں جُھلسنا
برسات رُتوں کا یہ نگر کیسا لگا ہے

دن میں بھی دہل جاتا ہوں آباد گھروں سے
سایا سا مرے ساتھ یہ ڈر کیسا لگا ہے

ہونٹوں پہ لرزتی ہوئی خاموش صدا کا
آنکھوں کے دریچوں سے گزُر کیسا لگا ہے

آنگن میں لگایا تھا شجر چاؤ سے میں نے
پھلنے پہ جو آیا تو ثمر کیسا لگا ہے



شکیل احمد ضیاءؔ

شکیل احمد نام اور ضیاءؔ تخلص۔ آپ کی ولادت ۲۵ دسمبر ۱۹۲۱ء کو جھانسی (بھارت) میں ہوئی۔ والد کا نام ناصر علی تھا جو شیخ الہند محمود الحسن (اسیرِ مالٹا) کے بھتیجے تھے۔

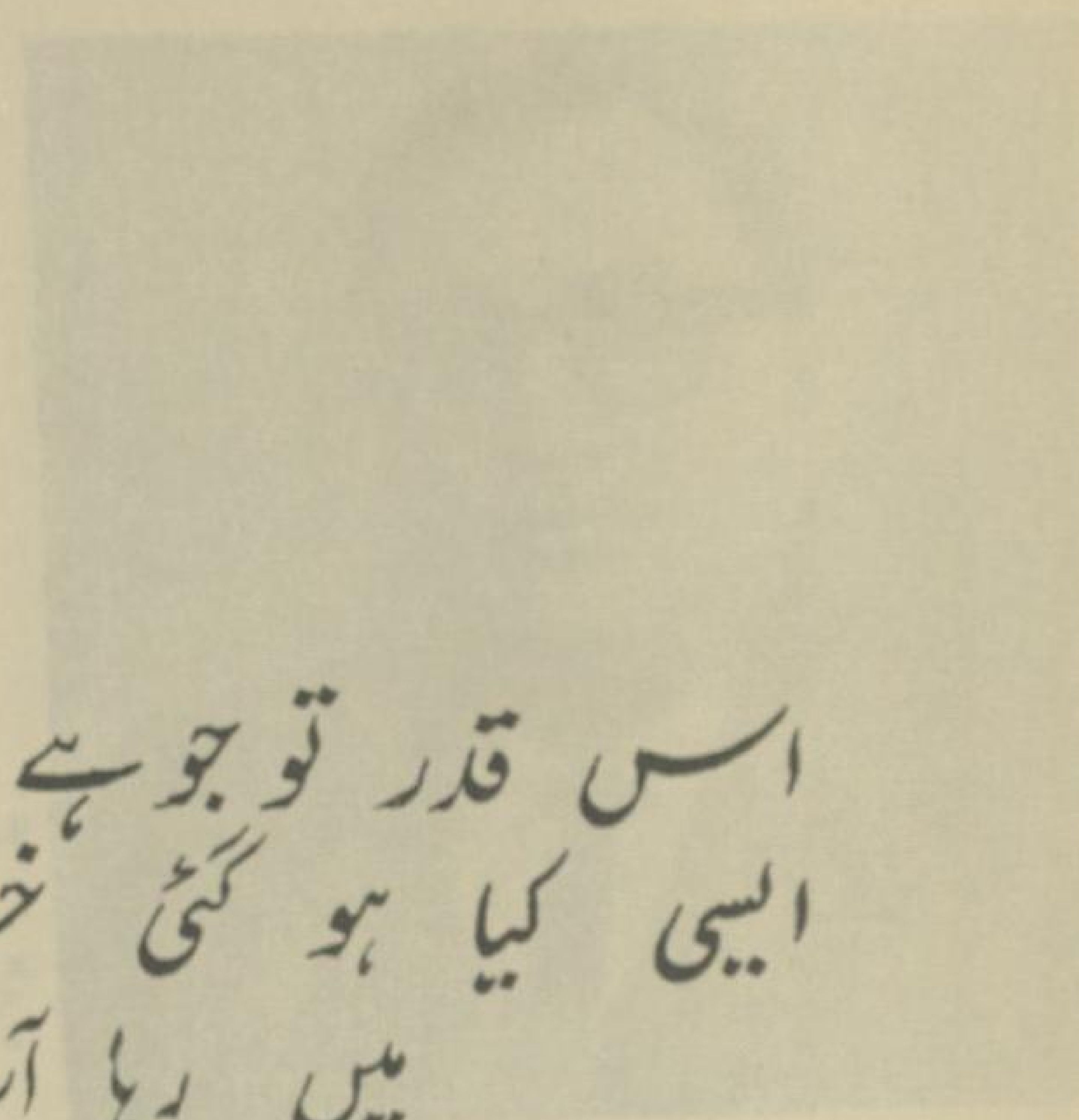
ضیاءؔ نے انیس برس کی عمر میں بی اے آنرز کیا۔ اس کے علاوہ علومِ شرقیہ کے متعدد امتحانات جن میں ہندی اور سنسکرت کے امتحان بھی شامل ہیں، پاس کئے۔

شکیل احمد ضیاءؔ کو حسرت موہانی سے شرفِ تلمذ حاصل رہا ہے۔

"گیت مالا" کے نام سے آپ کے گیتوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ "لمعۂ طور" ۱۹۴۲ء میں، تیسرا مجموعہ "توریتِ عجم" ۱۹۴۴ء میں اور چوتھا مجموعہ کلام "موجِ گُل" کے نام سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔

پانچواں مجموعہ "شعلۂ رنگ" مرحلۂ طباعت میں ہے۔

شکیل احمد ضیاؔ



اس قدر تو جو ہے خفا مجھ سے
ایسی کیا ہو گئی خطا مجھ سے

میں رہا آپ کے خیال میں گم
وقت آگے نکل گیا مجھ سے

عشق اس دور میں کہاں ممکن
معجزہ تھا، کہ ہو گیا مجھ سے

اس طرح بھی نہ دیکھئے، گویا
تھا، کبھی کوئی واسطہ مجھ سے

جسم کو ذہن تک رسائی دے
کیوں رہے کوئی فاصلہ مجھ سے

آج خاموش ہوں، مگر اک دن
ہو گی منسوب ہر صدا مجھ سے

جس نے سب کچھ بھلا دیا وہ بھی
پوچھتا ہے مرا پتہ مجھ سے

کیا گلہ اس کی بے رُخی کا ضیاؔ
اس نے سیکھی ہے یہ ادا مجھ سے



شوکت واسطی

اصل نام صلاح الدین ، ادبی نام شوکت واسطی۔ وطن شاہ آباد ضلع کرنال (بھارت)۔ قیام پاکستان کے بعد پشاور میں آباد ہوئے۔ گارڈن کالج راولپنڈی اور ایڈورڈ کالج پشاور میں تعلیم حاصل کی، پھر صوبۂ سرحد میں محکمۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ تیس ۳۰ برس کی ملازمت کے بعد چیئرمین ٹیکسٹ بک بورڈ صوبہ سرحد کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

شاعری میں عبدالحمید عدم کے شاگرد ہیں۔ ادبی اعتبار سے بڑی بھرپور زندگی گذاری کئی ادارے بنائے، بڑے بڑے ادبی جلسے اور مشاعرے برپا کیے۔ اب ادارہ علم و فن پاکستان کے تنظیم کار کی حیثیت سے، علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

تاریخ اور شعر و ادب میں نظم و نثر کی متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ حال ہی میں ملٹن کی شہرہ آفاق رزمیہ نظم کا مکمل منظوم ترجمہ "فردوس گم گشتہ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کرسٹوفر مارلو کے "ڈاکٹر فاؤسٹ" کا منظوم مقفیٰ ترجمہ طباعت کے مراحل میں ہے۔

شوکت واسطی

بکھرے تو پھر بہم مرے اجزا نہیں ہوئے
سرزد اگرچہ معجزے کیا کیا نہیں ہوئے

جو راستے میں کھیت نہ سیراب کر سکے
کیوں جذب دشت ہی میں وہ دریا نہیں ہوئے

انسان ہے تو پاؤں میں لغزش ضرور ہے
جرمِ شکستِ جام بھی بے جا نہیں ہوئے

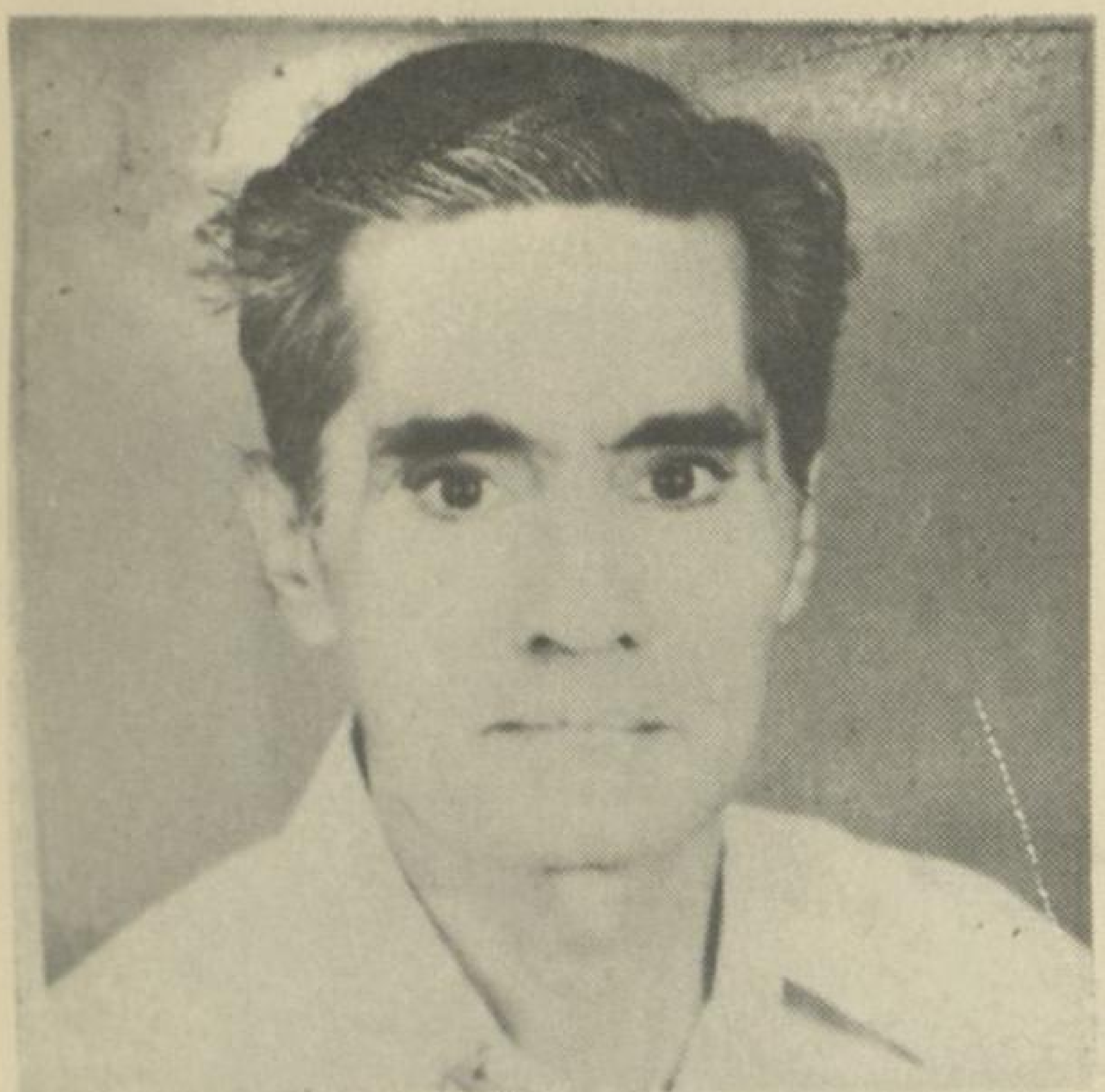
ہم زندگی کی جنگ میں ہارے ضرور ہیں
لیکن کسی محاذ سے پسپا نہیں ہوئے

انساں ہیں اب تو، مدتوں ہم دیوتا رہے
شکلیں نہیں بنیں جو ہیولیٰ نہیں ہوئے

ٹھہرو ابھی یہ کھیل مکمل نہیں ہوا
جی بھر کے ہم تمہارا تماشا نہیں ہوئے

ہر سر سے آسمان کی چھت اٹھ نہیں گئی
کب تجربہ میں شہر یہ صحرا نہیں ہوئے

شوکتؔ دیارِ شوق کی رونق انہی سے ہے
جو لوگ اپنی ذات میں تنہا نہیں ہوئے



شہرت بخاری

سید محمد انور بخاری نام اور شہرت تخلص ہے۔

شہرت ۲ دسمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ آبائی وطن راجپوتانہ ریاست جے پور تھا۔ بعد میں ان کے اہلِ خاندان لاہور آکر آباد ہوئے۔

شہرت نے اردو اور فارسی میں ایم۔اے کیا۔ آج کل اسلامیہ کالج میں صدر شعبۂ اردو و فارسی ہیں۔

"طاقِ ابرو" کے نام سے پہلا شعری مجموعہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعۂ کلام" دیوارِ گریہ" بھی شائع ہو چکا ہے۔ نثری سرگزشت "کھوئے ہوؤں کی جستجو" زیرِ طبع ہے۔

شہرت بخاری

دل سے پوچھو کہ یہ حسرت کشِ ساماں کیوں ہے
جس جگہ غم کا گزر ہے وہ بیاباں کیوں ہے

جو قیامت بھی گزرتی ہے گزر جانے دو
دعوائے عشق کیا ہے تو پشیماں کیوں ہے

مرا دنیا سے تعلق! کہ توقع رکھوں
تو مری جان ہے تو مجھ سے گریزاں کیوں ہے

صرف جس سے تری پہچان تھی اے آئنہ رو
میں وہی سنگِ مقدّر ہوں تو حیراں کیوں ہے

اتنا شہرہ ہے تری خوش سخنی کا لیکن
جو تری بزم سے آیا ہے ہراساں کیوں ہے

اب نہ وہ حرف و حکایت نہ وہ انداز و ادا
دردمندوں کو وگرنہ سرِ درماں کیوں ہے

نیند اتنی ہے کہ سنبھلا نہیں جاتا ہے اب
بے اثر آج فسونِ شبِ ہجراں کیوں ہے

صحبتِ دل زدگاں میں کبھی آؤ تو کھلے
مرحلہ جی سے گزر جانے کا آساں کیوں ہے

مرے مالک نے سدا میرا بھرم رکھا ہے
پھر یہ شہرت، دلِ دیوانہ پریشاں کیوں ہے



شہزاد احمد

۱۶ر اپریل ۱۹۳۲ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے (نفسیات) اور پھر ایم۔ اے (فلسفہ) کی ڈگریاں حاصل کیں۔

۱۹۵۸ء میں تھل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔

۱۹۵۹ء میں کیپٹیل انڈسٹریز لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ سات برس کی ملازمت کے بعد ۱۹۶۶ء میں شہزاد احمد پاکستان آرٹس کونسل سے متعلق ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں پاکستان ٹیلی ویژن میں آئے، مگر ایک سال بعد ہی دوبارہ کیپٹیل انڈسٹریز لاہور واپس چلے گئے۔ ۱۹۷۵ء سے آج تک روٹی کارپوریشن آف پاکستان میں فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

آپ کی تصانیف میں چار مجموعے صدف، جلتی بجھتی آنکھیں، ادھ کھلا دریچہ اور مذہب، تہذیب، موت شامل ہیں۔

شہزاد احمد

دھیان اُس کا مرے ذہن سے جاتا نہیں پھر بھی
اس شہر سے باقی کوئی ناطہ نہیں پھر بھی

بادل کی طرح توڑ دیا خاک سے رشتہ
سورج مجھے سینے سے لگاتا نہیں پھر بھی

آتی ہے ہر اک سمت سے آواز اُسی کی
میں اس کو کہیں ڈھونڈنے جاتا نہیں پھر بھی

معلوم ہے دنیا مری حالت پہ ہنسے گی
میں حالِ دلِ زار چھپاتا نہیں پھر بھی

شب ڈھل گئی اور شہر میں سورج نکل آیا
میں اپنے چراغوں کو بجھاتا نہیں پھر بھی

ٹکراتا ہے، سر پھوڑتا ہے سارا زمانہ
دیوار کو رستے سے ہٹاتا نہیں پھر بھی

تنہائی کے دکھ جھیل رہا ہوں تیرے ہوتے
دریا میں ہوں اور پیاس بجھاتا نہیں پھر بھی

یاد آئے جسے دیکھ کے شہزاد بہت کچھ
وہ کون ہے یہ ذہن میں آتا نہیں پھر بھی



شیر افضل جعفری

شیر محمد افضل نام ۔ ادبی نام شیر افضل جعفری ہے ۔یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء کو پیدا ہوئے ۔ والد کا نام میاں احمد بخش احمد تھا جو قوم چغتائی سے تعلق رکھتے تھے اور جھنگ سیال ان کا وطن تھا۔شیر افضل جعفری ابھی چھ برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، آپ کی والدہ نے تکلیفیں جھیل کر آپ کو تعلیم دلوائی۔میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد پہلے جے، وی کیا اور اس کے بعد ایس وی کی سند حاصل کی۔تین برس تک استاد رہے۔جس کے بعد کمپلسری ایجوکیشن آفیسر ہو گئے۔تینتالیس سال ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۶۸ء میں ریٹائر ہوئے۔ پنشن کے علاوہ حکومت کی طرف سے وظیفہ بھی مقرر ہے۔

اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے شاعر و ادیب ہیں۔شیر افضل جعفری ایک بالکل منفرد اندازِ سخن کے مالک ہیں۔شاعری کا ایک مجموعہ "سانولے من بھانولے" شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ دو۲ مجموعے زیرِ طبع ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور کتابیں نظم کی اور ایک صحیفہ نثر کا ترتیب کی منزل سے گزر رہا ہے۔

شیر افضل جعفری

دمِ وجدان دیپک گا رہا ہوں
ستارے بانگ سے برسا رہا ہوں

رچی ہے سوچ میں یزداں کی خوشبو
غزل پر کیوڑا ٹپکا رہا ہوں

زمین و آسماں کے راستوں پر
فرشتوں کی طرح آ جا رہا ہوں

غمِ عشقِ الٰہی سے غزل کی
زمیں کو آسماں فرما رہا ہوں

عروسِ ذات کے چہرے سے گھونگھٹ
نمازِ شام میں سرکا رہا ہوں

سُلگتی آرزوؤں کے دھوئیں سے
مشامِ بندگی مہکا رہا ہوں

زمینِ ہیر پر سجدے بچھا کر
زلیخاؔ کی جوانی لا رہا ہوں

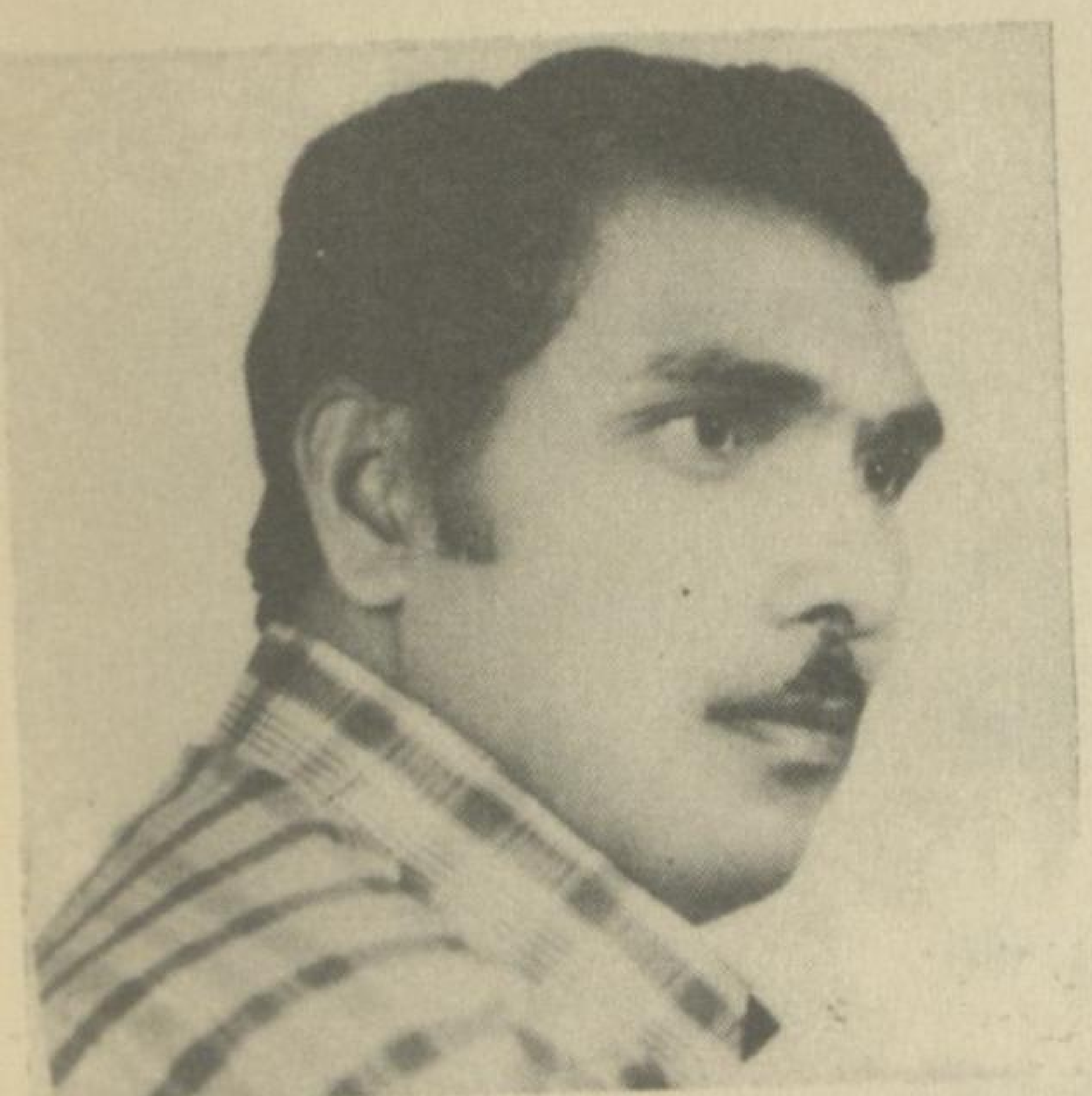
ٹھکورے پر خوشی کی ہچکیوں کے
غمِ ایّام کو رقصا رہا ہوں

جنازہ جنج ہو جائے گا میرا
اجل کو چوڑیاں پہنا رہا ہوں

رسولِ پاک کا دیدار ہو گا
خدا کی بارگہ میں جا رہا ہوں

غزل اردو شاعری کا شاہکار ہے لیکن شاعری کی معراج نہیں، غزل محبت کی داستاں ہے لیکن طاؤس ورباب کے ساتھ شمشیروسناں کے حسن کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ غزل کی بہترین قسم عاشقانہ ہے لیکن محدود خیالات کے الٹ پھیر کو مآلِ زندگی سمجھتی ہے۔ اس کا آرٹ تلوار کی دھار کا آرٹ ہے۔

(جابر علی سیّد)



صابر آفاقی

چوہدری احمدالدین نام ۔ صابر آفاقی قلمی نام ہے ۔ آپ ۹ مارچ ۱۹۳۳ء کو مظفرآباد (آزاد کشمیر) کے ایک گاؤں گوہاڑی میں تولد ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد چوہدری محمد علی سے حاصل کی ۔

پہلے مولوی فاضل ، پھر اردو اور فارسی میں ایم اے کیا ۔ ۱۹۶۸ء میں ایران گئے اور پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی ۔

۱۹۵۲ء سے محکمۂ تعلیم سے منسلک ہیں ، پہلے مدرس تھے ۔ پھر انسپکٹر آف سکولز ہو گئے ۔ آج کل مظفرآباد کالج میں صدر شعبۂ اردو ہیں ۔

راج ترنگنی ، گل ہائے کشمیر ، پھل کھیلی ، حسین ابن منصور ، اقبال اور کشمیر آپ کی مطبوعہ تصانیف ہیں ۔

مجموعۂ کلام "شہرِ تمنّا" حال ہی میں شائع ہوا ہے ۔

صابرؔ آفاقی

جو بُوئے زندگی مجھے کرن کرن سے آئی ہے
حقیقتاً وہ آپ ہی کے پیرہن سے آئی ہے

ہمارے جسم و روح کو سرور دے گئی وہی
نسیمِ خوش گوار جو ترے بدن سے آئی ہے

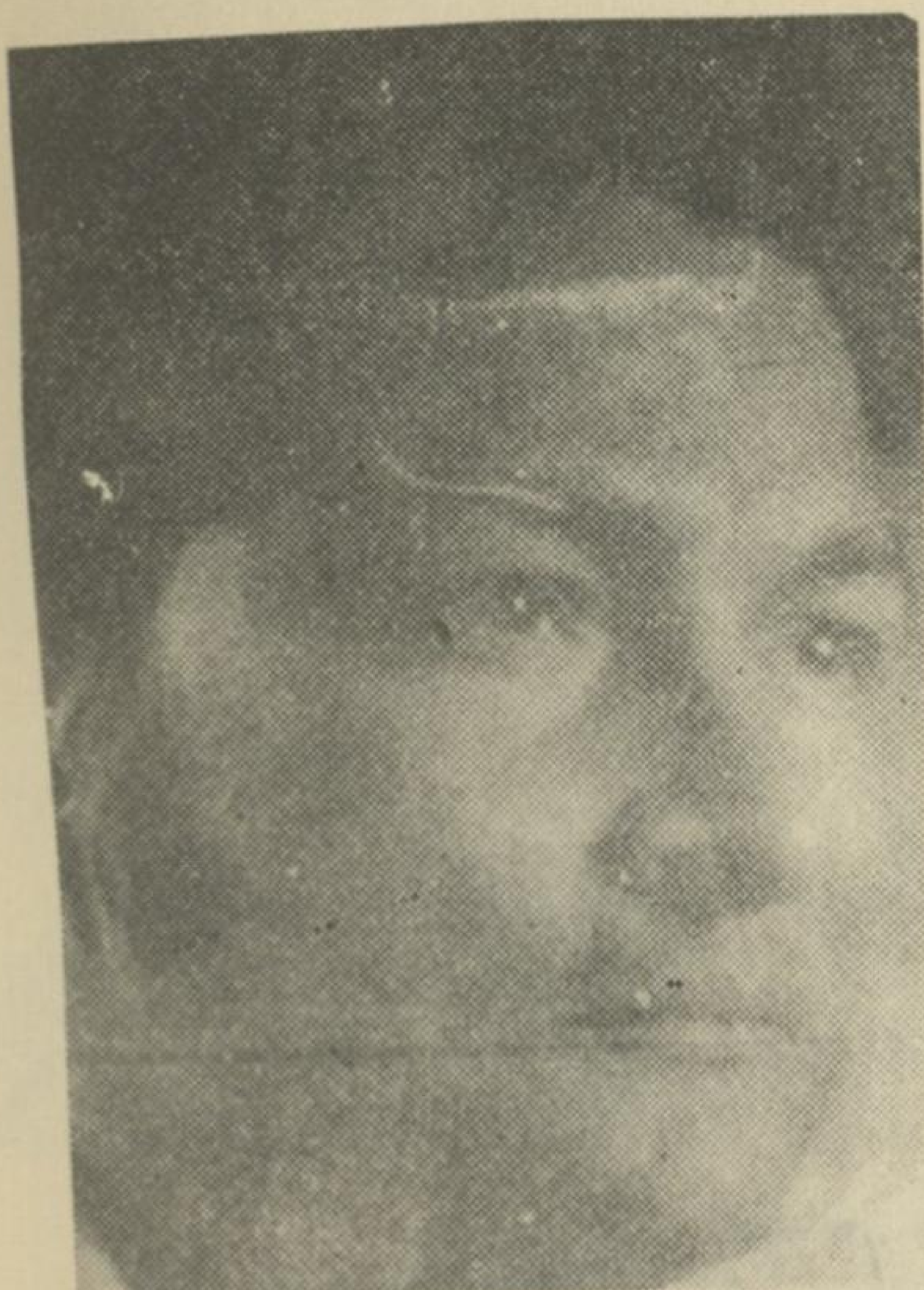
یہ کون شخص مر گیا یہ کس کا ہے کفن کہو؟
کہ زندگی کی بو مجھے اسی کفن سے آئی ہے

طریقتِ نبرد میں ہمارا سلسلہ ہے اور!
یہ خودکشی کی رسم بد تو کوہ کن سے آئی ہے

کلی تو پھر کلی ہوئی، مہک اٹھے ہیں خار بھی
میں جانتا ہوں یہ نسیم کس چمن سے آئی ہے

کھلے رکھے ہیں میں نے سارے رنگ و بو کے راستے
مرے چمن کی یہ پھبن چمن چمن سے آئی ہے

ہیں صابرِ سخن طراز! کیوں کسی کو دوش دوں
کہ میرے سر پہ ہر بلا مرے سخن سے آئی ہے



صابر ظفر

۱۲ ستمبر ۱۹۴۹ء کو ضلع راولپنڈی تحصیل کہوٹہ میں پیدا ہوئے۔ والدین نے مظفر احمد نام رکھا۔

ایف ایس سی تک تعلیم حاصل کی۔ ماہنامہ "اپنی زمین" میں کچھ عرصہ بطور معاون مدیر کام کیا۔

آج کل حکومت سندھ کے محکمۂ اطلاعات کے پبلی کیشنز سیکشن سے وابستہ ہیں۔

"ابتدا" کے نام سے ایک مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔

صابر ظفر

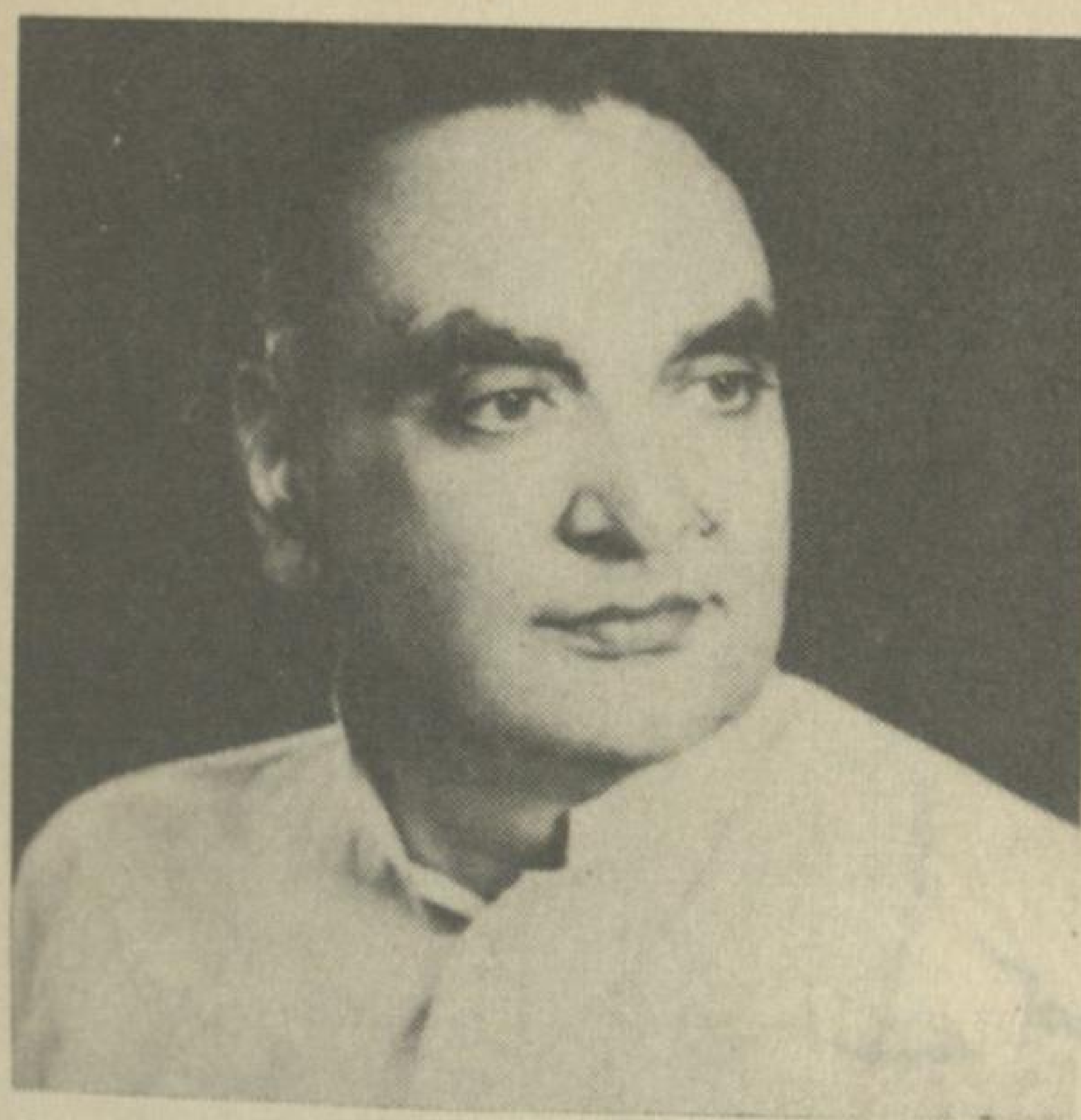
میں سوچتا ہوں اسے کھو کے کیا مفاد رہا
بدن تباہ کی خواہش میں نامراد رہا

غنودگی سی دمِ وصل تھی کہ وعدۂ شب
نہ اس کو یاد رہا اور نہ مجھ کو یاد رہا

مرے لہو کی لگن میں مگن تھے لب اس کے
وہ مرے ذہن میں جب تک رہا فساد رہا

ہم ایک عمر رہے ایک دوسرے سے جدا
مگر نہ یاد رہا ہم میں کیا عناد رہا

اک اضطراب رگ و پے میں موجزن تھا ظفرؔ
میں اس کی بزم میں غمگیں رہا نہ شاد رہا



صادق نسیم

سردار غلام صادق خاں نام، ٹیکسلا کے قریب موضع خرم کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ۲۳ ستمبر ۱۹۲۸ء کو آنکھ کھولی۔ دادا عربی کے عالم تھے۔ والد سے فارسی پڑھی اور خاندانی روایت کے مطابق فوج میں بھرتی ہو گئے۔ آج بھی محکمۂ دفاع سے منسلک ہیں۔

صادق نسیم، غزل گو شاعر ہیں۔ فارسی شعر و ادب کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "ریگِ رواں" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

صادق نسیم

ہر شخص کو ایسے دیکھتا ہوں
جیسے کہیں دُور جا رہا ہوں

خود اپنی نگاہ سے ہوں روپوش
آئینہ ہوں، جہاں نما ہوں

بے نور ہوئی ہیں جب سے آنکھیں
آئینے تلاش کر رہا ہوں

نا قدر شناس جوہری کو
راہوں میں پڑا ہوا ملا ہوں

جب رات کی زلف بھیگتی ہے
سنّاٹے کی طرح گونجتا ہوں

تلوار پر رقص کا نتیجہ
اب پاؤں کٹے تو سوچتا ہوں

آنکھوں میں وحشتیں رچی ہیں
خوابوں میں بھی خاک چھانتا ہوں

ہے چہرہ جو داغ داغ اپنا
ہر آئینے سے خفا خفا ہوں

پروائے صبا نہ خوفِ صرصر
خاکسترِ یاس پر کِھلا ہوں



صبا اکبر آبادی

خواجہ محمد امیر نام، صبا تخلص - والد کا نام خواجہ علی محمد۔ آپ ۱۴ر اگست ۱۹۰۸ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

شاعری کا آغاز ۱۹۲۰ء سے کیا اور اپنے عربی فارسی کے استاد جناب خادم علی خاں اخضر اکبر آبادی سے اصلاح لی۔ ۱۹۲۸ء میں ایک ادبی ماہنامہ "آزاد" نکالا جو دو برس تک جاری رہا۔

۱۹۳۰ء میں محکمۂ تعلیم میں بحیثیت کلرک ملازمت اختیار کی، جس کے بعد متعدد تجارتی اور کاروباری اداروں میں شریک رہے۔ ۱۹۴۷ء میں کراچی تشریف لائے۔ ۱۹۶۱ء میں تقریباً ایک برس محترمہ فاطمہ جناح کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ جناح کالج اور دوسرے تعلیمی اداروں میں ۱۹۷۳ء تک کام کرتے رہے، ان دنوں آپ خانہ نشین ہیں۔

آپ کا مجموعہ کلام "اوراقِ گل" کے نام سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے دیوانِ غالب کی مکمل تخمیس کی ہے اور عمر خیام کی گیارہ سو رباعیات اردو رباعی میں ترجمہ کی ہیں۔

صبا اکبرآبادی

جائزہ لے جو ذرا غور سے انساں اپنا
اپنے رُخ سے نہ ہٹائے کبھی داماں اپنا

آئینہ عشق میں ہے دیدۂ حیراں اپنا
آج منہ دیکھ رہی ہے شبِ ہجراں اپنا

منعِ وحشت نہ کرو سوئے بہاراں دیکھو
پھول سیتے ہیں کہیں چاکِ گریباں اپنا

ہے کسی اور کا محتاجِ مداوا یہ بھی
چارہ گر خود نہیں کرتا کوئی درماں اپنا

حیرتِ عشق بتا سامنے کون آیا ہے
کام کیوں بھول گئی جنبشِ مژگاں اپنا

ذات کی بھول بھلیّوں میں ہوا ہوں گم رہ
کتنا پُرپیچ ہے یہ جادۂ عرفاں اپنا

دستِ وحشت نے گدائی سے بچایا ہے ہمیں
کہیں پھیلانے کے قابل نہیں داماں اپنا

قیدِ آداب کا پابند ہوں، کیسے توڑوں
اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا زنداں اپنا

خونِ دل کی ہے نہ آنکھوں میں ہے اشکوں کی کمی
ہم جہاں چاہیں بنالیں گے گلستاں اپنا

لوگ جب اپنی جوانی کی قسم کھاتے ہیں
یاد آتا ہے ہمیں خوابِ پریشاں اپنا

اُن کو ویرانیٔ صحرا کا گلہ کیوں ہے صباؔ
وہ جو خود چھوڑ کے نکلے تھے گلستاں اپنا

غزل، احساسات کی زبان رہی ہے لیکن اس دور سے پہلے غزل گو شعرا نے غزل کو کبھی محض مجرد احساسات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اس کے برخلاف انہوں نے کیفیات و احساسات کے وسیلوں سے حقائق کی ترجمانی کی ہے اور جذبات کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کے واسطوں سے بھی زندگی تک رسائی حاصل کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل حسن کاری، رمزیت اور فنی پیچ و خم سے قریب رہی ہے لیکن اس کو صداقت سے دور بھی نہیں کہا جا سکتا۔

(ڈاکٹر حنیف فوق)



صبا بلتستانی

نام محمد علی شاہ، تخلص صبا۔ یکم جولائی ۱۹۲۷ء کو خطۂ شمالی کے مقام شگر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق علاقۂ شگر کے حکمران خاندان "اماچہ" سے ہے۔ والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے آپ پوری تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ لاہور بورڈ سے میٹرک کرنے کے بعد نائب تحصیل داری سے ملازمت کی ابتدا کی۔ ان دنوں آپ دیامر ضلع میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ ہیں۔

صبا، اردو اور بلتی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ آپ نے اپنے ذوق ہی کو رہنما بنایا اور کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔

مجموعۂ کلام ابھی ترتیب نہیں دیا ہے۔

صبا بلتستانی

نظروں کا وہ بھی اپنی اثر دیکھتے رہے
آہوں کا اپنی ہم بھی ثمر دیکھتے رہے

اُن کی نگاہ دُور کسی جستجو میں تھی
ہم چپکے چپکے اُن کی نظر دیکھتے رہے

کلیوں کی ان کے لب پہ ہمیشہ نگاہ تھی
شبنم ہمارے دیدۂ تر دیکھتے رہے

کرنے لگی درست وہ تیرِ نگاہ کو
ہم اختلاطِ قلب و جگر دیکھتے رہے

اُس جانِ کائنات کی شوخی نہ پوچھئے
ہر رہ گذر پہ شمس و قمر دیکھتے رہے

آنکھیں سفید ہو گئیں بختِ سیاہ کی
ہم اپنی شامِ غم کی سحر دیکھتے رہے

جذبِ درونِ شوق تھا کچھ اس قدر صباؔ
ہم دیکھتے نہیں تھے مگر دیکھتے رہے



صغیر ملال

صغیر ملال، ۱۵ فروری ۱۹۵۱ء کو پیدا ہوئے۔ آبائی شہر راولپنڈی ہے۔
انگریزی ادبیات میں ایم، اے کیا۔ ان دنوں بسلسلۂ ملازمت کراچی میں قیام پذیر ہیں۔
صغیر ملال کا مجموعہ کلام "سردار کا بیٹا شاعر" ترتیب و اشاعت کے مراحل میں ہے۔

صغیر ملال

کیسے مانوں کہ جہاں خواب نما ہوتا ہے
جبکہ ہر شخص یہاں آبلہ پا ہوتا ہے

دیکھنے والوں کی آنکھوں میں نمی تیرتی ہے
سوچنے والوں کے سینے میں خلا ہوتا ہے

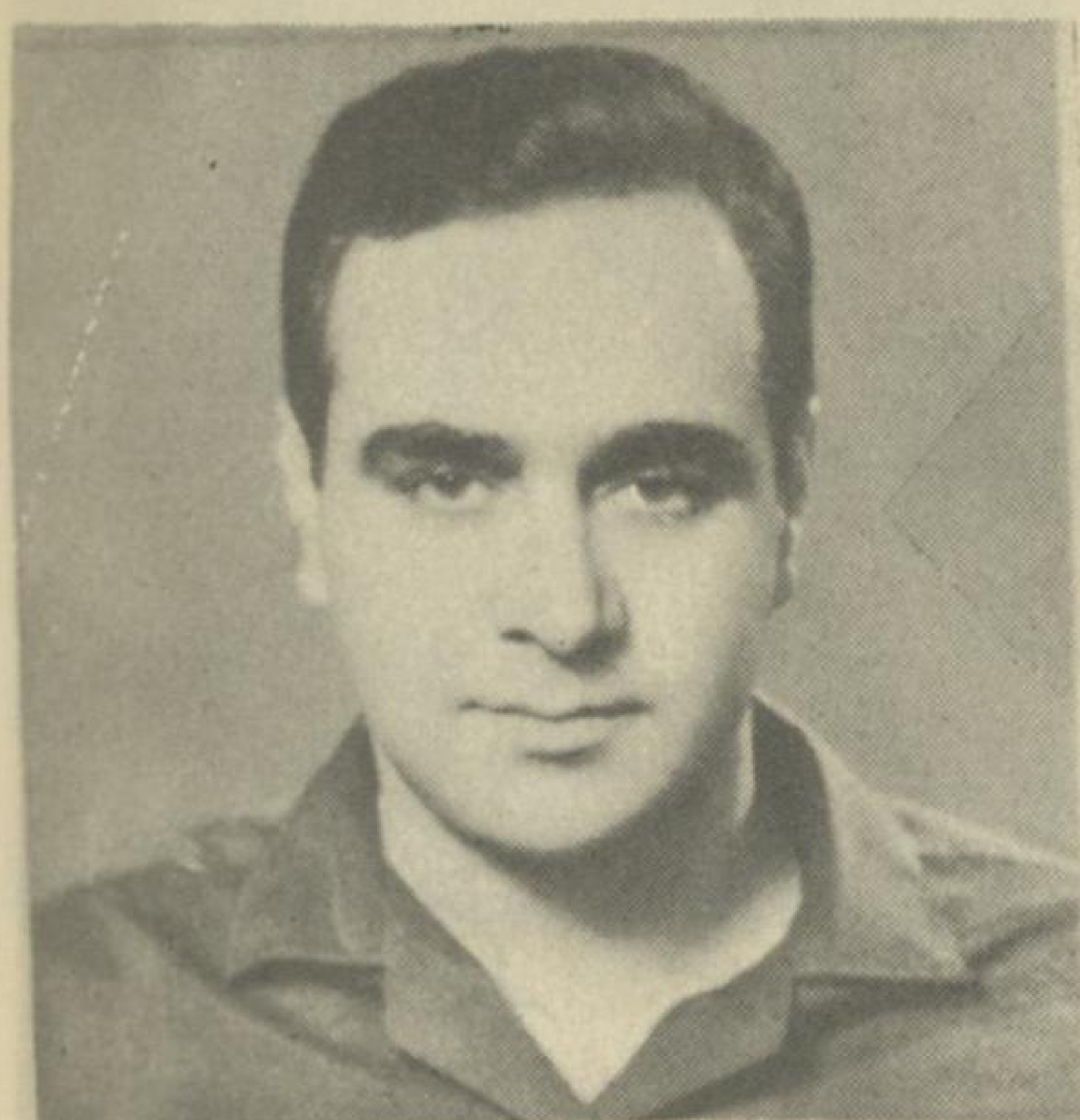
لوگ اس شہر کو خوشحال سمجھ لیتے ہیں
رات کے وقت بھی جو جاگ رہا ہوتا ہے

گھر کے بارے میں یہی جان سکا ہوں اب تک
جب بھی لوٹو، کوئی دروازہ کھلا ہوتا ہے

فاصلے اس طرح سمٹے ہیں نئی دُنیا میں
اپنے لوگوں سے ہر اک شخص جدا ہوتا ہے

میرے محتاج نہیں ہیں یہ بدلتے موسم
مان لیتا ہوں مگر دل بھی برا ہوتا ہے

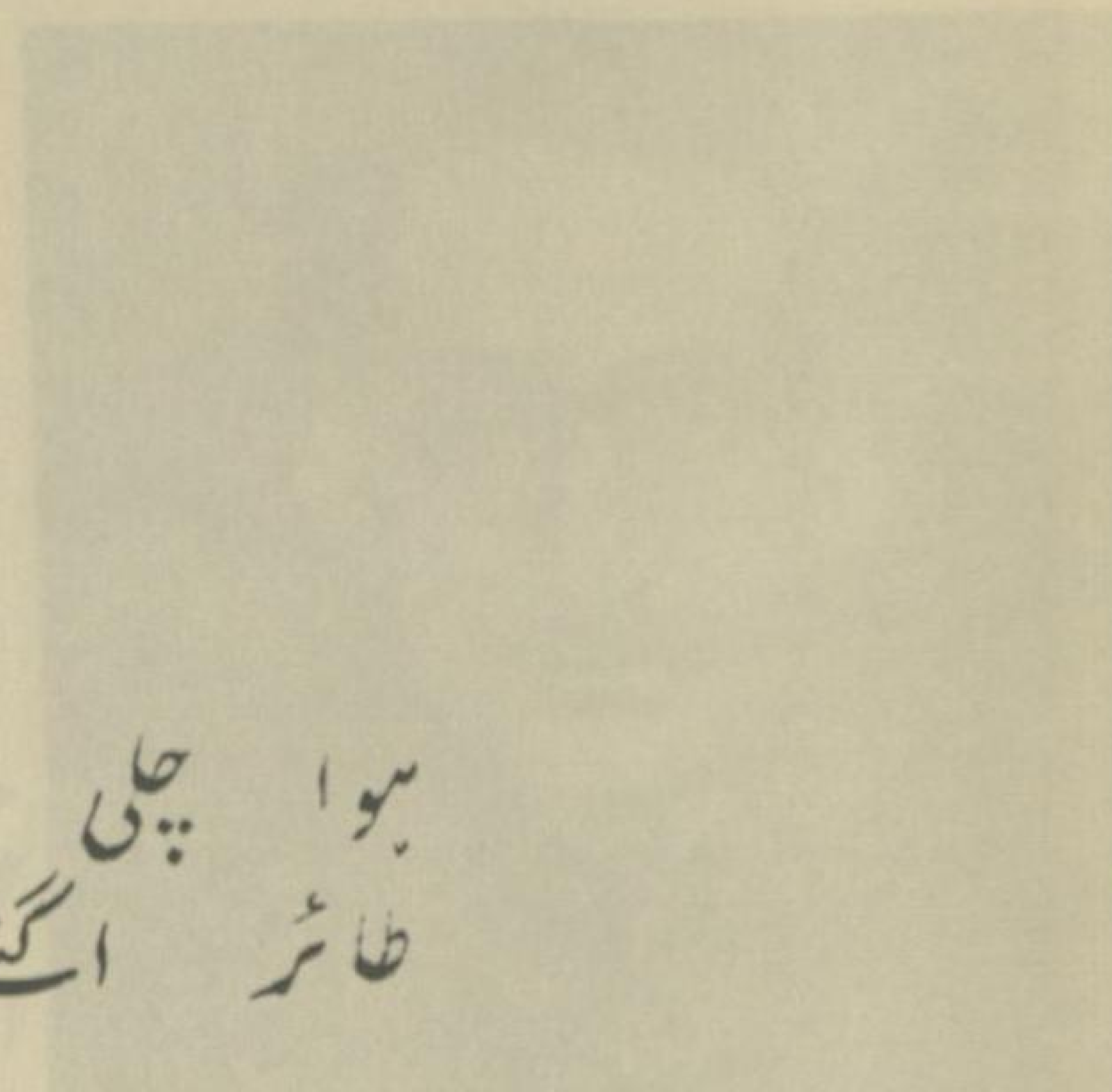
چاندنی رات نے احساس دلایا ہے ملاؔل
آدمی کتنے سرابوں میں گھرا ہوتا ہے



صلاح الدین محمود

آپ ۱۹۳۴ء میں دہلی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ لیکن تعلیم و تربیت علی گڑھ میں ہوئی جہاں آپ کے آباء، سرسیّد کے زمانے سے آباد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد آپ نے انگلستان اور جرمنی میں انجینئری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آپ پیشہ کے لحاظ سے ایک انجینئر ہیں۔ ان کے الفاظ میں وہ "ایک الہامی شاعر" ہیں۔ آپ کا کلام مختلف جریدوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ صلاح الدین محمود، دینِ اسلام سے اپنے متصوّفانہ لگاؤ کے سبب مشہور ہیں۔

صلاح الدین محمود



ہوا چلی ، ننگی اجیالی
طائر اگتے ڈالی ڈالی

ایک ورق جیسی تنہائی
نیلی ، سبزک ، کالی کالی

بین والی ساکت ہر بن کا
مجھ میں ساکت قدموں والی

جلے جلائے سمتوں کے تن
تاروں کی بجھتی رکھوالی

آنکھوں میں نابینا تکتی
راتوں نے بینائی پالی

اسپِ سیہ اور چٹیل میداں
جلتا ایک شجر اب خالی



صہبا لکھنوی

۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ اور اسمٰعیل کالج اندھیری (بمبئی) سے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔

صہبا کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۰ء میں طالب علمی کے دوران ہوا۔ پہلی غزل ہفت روزہ "آفتاب" امرتسر میں ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔

آپ کا پہلا شعری مجموعہ "ماہ پارے" ۱۹۴۰ء میں بھوپال سے چھپا۔ اسی سال بچوں کے لئے کہانیوں کا ایک سیٹ بھی طبع ہوا۔

صہبا لکھنوی اردو کے معروف مجلّہ "افکار" کے مدیر ہیں۔ یہ جریدہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہونا شروع ہوا اور بفضل تعالیٰ اب تک قائم ہے۔ اس رسالے نے متعدد خاص نمبر شائع کئے ہیں جن میں جوش نمبر — حفیظ نمبر — فیض نمبر — ندیم نمبر اور امیر خسرو نمبر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

صہبا نے ۱۹۵۸ء میں اسرار الحق مجاز کی شخصیت اور فن کے بارے میں ایک کتاب "مجاز، ایک آہنگ" تحریر کی جس کے اب تک دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ "میرے خوابوں کی سرزمین — مشرقی پاکستان"۔ ان کا لکھا ہوا سفرنامہ ہے۔ "اقبال اور بھوپال" ایک تحقیقی کتاب ہے جس پر داؤد ادبی انعام مل چکا ہے۔

"برطانیہ میں اردو" کے نام سے ایک اور کتاب زیر تصنیف ہے جس میں مستشرقین کے کاموں کا سیر حاصل جائزہ لیا جائے گا۔

صہبا لکھنوی

بے حرف و نوا سُخن تو دیکھو
خوابوں کا ادھورا پن تو دیکھو

لفظوں میں سمٹ سکا نہ پیکر
انسان کا عجزِ فن تو دیکھو

چہرے کے نقوش بولتے ہیں
تصویر کا بانکپن تو دیکھو

دامن کو بہار چھو گئی تھی
جلتا ہوا پیرہن تو دیکھو

تنہائی کا کرب سہنے والو
تنہائیِ انجمن تو دیکھو

جنگل کا سکوت کہہ رہا ہے
شہروں میں بسی گھٹن تو دیکھو

صدیوں سے لہو میں تر ہے دامن
تاریخ کا پیرہن تو دیکھو



ضمیر جعفری

اصل نام سید ضمیر حسین شاہ۔ پیدائش یکم جنوری ۱۹۱۴ء۔ آبائی وطن چک عبدالخالق ضلع جہلم ہے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ صحافت کے پیشے سے بھی وابستہ رہے، فوج کی ملازمت میں کچھ برس ملک سے باہر بھی گزارے، فوج کی ملازمت میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور پھر راولپنڈی سے ایک اخبار "بادِ شمال" کے نام سے نکالا۔ کچھ مدت دارالحکومت کے ترقیاتی ادارہ سے بھی منسلک رہے۔ ان دنوں پاکستان نیشنل سنٹر سے وابستہ ہیں۔

اب تک ضمیر جعفری کے قلم سے نظم و نثر کی متعدد کتابیں نکل چکی ہیں۔ ان کی مطبوعہ شعری تصانیف کے نام یہ ہیں: "کارزار" "لہو ترنگ" — "جزیروں کے گیت" "من کے تار" — "مافی الضمیر" — "میرے پیار کی زمین" — "ولایتی زعفران" — اور "من میلہ"۔ نثری تصانیف میں "ہندوستان میں دو سال" — "جنگ کے رنگ" "اڑتے خاکے" — "ملایا اور ملایا کے لوگ" — "آنریری خسر" اور "کتابی چہرے" کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ نظم و نثر کی کچھ اور کتابیں "کھلیان" — "متاعِ ضمیر" اور "خدوخال" کے نام سے زیرِ ترتیب ہیں۔

ضمیر جعفری

پایانِ شب سراغِ سحر بھی نہیں رہا
منزل تو کیا ملے گی سفر بھی نہیں رہا

کیا وقت ہے کہ رُت کا امس ٹوٹتا نہیں
یہ شہر کیا بسا ہے کہ گھر بھی نہیں رہا

یہ بے حسی کہ جیسے رگوں میں لہو نہ ہو
یہ بے دلی کہ موت کا ڈر بھی نہیں رہا

کچھ اس طرح بساطِ نشاطِ ہوس بچھی
دامن برائے دیدۂ تر بھی نہیں رہا

جس میں کبھی کبھی اتر آتی تھی چاندنی
دیوار میں وہ روزنِ در بھی نہیں رہا

تقدیسِ آرزو کے بغیر آرزو عبث
دستار گر گئی ہے تو سر بھی نہیں رہا



ضیاء جالندھری

اصل نام سید نثار احمد۔ ۲ فروری ۱۹۲۳ء کو جالندھر شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں کچھ عرصہ شعبۂ تدریس سے منسلک رہے۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں آل انڈیا ریڈیو میں بطور پروگرام اسسٹنٹ ملازم ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلہ کے امتحان میں شرکت کی اور کامیاب ہونے کے بعد محکمۂ ڈاک سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی کے ڈائریکٹر اور وائس چیئرمین رہے۔ آج کل پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کے ناظمِ اعلیٰ ہیں۔

"سرِ شام" اور "نارسا" کے نام سے ۲ دو مجموعے شاعری کے شائع ہو چکے ہیں۔

ضیاء جالندھری

گو سرِّ ارتقا و بقا میرا جسم ہے
سنتا ہوں تو فنا کی صدا میرا جسم ہے

بے تاب ، بے کنار ہوا میرا جسم ہے
گہرے سمندروں کی ندا میرا جسم ہے

میں ہوں ازل سے وقت کی گردش کا رازدار
یہ بزم کائنات ہے کیا میرا جسم ہے

اس خاک کی رگوں میں رواں ہے مرا لہو
ان پتھروں کی تہ میں چھپا مرا جسم ہے

ایسے رہا چمن میں کہ محسوس یہ ہوا
جو گل کھلا ، جو سبزہ اگا ، میرا جسم ہے

آنکھوں کے ماورا جھلک اٹھتا ہے گاہ گاہ
وہ شوخ جس کی سادہ قبا میرا جسم ہے

میں یوں ترے خیال میں تحلیل ہو گیا
حسرت ہمہ وجود ہے لا میرا جسم ہے
میری تلاش میری طلب بے حساب و حد
میری حدود میری سزا میرا جسم ہے

شب کی دبیز تیرگیوں کے جواب میں
یہ ایک ٹمٹماتا دیا میرا جسم ہے
صدیاں عذاب و کرب کی جس پر گزر گئیں
وہ سعی و آرزو کی نوا میرا جسم ہے

صحراؤں کی ہزاروں برس کی عظیم پیاس
جس دم سمٹ گئی تو کھُلا میرا جسم ہے

اک مشتعل ہجوم سرِ رہگذار تھا
پوچھا کہ کیا ہے میں نے کہا میرا جسم ہے

شدّت کے اس تصادمِ اقدار میں ضیاؔ
جو ریزہ ریزہ ٹوٹ گیا میرا جسم ہے



ظفر اقبال

آپ ۲۷ ستمبر ۱۹۳۲ء کو بمقام بہاول نگر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اوکاڑہ سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے، اور لاء کالج لاہور سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ آج کل اوکاڑہ ہی میں وکالت کرتے ہیں۔ جدید غزل میں آپ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

آبِ رواں ، گلافتاب ، رطب و یابس اور عہدِ زیاں آپ کی مطبوعہ کتب ہیں۔

ظفر اقبال

ترس گئی ہیں نگاہیں ، نظر تو آجائے
مجھے ملے نہ ملے ، اپنے گھر تو آجائے

ہوائیں آتی ہیں اس کی طرف سے شام و سحر
وہ خود نہ آئے ، پر ، اس کی خبر تو آجائے

وہ فیصلہ تو سنا دے ، جئیں کہ مر جائیں
اسی بہانے کسی دن ادھر تو آجائے

نظر ملائے نہ وہ بات ہی کرے بے شک
یہی بہت ہے ، سرِ رہگذر تو آجائے

میں اس کی یاد کو دل سے نکال دوں ، لیکن
کسی طرح سے مجھے یہ ہنر تو آجائے

جو سوچتا ہوں اسے شکل اگر نہیں ملتی
جو بات کہتا ہوں اس میں اثر تو آجائے

ہجومِ ہجر میں رستہ نکال ہی لیں گے
نویدِ وصل ابھی دربدر تو آجائے

ٹاک ہی بیچ میں پڑتی ہے، کوہ و دشت نہیں
عبور کر سکے اس کو اگر تو آجائے

مسافری تھی، ظفر، منزلِ محبت کی
رکا رہا کہ شریکِ سفر تو آجائے

رمز و کنایہ کی زبان میں صرف انہی خیالات کا اظہار کیا جا سکتا ہے، جو کسی قوم میں بدیہات اور مسلمات کی جگہ اختیار کر چکے ہوں اور جن کی اطلاعات عام ہو۔ ورنہ نئے خیالات کی تبلیغ پرانے رموز کے ذریعہ ناممکن ہے اور یہ دشواری غزل میں اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کیوں کہ ایک شعر کی تنگ دامنی پرانے رموز کو نئی سمتیں اختیار کرنے سے اور بھی زیادہ مانع رکھتی ہے۔

(پروفیسر ممتاز حسین)



ظفر اکبر آبادی

ظفر، آگرہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ماڈل اسکول میں حاصل کی۔ جس کے بعد شعبۂ محمدیہ اینگلو اورنیٹل کالج میں داخلہ لیا مگر تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے کیونکہ اسی دوران ہندوستان میں فسادات شروع ہوگئے۔ پاکستان آنے کے بعد تلاشِ معاش میں سرگرداں رہے، پھر اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی قائم کی۔ اس دوران ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں صداکاری بھی کرتے رہے۔

پہلے "پاکستان ٹائمز" سے اور اب روزنامہ "ڈان" سے منسلک ہیں۔

مجموعۂ کلام ابھی طبع نہیں ہوا ہے۔

ظفر اکبرآبادی

پھرے ہیں دُھن میں تری ہم اِدھر اُدھر تنہا
تجھے تلاش کیا ہے نگر نگر تنہا

ہمارے ساتھ سبھی ہیں مگر کوئی بھی نہیں
ہم انجمن میں ہیں بیٹھے ہوئے مگر تنہا

چلے گئے ہیں نہ جانے کہاں شریکِ سفر
مجھے حیات کی راہوں میں چھوڑ کر تنہا

گواہ ہیں رہِ شوق و طلب کے سنّاٹے
کیا ہے ہم نے یہ صبر آزما سفر تنہا

بہت دنوں سے نہیں تُو رفیقِ دیدۂ و دل
بہت دنوں سے اکیلا ہے دل، نظر تنہا

بھُلانے والے کبھی تُو نے یہ بھی سوچا ہے
ترے بغیر ہے کب سے ترا ظفر تنہا



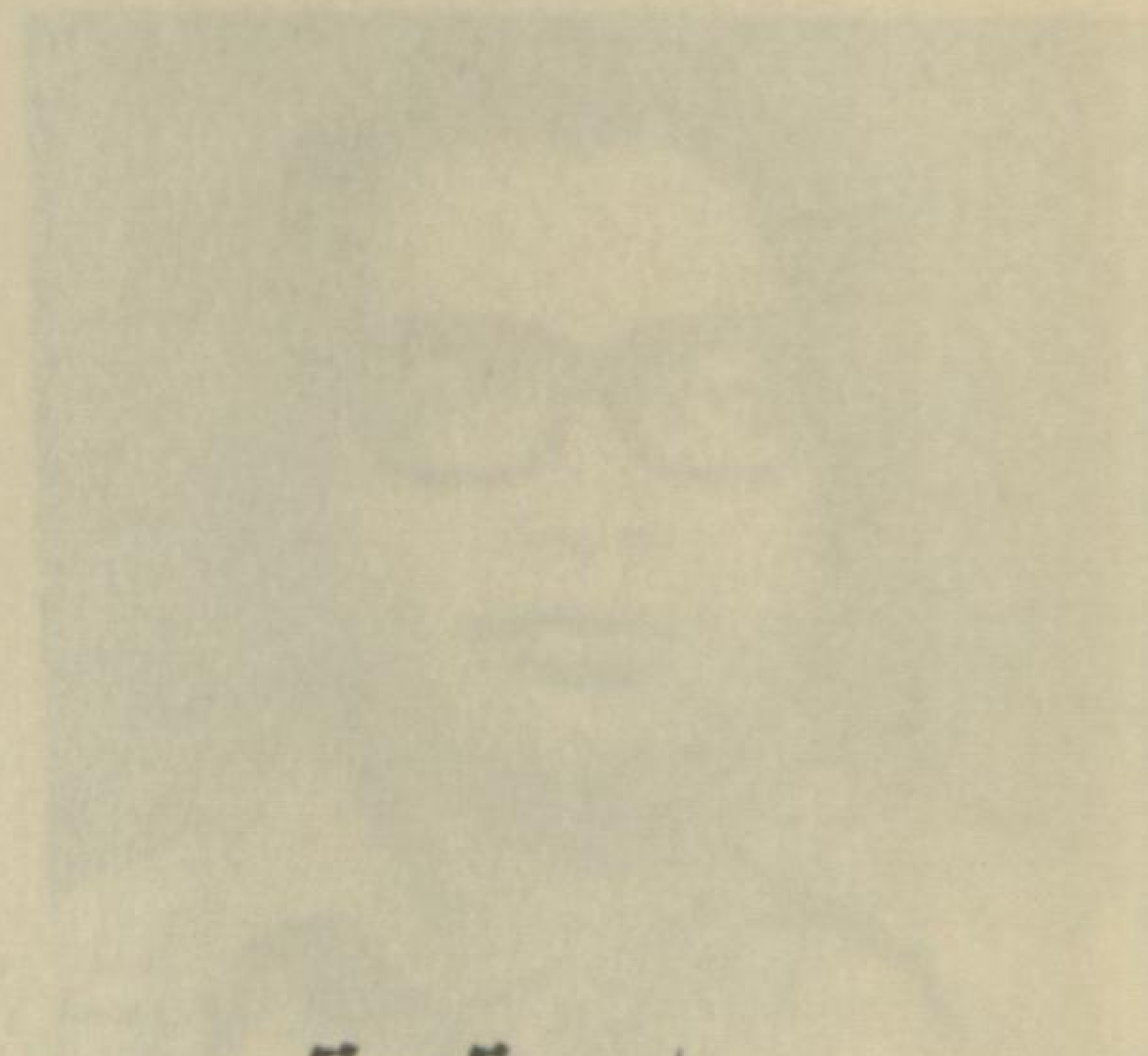
ظہور نظر

اصل نام ظہور احمد ہے۔ ۲۲۔ اگست ۱۹۲۳ء کو ساہیوال میں پیدا ہوئے۔ آج کل بہاولپور میں مقیم ہیں۔

بچپن ہی میں والد کی وفات کے باعث باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ ہرچند کوئی ڈگری یا سند حاصل نہ کر سکے مگر اسی مطالعہ سے ان کی شاعری کو جِلا ملی۔

ظہور نظر کے اب تک دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ۱۹۴۵ء میں "بھیگی پلکیں" جس میں غزلیں اور گیت ہیں اور دوسرا "ریزہ ریزہ" کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا جو صرف نظموں پر مشتمل ہے۔ "زنجیرِ وفا" اور "بے سمت موڑ" ان کی دو اور تصانیف ہیں جو ابھی اشاعت پذیر نہیں ہو سکی ہیں۔

ظہور نظر کی نظموں کا انگریزی، روسی، چینی، ڈچ اور اطالوی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے شائع شدہ عالمی شعراء کی ببلوگرافی میں بھی آپ کے مختصر حالاتِ زندگی چھپ چکے ہیں۔



ظہیر نظر

واسطے جتنے تھے، سب وہم و یقیں نے چھوڑے
آسماں سر سے ہٹا، پاؤں زمیں نے چھوڑے

کون تھا، کیوں نہ رہا، کیسے کریں اس کا پتہ؟
اپنے دکھ بھی تو مکاں میں نہ مکیں نے چھوڑے

عابدوں میں تھا بھرم جن سے ہمارا قائم
آج وہ داغ بھی اک در پہ جبیں نے چھوڑے

بند جس دن سے ترے پیار کا میخانہ ہوا
لطف کے سارے نشے قلبِ حزیں نے چھوڑے

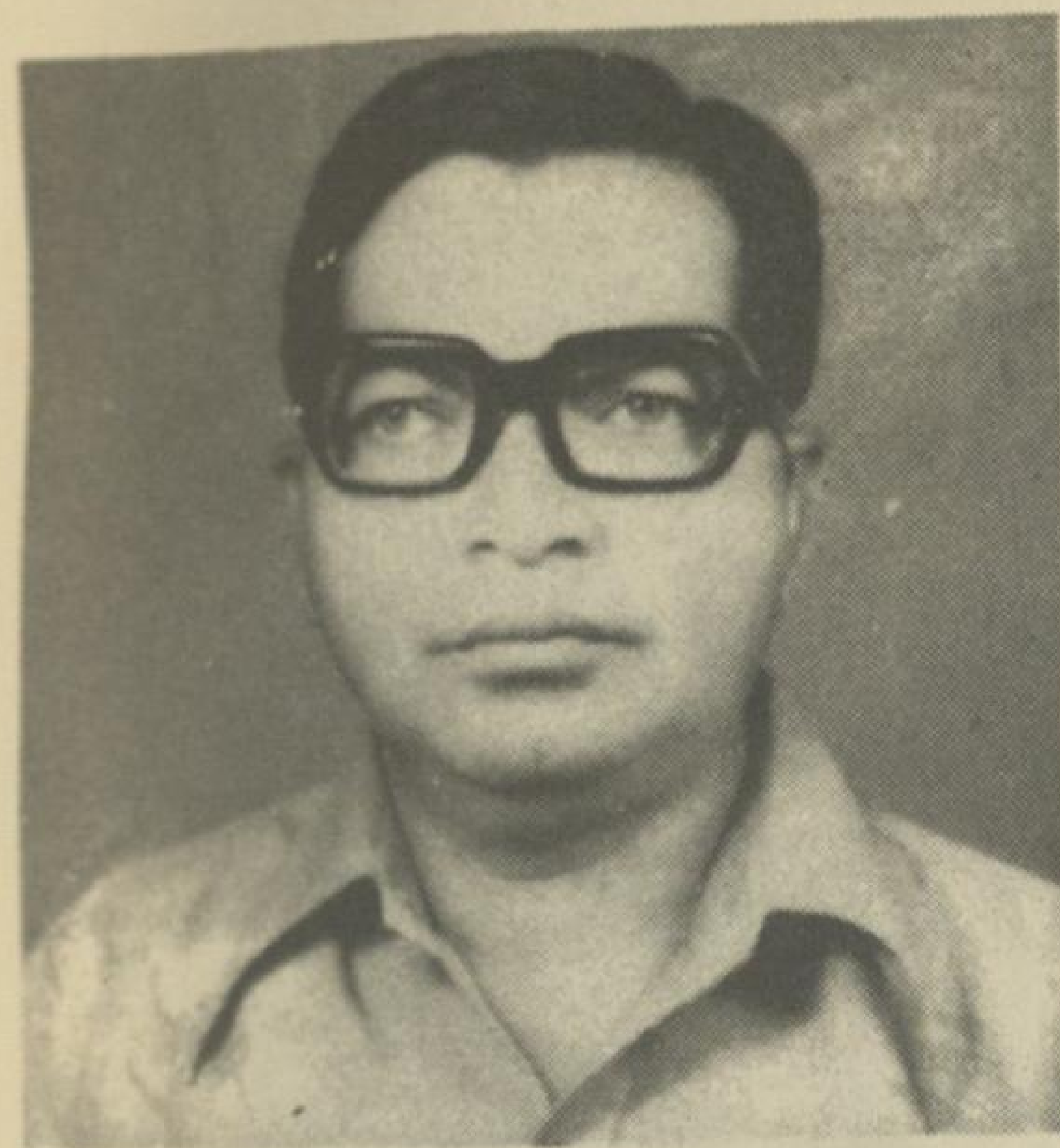
ہم نہ آغاز کے مجرم تھے، نہ انجام کے ہیں
ہاتھ میں ہاتھ لئے تم تھے، تمہیں نے چھوڑے

"انقلاب آنے کو ہے سنبھلو" لکھا تھا جن پر
ہاں، فضاؤں میں غبارے وہ ہمیں نے چھوڑے

خواب کا ایک پرندہ بھی نہ تعبیر ہوا
جس قدر تیر گماں میں تھے یقیں نے چھوڑے

خلقتِ شہر نہ مانی مرا ملحد ہونا
ورنہ شوشے کئی اک مفتیٔ دیں نے چھوڑے

ان گنت اشک بہانے سے بھی شاید نہ دُھلیں
دل پہ جو نقش تری ایک نہیں نے چھوڑے

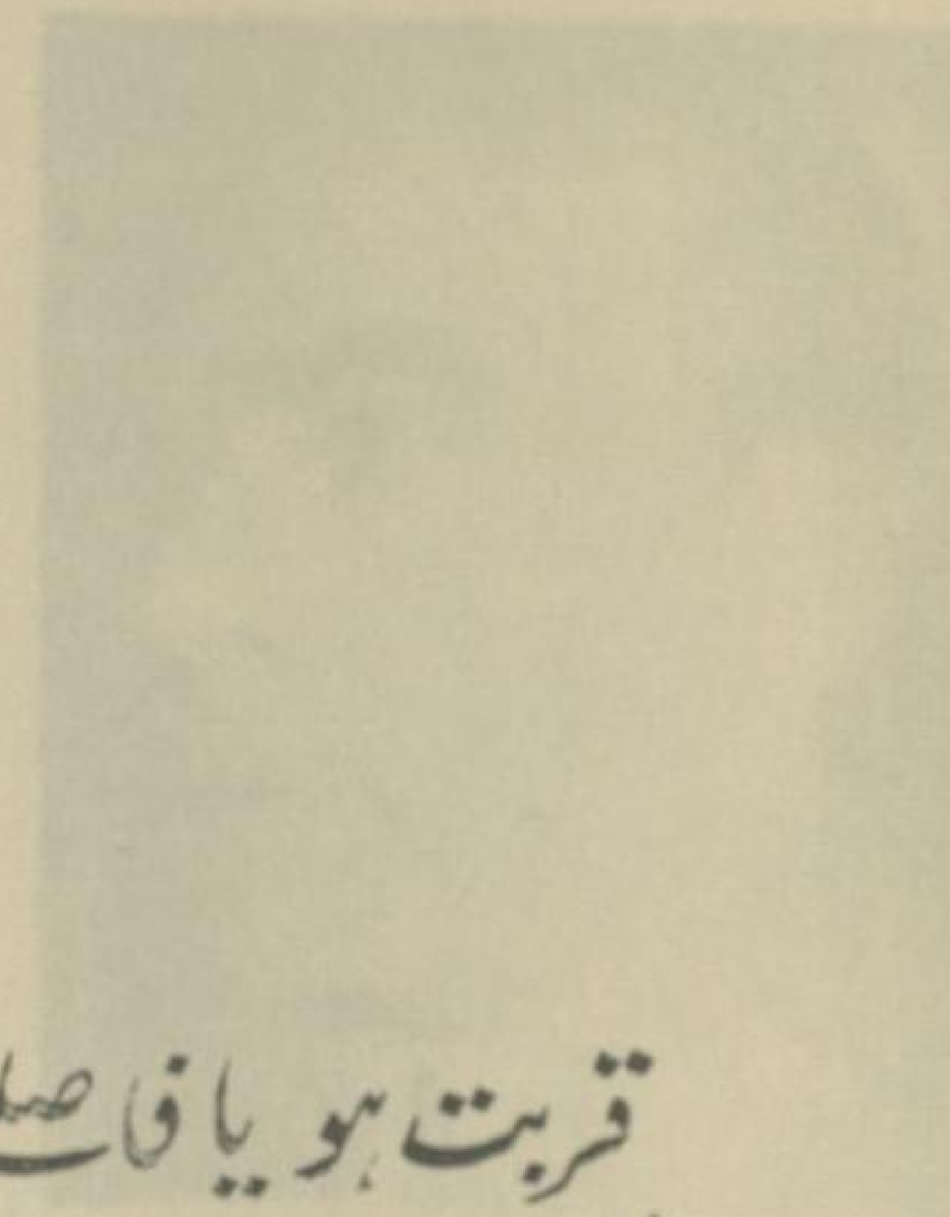


ظہیر فتح پوری

اصل نام ظہیر حسنین عابدی۔ ۱۹۲۸ء میں مشرقی یو۔ پی۔ کی ایک بستی ایرایاں سادات (ضلع فتحپور ہسوہ) کے ایک ایسے سید خاندان میں پیدا ہوئے، جس میں علم و ادب کا بڑا مان تھا۔ شاعری آپ کو اپنے والد سید نواب حسین اخترؔ سے ورثے میں ملی۔ بچپن کا بڑا حصہ گوالیار میں گذرا۔ جہاں فن موسیقی اور ہندی ادب کے ذوق کی دولت پائی۔ شاعری کا آغاز نظم سے ۱۹۴۲ء میں ہوا لیکن بالآخر آپ کو غزل نے اپنا لیا۔ ۱۹۶۶ء میں ہندی بحور میں غزل کہنے کا پہلا تجربہ کیا:

مرے من موہن! ترے مکھڑے پر کھلے بیلے کا سجیلا پن ہے
نصیبہ ایکے بہت اِترایا، تبسم ہے یا کنول روشن ہے

یہ تجربے جاری ہیں۔ کچھ "فنون" کے جدید غزل نمبر میں شائع ہوئے تھے، کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ شعری مجموعہ ہنوز مرتب نہیں کیا۔ داؤد ادبی انعام یافتہ مقالہ "رسوا کی ناول نگاری" ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ مجلس ترقیٔ ادب کے لئے رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" اور "منتخب مراثیٔ دبیر" مرتب کئے۔ مسودات: خسرو کی اردو شاعری، رسوا کی تنقید اور پریم چند کا نظریۂ حیات و نظریۂ فن۔



ظہیر فتح پوری

قربت ہو یا فاصلے ہوں ، جو سکھ ہے نایاب سا ہے
لیکن جو دل میں بسا ہے، کچھ تم سا کچھ خواب سا ہے

غم پر یہ الزام کیسا ! اپنا اپنا حوصلہ ہے
چھک جاؤ تو عین امرت، چکھو تو زہراب سا ہے

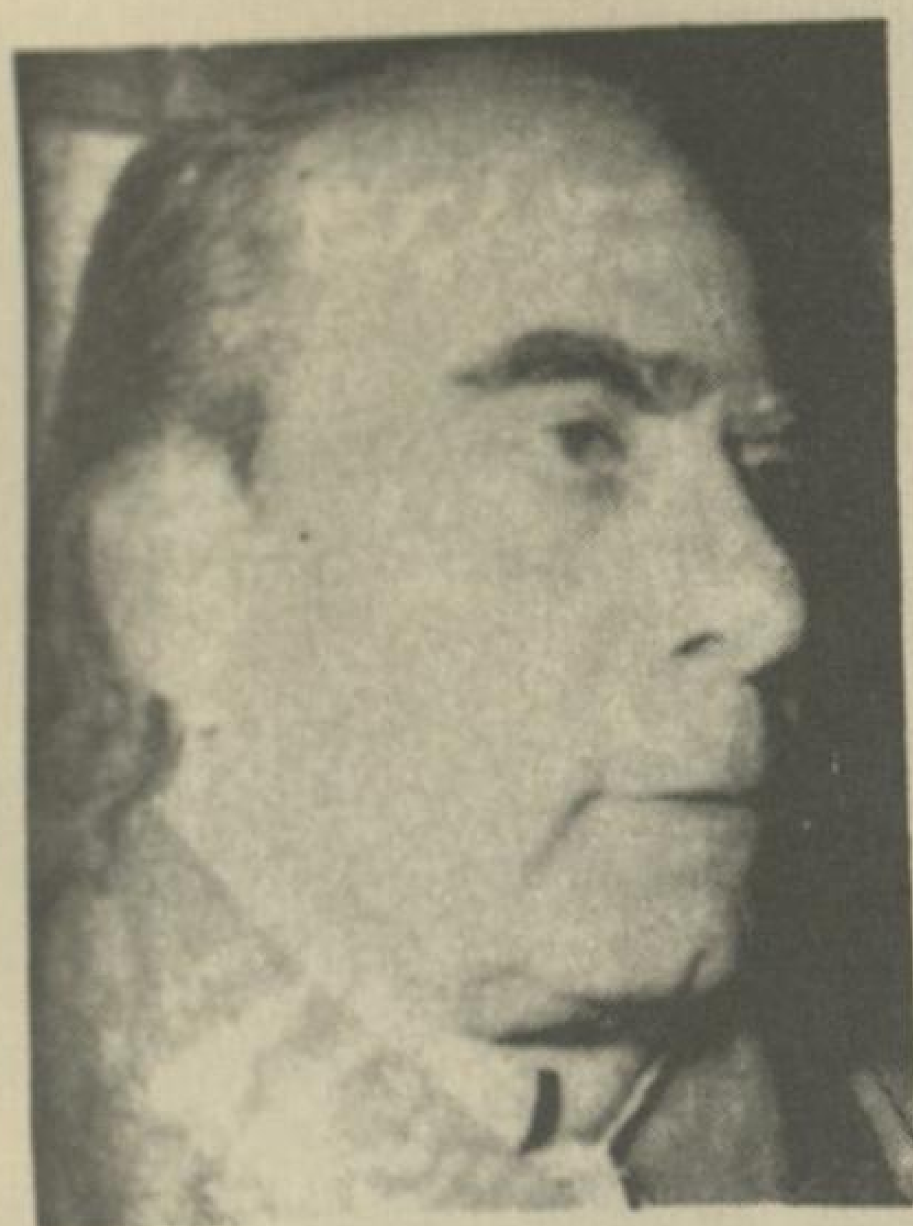
ماضی کی وہ لہر اٹھی، ہوتا جائے حال اوجھل
کیسے سنبھلے دھیان نیاّ چہروں کا سیلاب سا ہے

کیسی نظریں، کیا نظارے! سب روپ اب بہروپ نکلے
اک دن تم بھی آن ملتے، دل جیسے سیراب سا ہے

دید اک کارِ جبر ٹھہرا، یاں کس کی پہچان ہوتی!
جب سے اترے زندگی میں، رنگوں کا گرداب سا ہے

اگلوں کو تو پھر میسّر قدروں کی بیساکھیاں تھیں
ہم کس پر تکیہ کریں گے، ہر عالم سیماب سا ہے

جب غم جوالا جذب ہووے، دل میں اتریں نرمیاں سی
تب یہ کویتا چاندنی ہے، تب یہ دل مہتاب سا ہے



عابد حشری

نام عابد حشری - ۱۱ جولائی ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے - ایگریکلچر سائنس میں ڈپلوما اور اردو میں آنرز کرنے کے بعد، پی سی ایس آئی آر (منسٹری آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی) میں ملازمت اختیار کی۔

شعری مجموعہ "عبارت" کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔

عابد حشری

درد کی لہر یقیناً مرے گھر جائے گی
میں نہ ہوں گا تو خدا جانے کدھر جائے گی

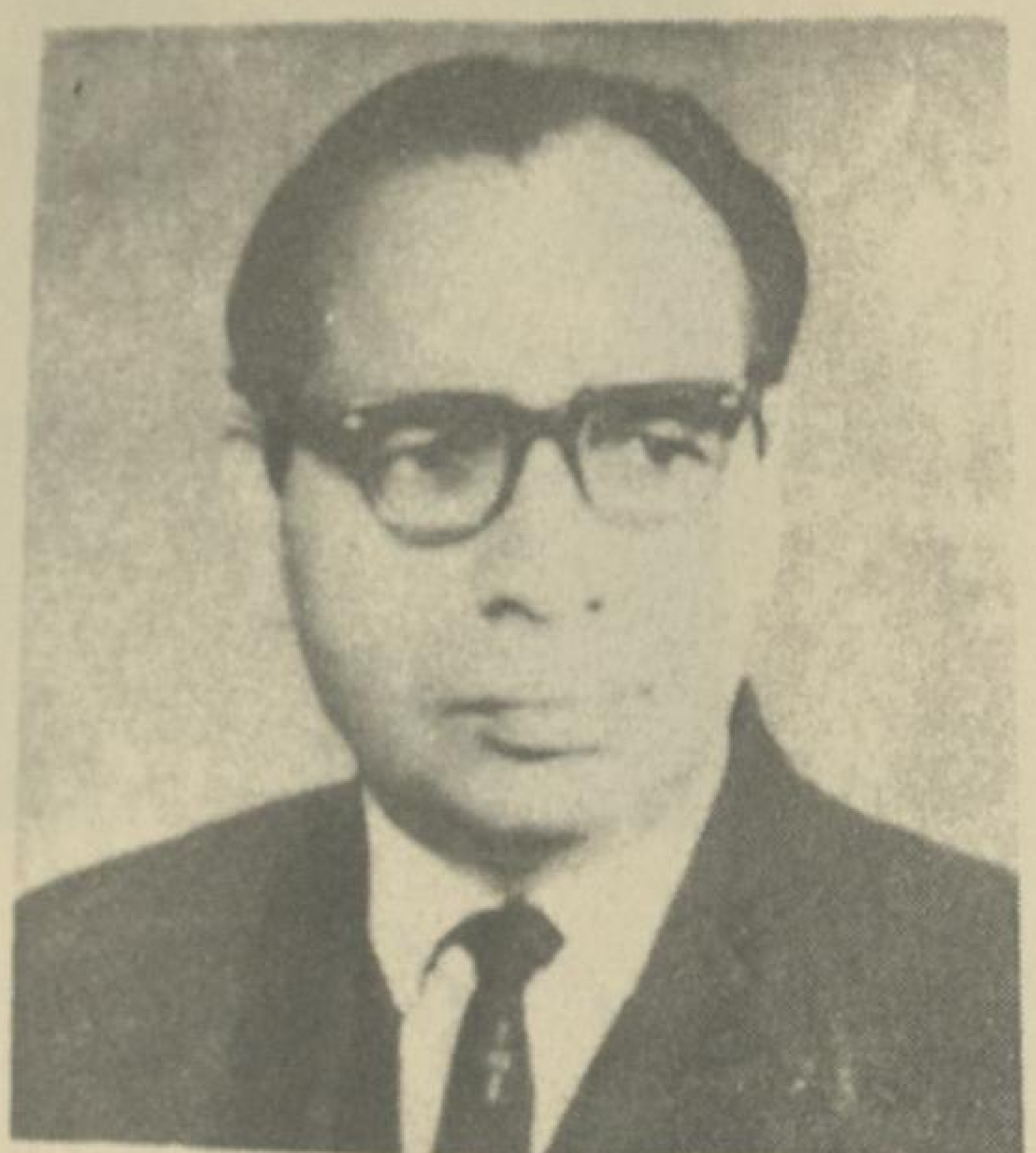
موجِ خوں سر سے گزرنا ہے گزر جائے گی
چار دن بعد یہ ندّی بھی اتر جائے گی

کون کر سکتا ہے افکار و نظر کو محصور
کام خوشبو کا بکھرنا ہے بکھر جائے گی

منزلِ زیست تجھے میں نہ کروں گا مایوس
میں نہ پہنچا تو مری گردِ سفر جائے گی

میں اندھیروں کے تسلسل سے نہیں ہوں خائف
روشنی آج نہیں کل مرے گھر جائے گی

میں تو مر سکتا ہوں حالات کے سنّاٹوں میں
دوستو کیا مری آواز بھی مر جائے گی



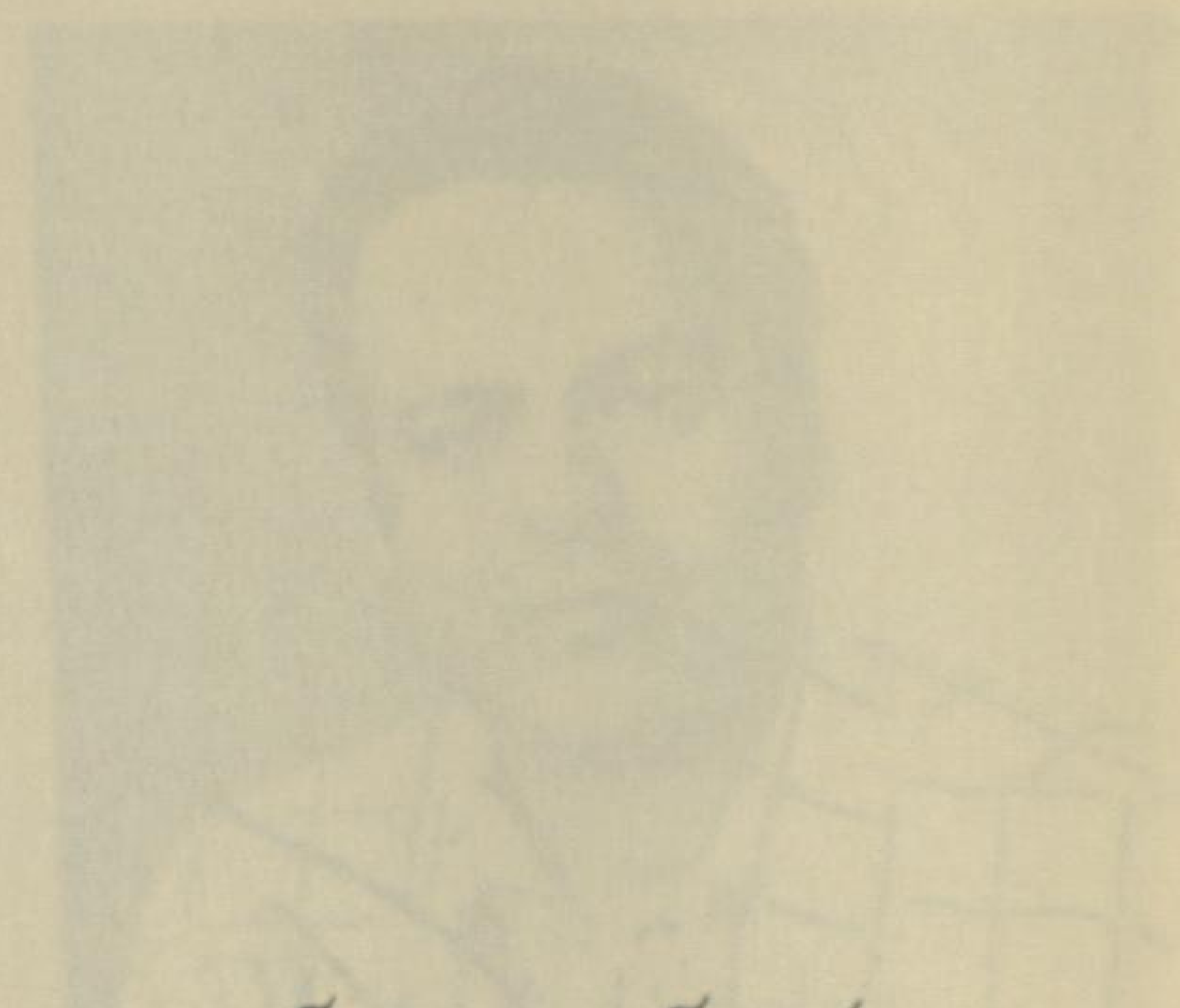
عارف عبدالمتین

آپ یکم مارچ ۱۹۲۳ء کو کوچہ وکیلاں، کٹڑہ جمیل سنگھ امرتسر میں خواجہ عبدالمجید کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ آج کل آپ گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کالج میگزین "الہلال" کی ادارت نے طالب علمی کے ایام ہی میں آپ میں مدیرانہ میلان پیدا کر دیا۔ علاوہ ازیں آپ ادبِ لطیف، سویرا، جاوید، ماحول اور اوراق کے شعبۂ ادارت سے بھی منسلک رہے۔ شاعری اور تنقید، دونوں سے آپ کو بیک وقت شغف رہا ہے۔ آپ اردو کے علاوہ پنجابی زبان کے معروف شاعر اور نقاد شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریکوں میں بھی شامل رہے۔

آپ کے شعری اور تنقیدی مجموعے درج ذیل ہیں :-

دیدہ و دل ، موج در موج ، آتشِ سیّال ، صلیبِ غم ، سفر کی عطا دریچے اور صحرا ، اکلاپے دا مسافر ، امکانات ، پرکھ پڑچول وغیرہ۔

عارف عبدالمتین



وجود کے آسماں پر آفتاب بن کر چمک رہا ہوں
میں اپنے اندر کی حدّتوں سے، ازل سے یونہی دمک رہا ہوں

محبتوں کے جمیل لمحے، عداوتوں کے رقیب لمحے
کہاں گئے ہیں کہ میں خلا میں، نجانے کب سے بھٹک رہا ہوں

سحاب صبحیں، گلاب شامیں کبھی مری تھیں، مگر میں اب خود
سحاب بن کر برس رہا ہوں، گلاب بن کر چٹک رہا ہوں!

مرے اصولوں کی رفعتوں نے مجھے زمیں پر پٹخ دیا ہے
میں اپنے سینے میں آپ ہی ایک خار بن کر کھٹک رہا ہوں!

نہ اس کا پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ جاں ہی تن سے نکل رہی ہے
عجب ہے احساس کی یہ سولی کہ جس پہ کب سے لٹک رہا ہوں!

مرے تعاقب میں کتنے وحشی شکاریوں کا ہجوم سا ہے،
نہیں ہے بچنے کی آس کوئی، مگر مسلسل لپک رہا ہوں!

یہ زندگی کا مہیب صحرا، مری تگ و تاز سے ہے برہم،
میں آبلے کی طرح سے عارفؔ قدم قدم پر ٹپک رہا ہوں!



عالم تاب تشنہ

اصل نام سید عالم تاب علی ہے۔ آپ ۲۰-اپریل ۱۹۳۵ء کو میرٹھ (یو-پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی و ثانوی تعلیم وہیں حاصل کی۔ میرٹھ سے ایم کام کیا اور اپریل ۱۹۵۹ء میں پاکستان آگئے۔ مئی ۱۹۵۹ء سے ملازمت کا آغاز چیف اکاؤنٹنٹ لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ سے کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں محکمہ روڈ ٹرانسپورٹ میں آگئے اور وہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ٹریننگ کے لئے ایک سال کو امریکہ بھیج دیئے گئے جہاں سے آپ نے او اینڈ ایم میں ڈپلوما کیا۔ کنیٹکٹ یونیورسٹی اور مشی گن یونیورسٹی سے ابلاغ میں سند لی۔ چارٹرڈ انسٹی ٹیوٹ آف ٹرانسپورٹ نے فیلوشپ کا اعزاز دیا۔ آج کل انٹرنیشنل ٹرانسپورٹ کمپنی کے سربراہ ہیں۔

شاعری کا شوق بچپن ہی سے رہا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۸ء تک خوب شعر کہے۔ پھر بارہ برس کی طویل خاموشی۔ ۱۹۷۰ء میں دوبارہ شاعری کا آغاز کیا۔

۱۹۷۸ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام "موج موج تشنگی" کے نام سے شائع ہوا۔ شیکسپیئر کے ڈرامہ "مڈسمر نائٹ ڈریم" کا ترجمہ "خواب نیم شب" کے نام سے تیار ہے جو جلد ہی منظر عام پر آنے والا ہے۔ دوسرا مجموعۂ کلام "قریۂ جاں" کے نام سے زیر ترتیب ہے۔

عالمتاب تشنہ

سوادِ جاں میں نہ یوں دربدر پھرا مجھ کو
مسافرت مرے گھر کا پتہ بتا مجھ کو

مجھے تو اپنے خدوخال تک بھی یاد نہیں
دیارِ خود نگری آئنہ دکھا مجھ کو

نہ جانے کتنے اجالوں کا ہے بھرم مجھ سے
چراغِ خانۂ مفلس ہوں مت بجھا مجھ کو

میں اپنے ظرف کی حد سے نکل نہ جاؤں کہیں
مری انا مرے قامت سے مت بڑھا مجھ کو

چراغ میں بھی تھا اور روشنی بھی رکھتا تھا
بجھا گئی ہے ترے شہر کی ہوا مجھ کو

لبوں پہ حرفِ تمنا کا عکس آنے لگا
دکھا رہا تھا کوئی دل کا آئنہ مجھ کو

درِ خیال پہ دستک کا تھا وہی انداز
ہوائے یار کا جھونکا رلا گیا مجھ کو

چراغِ خلوتِ جاں ہوں اور اس خیال میں ہوں
بجھا نہ دے مرے سانسوں کی بھی ہوا مجھ کو

ملا تو قصۂ ہجر و وصال لے بیٹھا!
کہاں کہاں کے فسانے سنا گیا مجھ کو

لہو میں جیسے وہ جگنو پکڑ کے چھوڑ گیا
کچھ ایسا کھل کے ملا جگمگا گیا مجھ کو

تو اپنی ذات کا پر تو مرے وجود میں دیکھ
جمالِ ارضِ ہنر آئینہ بنا مجھ کو

عجیب شخص تھا تشنہ حریف جاں ہو کر
محبتوں کے سلیقے سکھا گیا مجھ کو

غزل ایک مہتم بالشان اور بوقلموں کردار کی صورت جس طرح ارتقاء پذیر ہوئی ہے، اس کا ایک لازمی خاصہ یہ بن گیا ہے کہ یہ اپنے دل دادگان کو شعورِ ذات ضرور دیتی ہے۔ یہ شعورِ ذات ان لوگوں کو اپنے ذہنی ارتقا اور فکری ترقی، مہارتِ کلام، اور خدبوں کی حیرت ناکی کے ہر ہر مرحلے پہ بار بار ہوتا رہتا ہے۔ شعورِ ذات کے یہی مختلف مرحلے ہیں جن کو تنقید کی مصطلحاتی عزت افزائی، خیال کے اچھوتے پن، بیان کی جزالت، لب و لہجہ کی توانائی سے تعبیر کرتی رہتی ہے۔

(مختار صدیقی)



عبدالحمید عدؔم

سید عبدالحمید نام اور عدؔم تخلص ہے۔ ۱۹۱۰ء میں تلونڈی موسیٰ خان ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ تمام عمر شعرگوئی اور ملٹری اکاونٹنٹ کی ملازمت میں بسر ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ملک سے باہر بھی رہے۔ نظم و غزل دونوں ہی کہی ہیں لیکن غزل سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت ہے۔ قطعہ بھی خوب کہتے ہیں۔ عدؔم کے شعر میں ایک خاص شگفتگی ملتی ہے جو انکی غزل کی پہچان ہے۔

"نقشِ دوام" عدؔم کا اولین مجموعہ کلام تھا۔ جس کے بعد ان کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: خرابات، صنم کدہ، شہرِ خوباں، زلفِ پریشاں، رمِ آہو، نگارخانہ، جنسِ گراں، پیچ و خم وغیرہ۔

عبدالحمید عدمؔ

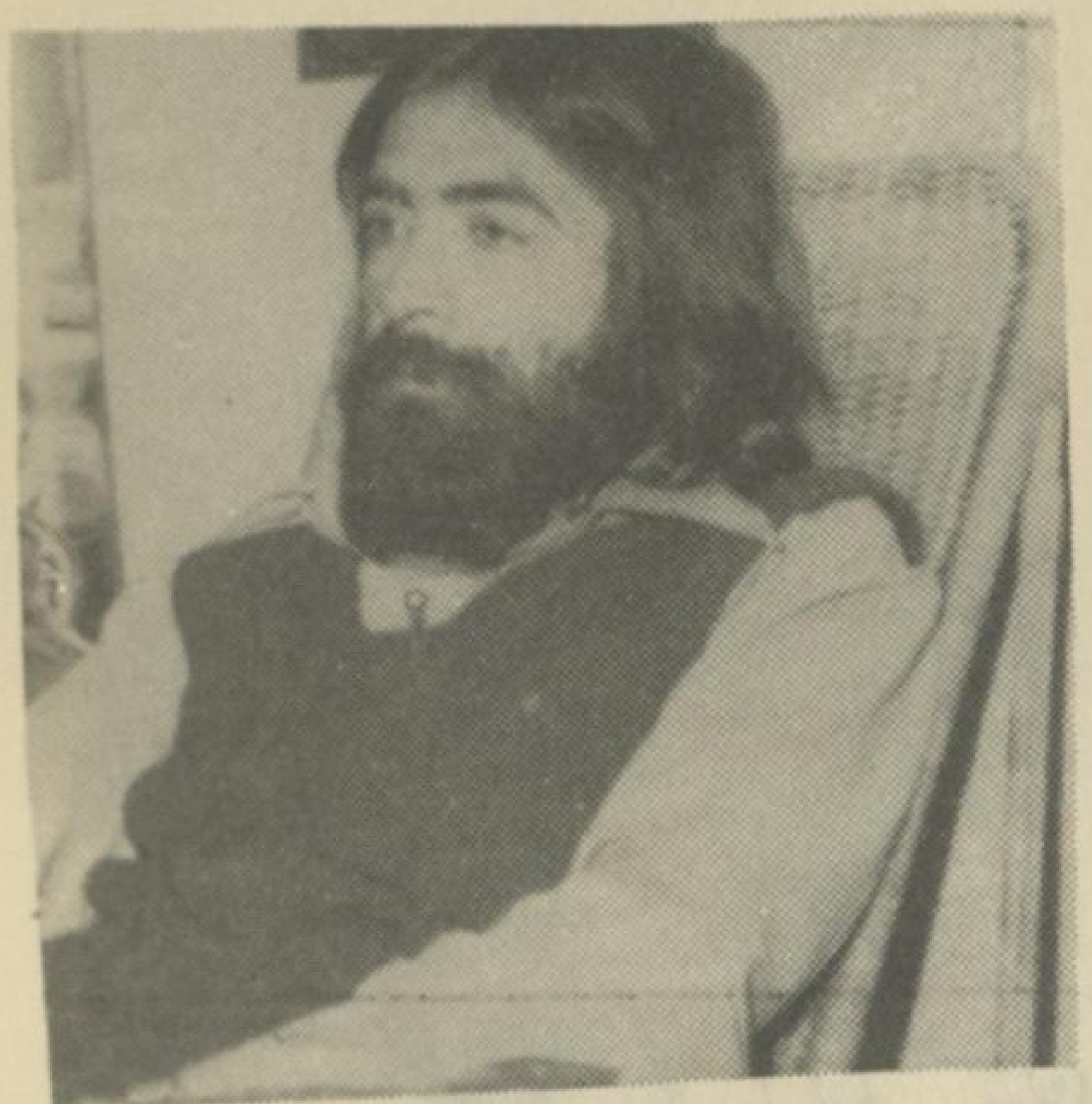
چھیڑو تو اس حسین کو چھیڑو ، جو یار ہو
ایسی خطا کرو ، جو ادب میں شمار ہو

بیٹھی ہے تہمتوں میں ، وفا یوں گھری ہوئی
جیسے کسی حسین کی گردن میں ہار ہو

دن رات مجھ پہ کرتے ہو، کتنے حسین ظلم
بالکل مری پسند کے ، مختارِ کار ہو

کتنے عروج پر بھی ہو ، موسم بہار کا !
ہے پھول صرف وہ ، جو سرِ زلف یار ہو

اک سچّا یار ہی نہیں ، بس یار اے عدمؔ
جاں وار دو ، اگر کوئی جھوٹا بھی یار ہو



عبیداللہ علیم

پیدائش ۱۲ جون ۱۹۴۱ء۔

عبیداللہ علیم کا اولین شعری مجموعہ "چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں"۔ ادبی حلقوں میں خاصا مقبول ہوا ہے۔ کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہونے والا ہے۔ دوسرا مجموعہ ——— "ویراں سرائے کا دیا" اشاعت کے لئے تیار ہے جو عنقریب منظرِ عام پر آجائے گا۔ اس کے علاوہ دو نثری کتابیں بھی زیرِ ترتیب ہیں۔ ایک میں کبھی کبھار لکھی ہوئی ان کی تحریریں ہیں اور دوسری میں ان کے بارے میں لکھے ہوئے دوسرے لوگوں کے مضامین۔

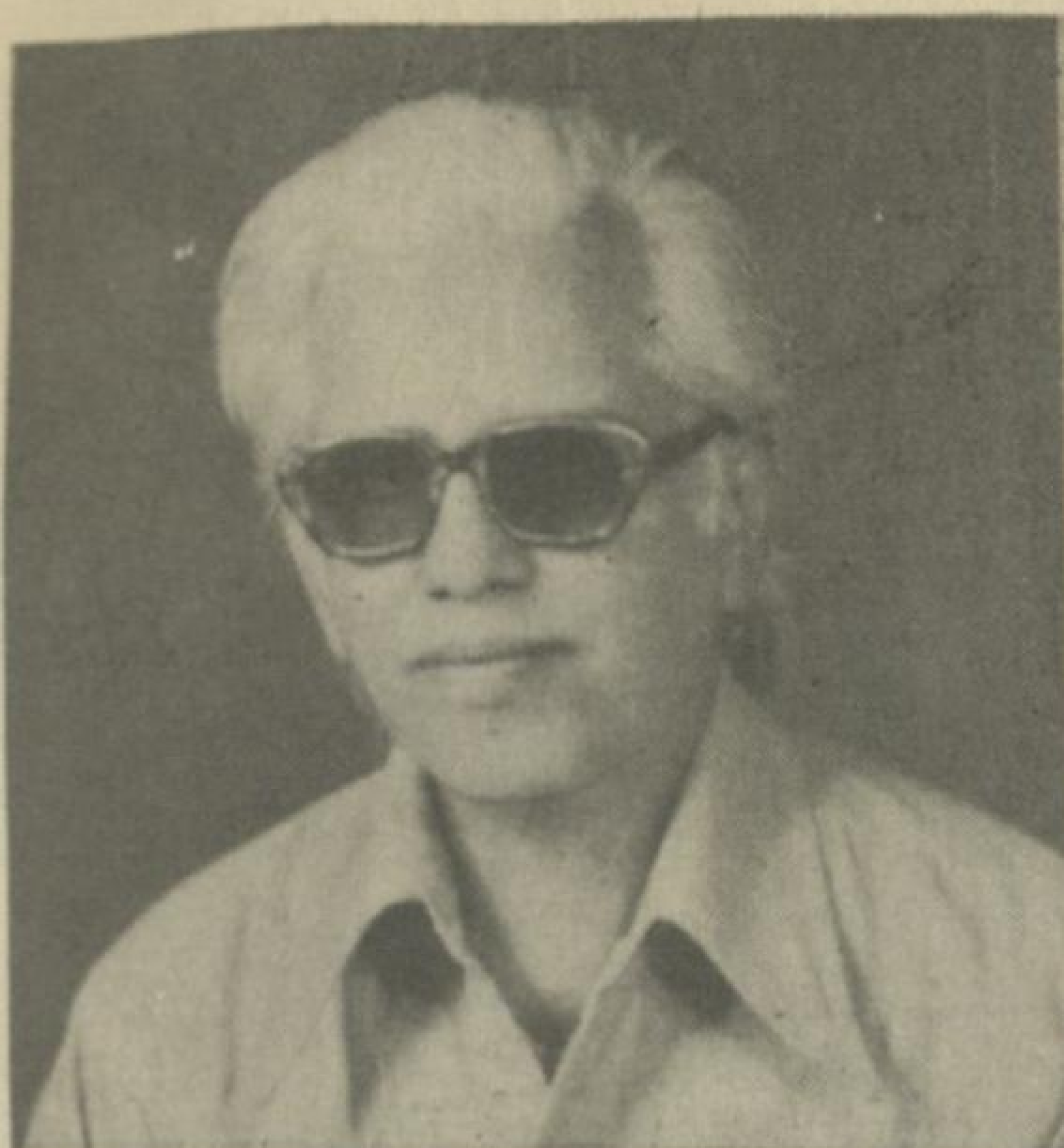
عبیداللہ علیم

کمالِ آدمی کی انتہا ہے
وہ آئندہ میں بھی سب سے بڑا ہے
کوئی رفتار ہوگی روشنی کی
مگر وہ اس سے بھی آگے گیا ہے

جہاں بیٹھے صدائے غیب آئی
یہ سایہ بھی اسی دیوار کا ہے
مجسّم ہو گئے سب خواب میرے
مجھے میرا خزانہ مل گیا ہے

حقیقت ایک ہے لذّت میں لیکن
حکایت سلسلہ در سلسلہ ہے
یونہی حیراں نہیں ہیں آنکھ والے
کہیں اک آئینہ رکھا ہوا ہے

وصالِ یار سے پہلے محبت
خود اپنی ذات کا اک راستہ ہے
سلامت آئنے میں ایک چہرہ
شکستہ ہو تو کتنے دیکھتا ہے



عتیق فکری

آپ کی پیدائش ۱۹۱۷ء میں جولائی کے وسط میں بمقام ملتان ہوئی۔ ابتدائی تعلیم پرائمری تک حاصل کی، پھر اس کے بعد علومِ شرقیہ کی تحصیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اسی دوران تمام فنونِ لطیفہ میں درک حاصل کر لیا۔ آپ چودہ سال کی عمر میں سندھ تھیٹریکل کمپنی میں پردہ پینٹنگ کرتے رہے، پھر لاہور میں آغا حشر کاشمیری کے ہاں چند مہینے کام کیا۔ اسی دوران شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ قریباً دس برس تک ملتان ریڈیو سے بھی وابستہ رہے۔

عتیق فکری کئی رسائل کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ جن میں سلسبیل، جرس، تقاضے، آستانۂ ذکریا، کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اس وقت تک آپ کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "انسان اور خدا" ـــــ "العتیق العتیق" اور سرائیکی زبان کی چار ہزار سالہ تاریخ "ملتانِ قدیم" ـــــ "نقشِ ملتان" کے نام سے ملتان کی مبسوط تاریخ اشاعت کے مراحل میں ہے۔

عتیق فکری کی ذاتی لائبریری میں قریباً سات ہزار کتب اور رسائل مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

عتیق فکری

پھُول اُمید کا کِھلے کیسے
بات بگڑی ہوئی بنے کیسے

راہ برفاب، پاؤں میں زنجیر
زندگی کا سفر کٹے کیسے

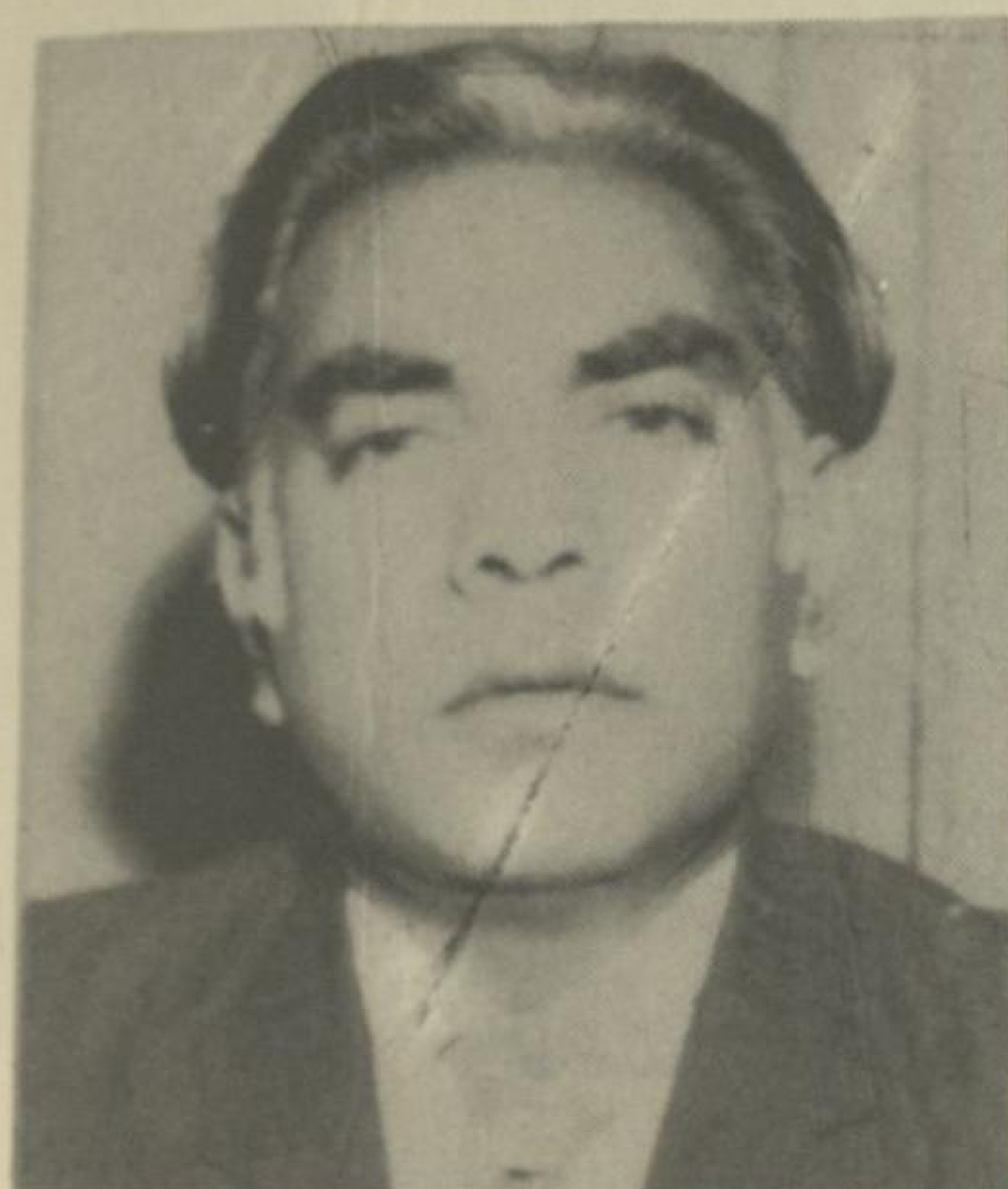
کوئی آیت تو ایسی نازل کر
کوئی بچھڑے تو پھر ملے کیسے

میں تو اپنے لبوں کو سی لوں گا
عشق پر عشق ہے چھپے کیسے

میں ہوں مجبور اور وہ مختار
لکھّا تقدیر کا مٹے کیسے

کوئی طوفان تھا نہ آندھی تھی
سبز پتے مگر جھڑے کیسے

کچھ تو، توُ ہی بتا اے ربِّ جہاں
دل لگا کر کوئی جئے کیسے



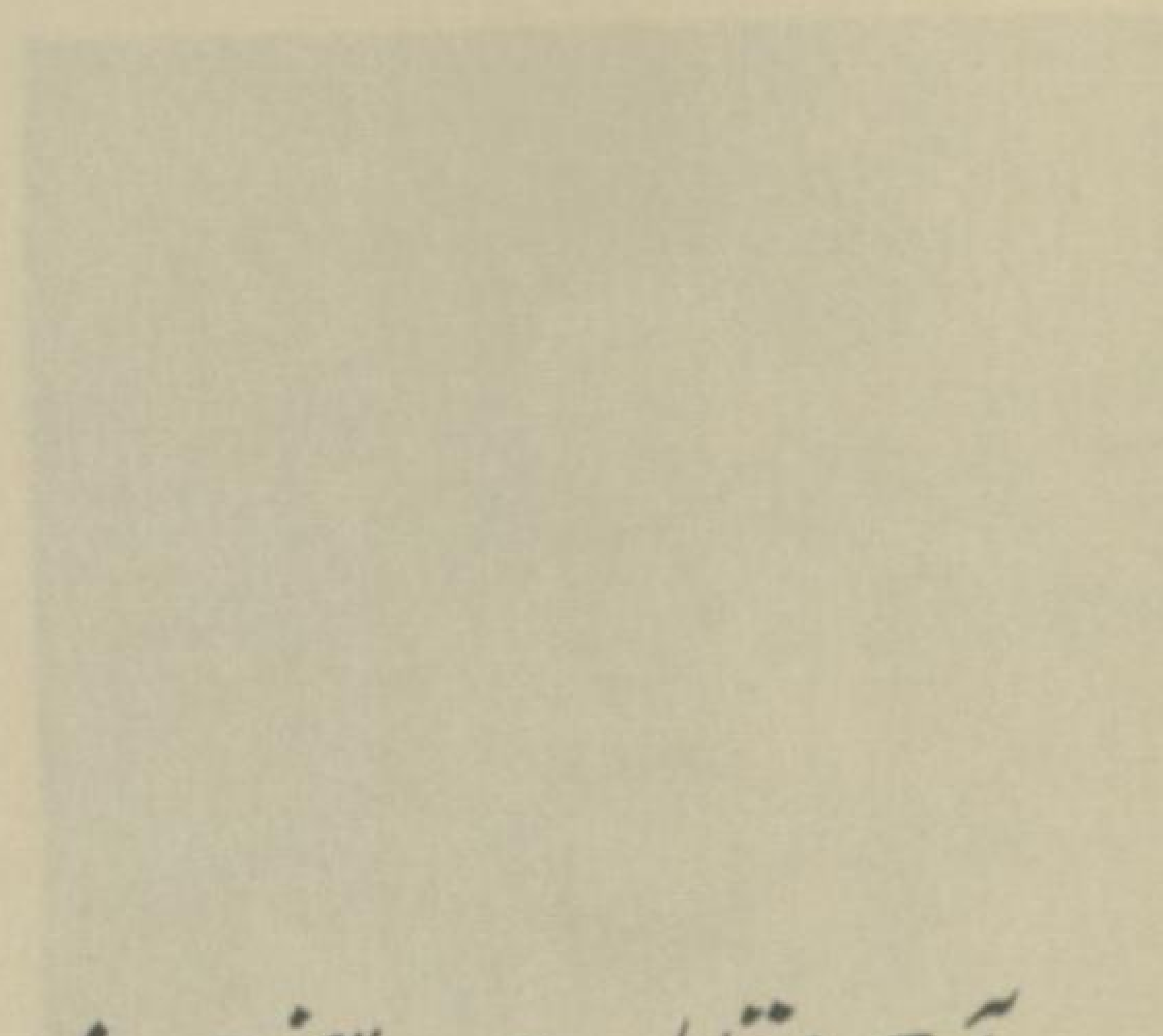
عزیز حامد مدنی

عزیز حامد مدنی، یکم شوال ۱۳۴۴ ہجری مطابق ۱۴ر اپریل ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ انگریزی ادبیات میں ایم، اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ تدریس اور صحافت کے پیشے سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد نشریات کے محکمہ سے منسلک ہو گئے، ان دنوں اسلام آباد میں کنٹرولر آف ہوم براڈ کاسٹنگ ہیں۔

عزیز حامد مدنی کے ۲ دو شعری مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں "چشمِ نگراں" اور ۱۹۶۲ء میں "دشتِ امکاں" ——— ۲ دو مجموعے "نخلِ گماں" اور "مژگانِ خوں فشاں" کے نام سے زیرِ ترتیب ہیں۔

عزیز حامد مدنی کو شاعری کے علاوہ انگریزی اور اردو نثر سے بھی خاص شغف ہے اردو میں تنقید کی کتاب "شعرِ جدید کی حدیں" اور انگریزی میں (CONFLICT OF CULTURE) ابھی شائع نہیں ہوئیں۔ ان کے علاوہ آپ نے جدید فرانسیسی نظموں کا ترجمہ بھی "کور۔ دی تناس" کے نام سے کیا ہے۔ جو تا حال طبع نہیں ہوا ہے۔

عزیز حامد مدنی



آج مقابلہ ہے سختِ میرِ سپاہ کے لئے
ہو گئے سر کئی قلم ایک کلاہ کے لئے

تازہ رُخئ کائنات ڈھونڈھ رہی ہے آئنہ
جستجوئے ہزار میں ایک گواہ کے لئے

کھل ہی گیا طلسمِ دوست عینِ وصال میں کہ تھی
اک شبِ ہجر زندگی لذتِ آہ کے لئے

صورتِ گردِ کارواں ہے غمِ منزلِ جہاں
خوابِ جنونِ تازہ کار چاہیئے راہ کے لئے

آتشِ کیمیا گراں کام نہ آسکی کوئی
سرمہ ہے خاکِ دل مری چشمِ سیاہ کے لئے

اک شبِ خود نمائی میں عصمتِ بےمقام نے
کتنے سوال کر لئے رمزِ گناہ کے لئے

تیرے وصال نے طلب میری خود آگہی بھی کی
ہجرِ ہزار شب کے بعد ایک نگاہ کے لئے



عشرت آفریں

عشرت آفریں کا خاندانی نام فاطمہ ہے۔ والد کا نام سیّد محمد ناصر ہے جو پیشہ کے لحاظ سے ایڈووکیٹ تھے، آپ ۲۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو بمقام اترولہ (اترپردیش بھارت) پیدا ہوئیں۔ ۱۹۶۲ء میں پاکستان آگئیں اور جب سے کراچی ہی میں رہائش پذیر ہیں۔

عشرت آفریں، بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد، تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہو گئیں، آپ رسالہ "آواز" کراچی کی نائب مدیر بھی ہیں۔

آپ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۷۱ء میں کیا۔ آپ کا کلام ملک کے مقتدر ادبی جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

مجموعۂ کلام ابھی ترتیب نہیں دیا ہے۔

عشرت آفریں

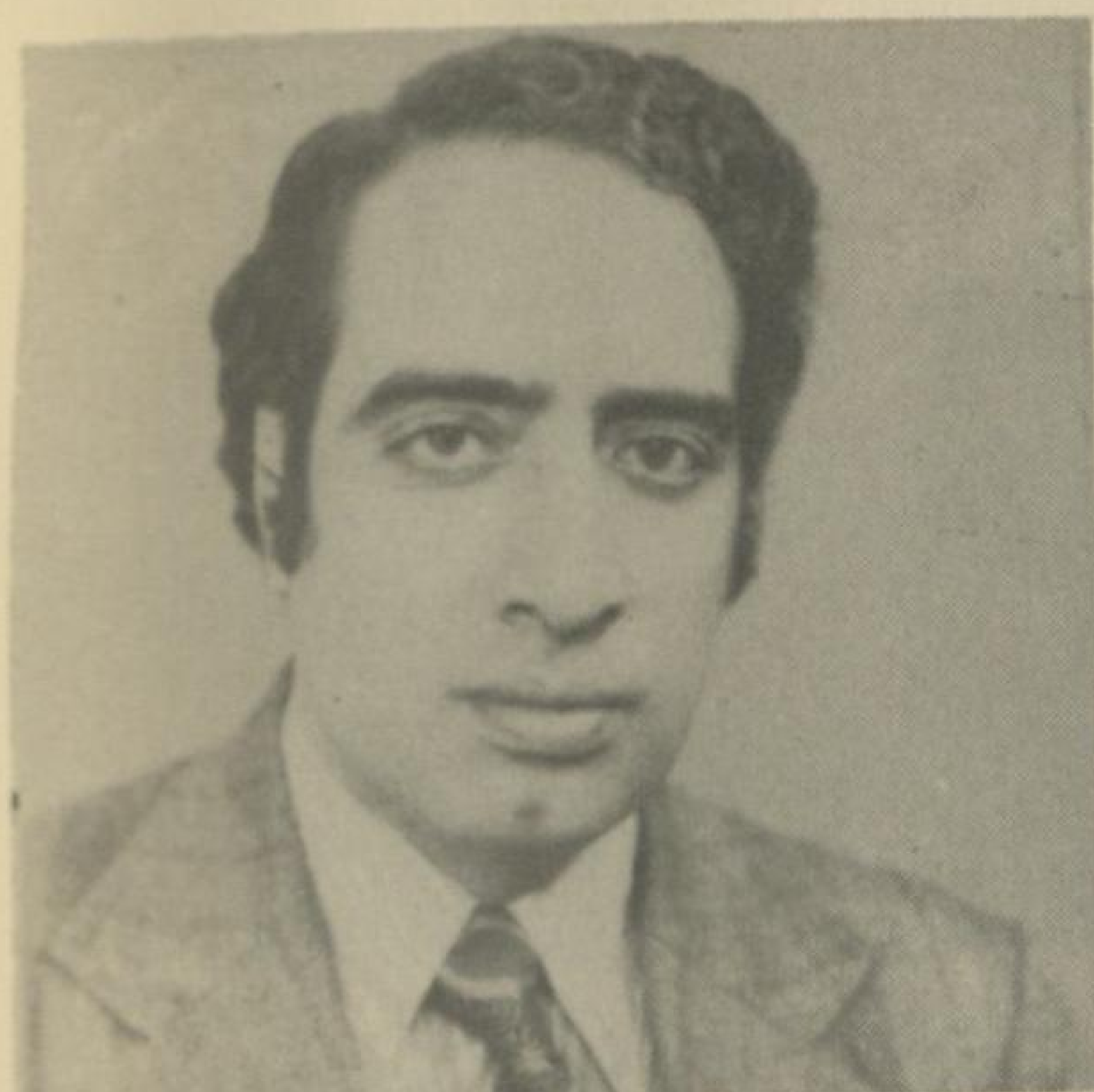
کپاس چنتے ہوئے ہاتھ کتنے پیارے لگے
مجھے زمیں سے محبت کے استعارے لگے

تمام رات جو لڑتے رہے تھے طوفاں سے
عجیب لوگ تھے تھک ہار کر کنارے لگے

مجھے تو باغ بھی مہکا ہوا الاؤ لگا
مجھے تو پھول بھی ٹھہرے ہوئے شرارے لگے

وہ ہم نہ تھے جسے آنکھیں نچوڑ کر دی تھیں
وہ تم نہ تھے جسے ہم اپنی جاں سے پیارے لگے

اُس ایک رات قیامت کی بارشیں ٹوٹیں
مری شکستہ حویلی پہ جب پچارے لگے



عطاالحق قاسمی

نام عطاالحق قاسمی۔ یکم فروری ۱۹۴۳ء کو امرتسر (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کرنے کے بعد تدریس سے منسلک ہو گئے۔ ان دنوں ایم اے او کالج لاہور میں لیکچرار ہیں۔ شعروادب کے علاوہ کالم نویسی سے بھی تعلق ہے۔ نوائے وقت لاہور میں شائع ہونے والے کالموں کا انتخاب "روزنِ دیوار سے" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے جس پر ان کو آدم جی انعام بھی ملا ہے۔ انہوں نے حال ہی میں منتخب غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل ایک ضخیم ادبی مجلّہ "معاصر" ترتیب دیا ہے جو ادبی حلقوں میں خاصا مقبول ہوا۔

عطاالحق قاسمی کی غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اخباری کالموں کا دوسرا انتخاب "عطائیے" زیرِ ترتیب ہے۔ "شوقِ آوارگی"۔ "جلاوطن" اور "مسافتیں" سفرنامے ہیں جو اشاعت کے مراحل میں ہیں۔ انہوں نے خاکوں پر مشتمل کتاب "مزید گنجے فرشتے" کے نام سے ترتیب دی ہے۔ سفرنامہ لاہور (طنز و مزاح) اور "آشوبِ ہوا" (مجموعۂ کلام) بھی زیر ترتیب ہیں۔

عطاالحق قاسمی

تب سے سوچ رہا ہوں، میری آنکھوں نے کیا دیکھا ہے
کیسے برے دنوں میں کیسا اچھا چہرہ دیکھا ہے

نیلی نیلی آنکھوں میں کچھ حیرت سی، کچھ وحشت سی
سبز پہاڑوں کے دامن میں روپ سویرا دیکھا ہے

نگری نگری پھرتے پھرتے اپنے بال سفید ہوئے
تب ان دکھ کی راتوں میں اک سکھ کا سپنا دیکھا ہے

اس کے پیچھے چلتے چلتے گھر سے نکل جاؤ گے دور
تم نے کس کی مٹھی میں خوشبو کا جھونکا دیکھا ہے

کتنے دنوں کے بعد عطاؔ نے اپنے بال سنوارے ہیں
آئینے میں اس نے اپنا ہنستا چہرہ دیکھا ہے



عطا شاد

اصل نام اسحاق عطا محمدؐ ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو بمقام سنگان سر، تربت مکران (بلوچستان) ہوئی۔ شادؔ نے ۱۹۶۲ء میں گریجویشن کیا۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے وابستہ رہے۔ محکمۂ اطلاعات میں بطور افسر اطلاعات پشاور اور ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز بلوچستان، کوئٹہ بھی رہ چکے ہیں۔ آج کل پاکستان آرٹس کونسل بلوچستان کوئٹہ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد سرکاری اور نیم سرکاری، ادبی و ثقافتی اداروں کے رکن رہے ہیں۔

آپ کی تصانیف میں بلوچی نامہ (اردو) بلوچی لوک گیت (مع اردو ترجمہ) گشین (جدید بلوچی شعراء کا کلام) جواں سال (بابا جواں سال کا کلام) شامل ہیں۔ بلوچی اردو لغت بھی ترتیب دی۔ ہفت زبانی لغت کے مرتبین میں بھی شامل رہے ہیں۔

پہلا شعری مجموعہ سنگاب زیرِ ترتیب ہے۔

عطا شاد

حرف ہیں لب اور آنکھیں صوت ہیں، چہرہ کھلی کتاب
خاموشی پڑھتی ہے لیکن روز اک نئی کتاب

روشنیاں آنکھوں میں اتریں تیرے نام کے ساتھ
ایک کتاب کھلی پھر کیا تھا، کھلتی گئی کتاب

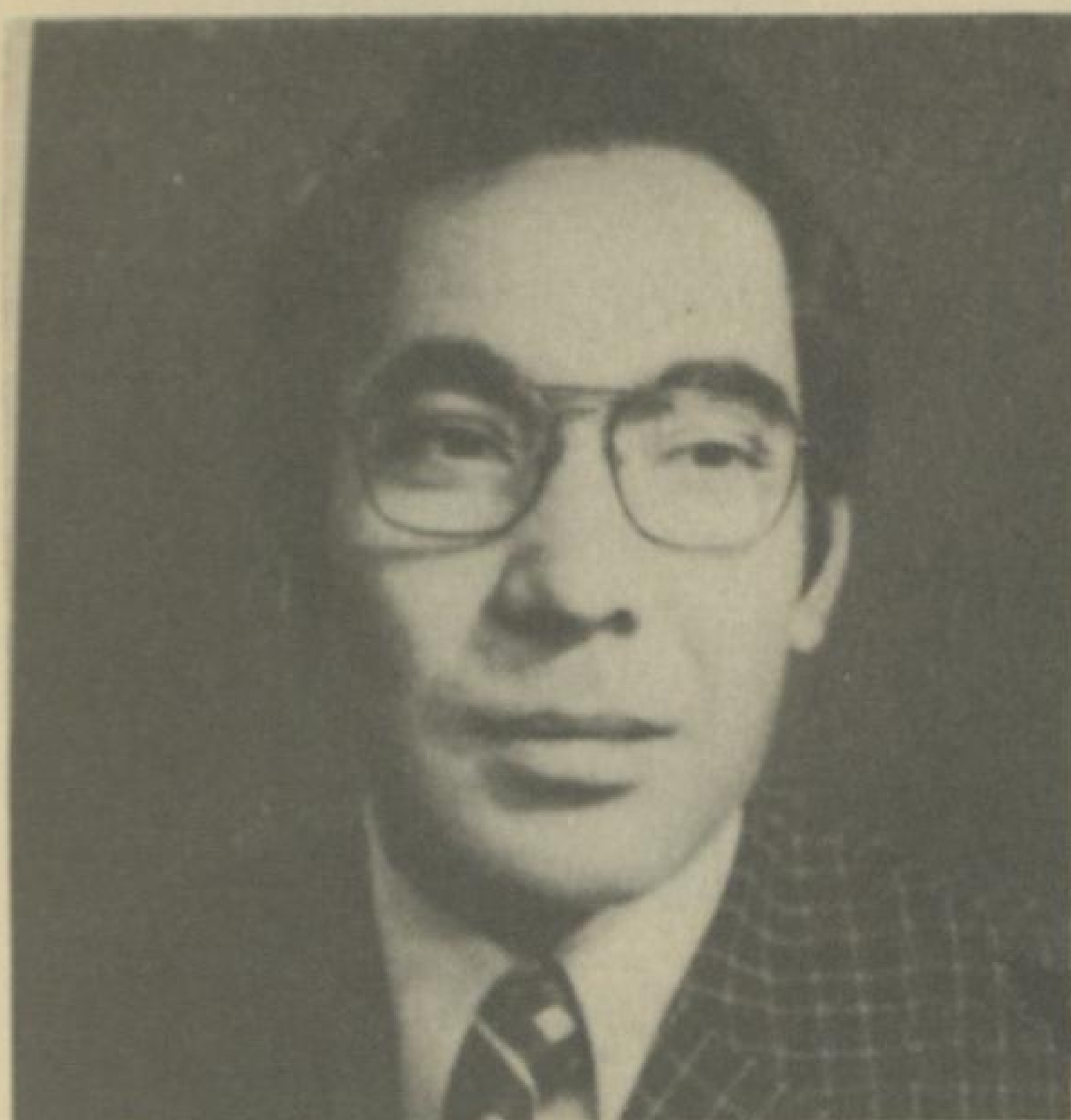
یوں ہر روز دعاؤں میں ہے، تیرے حسن کا ورد
رحل پہ ہاتھوں کی رکھی ہو، جیسے کوئی کتاب

برف کی رات سنا کرتا تھا، تیرے جسم کے گیت
یاد کے موسم میں پڑھتا ہوں آج بھی وہی کتاب

لمس کی تہ میں عکس ہو جیسے، پسِ نظر ہو رنگ
گیان مسافت کے ہر پل میں لَو دے تری کتاب

کب تک تسبیحوں میں چلتے، تیرے شبنم خواب
آگ کے فوّاروں میں آخر، جل کر رہی کتاب

شادؔ مجھے سمجھاتے ہو تم، ریکھاؤں کی ریت
اسے کتاب پڑھاؤ گے کیا، جس نے لکھی کتاب



علی احمد قمرؔ

آپ پاکستان کے انتہائی شمالی خطّے بلتستان کے رہنے والے ہیں۔ اردو میں ۱۹۶۰ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔

کسی سے باقاعدہ اصلاح نہیں لی۔ صرف اچھی کتابوں کا مطالعہ اور اچھے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کام آیا۔ غزل کے علاوہ چند جدید نظمیں بھی کہیں۔ غزلوں اور نظموں پر مشتمل پہلا شعری مجموعہ "زخمِ گُل" کے نام سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔

قمر صاحب پاکستان ٹیلی ویژن کے شعبۂ نشریات سے منسلک ہیں۔

علی احمد قمرؔ

بسا گیا مری آنکھوں میں شہرِ خواب کوئی
مجھے تو جسم بھی اپنا لگے سراب کوئی

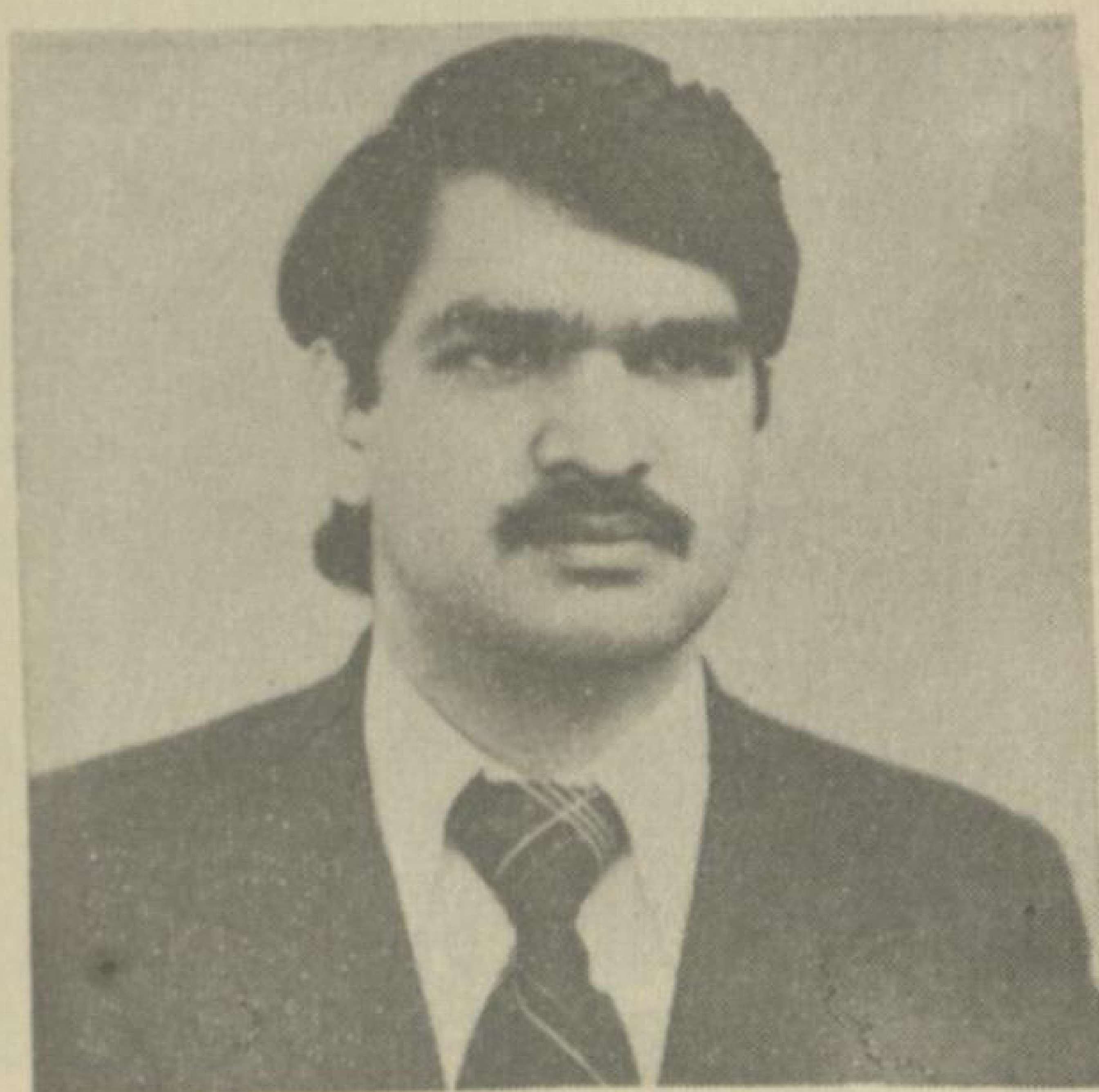
یہ کیا کہ نیند میں بیدار ہیں مری آنکھیں
مَیں جاگتا ہوں تو دیتا ہے اذنِ خواب کوئی

مَیں حرف حرف میں صوت و صدا تلاش کروں
وہ نقش نقش ہو گویا کھلی کتاب کوئی

اُسے میں یاد بھی کرتا تو کس حوالے سے
کہ ایک عہد سے اترا نہیں عذاب کوئی

نئی رُتوں کی بشارت بھی اس کو دوں کیسے
فصیلِ شب پہ تو ٹھہرا نہ ماہتاب کوئی

قبول و رَد کے مراحل میں ہے مری پہچان
یہ آئنہ بھی دکھاتا ہے عکسِ آب کوئی



علی اکبر عباس

نام علی اکبر عباس والد کا نام ماسٹر چراغ دین۔ پیدائش ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو جھنگ شہر میں ہوئی۔ بی کام آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ اسی دوران طبیعت شعرو سخن کی طرف مائل ہوئی۔

گذشتہ سات برس سے پاکستان ٹیلی وژن کارپوریشن سے بحیثیت پروگرام پروڈیوسر وابستہ ہیں۔ بہ سلسلۂ ملازمت پہلے کراچی میں رہے اور اب لاہور میں ہیں۔

۱۹۷۸ء میں ان کا اولین مجموعۂ کلام "برآبِ نیل" شائع ہوا۔ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ پنجابی شاعری کا مجموعہ "ننگی اکھ دا روگ" ترتیب دے چکے ہیں۔ ابھی اشاعت پذیر نہیں ہوا۔ اپنے بارے میں ان کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں، لکھتے ہیں :۔

"فلسفہ و تہذیب میرے مطالعہ کا خاص موضوع ہیں۔
دعا میں بے صبرا ہوں، ملنے پر شکر گذار — موحد ہوں اس لئے
سب جھگڑے اللہ میاں سے خود ہی نمٹانے پڑتے ہیں"۔

علی اکبر عباس

دن چڑھا گلی آباد ہوئی بڑھیوں کی جمی چوپال بھلا
گودوں میں پوتے پوتیوں کی کبھی ناک بہے کبھی رال بھلا
کوئی چرخہ ڈاہ لوگڑ کاتے ، کوئی بالوں کی رسی باٹے
کوئی کھیس کے بمبل باندھے تو کوئی لگ جائے اس کے نال بھلا
کوئی چھاج چنگیر بُننے بیٹھی ، یا رنگلی پنیوں کی پنکھی
کوئی چاول پھٹکے صاف کرے ، کوئی چُننے بیٹھ کے دال بھلا
سن پھیری والے کی گھنٹی ، کسی بچے نے جوروں راں کی
چُنّی کا کونا کھول کہا ، لو ایک ٹکا میرے لال بھلا
کچھ دکھ سکھ پچھلے ویلے کے ، کچھ یادیں الھڑ عمروں کی
سب اگلی پچھلی نسلوں تک پھیلے باتوں کا جال بھلا
کوئی شادی ہے یا گود بھری ، کوئی مرا یا مرنے والا ہے
سب اک دوجی کو آن کہیں ، سارے گاؤں کا حال بھلا
کھڑکی سے بہو آوازیں دے ، چل اندر آجا ہُن بے بے
مجھے ہانڈی روٹی کرنی ہے ننکڑے کو آن سنبھال بھلا
کل ان کی کوئی بہو بیٹی ، یہ سب کچھ دہراتی ہوگی
اللہ کرے ان گلیوں کے یونہی بیتیں ماہ و سال بھلا



علی سجاد مہرؔ

۱۵ستمبر ۱۹۱۶ء کو دہلی کے نزدیک قصبہ غازی آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایک ایسے گھرانے میں پرورش پائی جو شعر و ادب کا سرچشمہ تھا۔ آپ کے والد حضرت نیرؔ اکبر آبادی اور ماموں نجم آفندی متعارف ادبی شخصیات ہیں۔

مہر صاحب نے ۱۹۳۷ء میں میرٹھ کالج سے بی اے کیا۔ ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی ٹی اور ۱۹۴۷ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ جولائی ۱۹۴۹ء میں پاکستان آئے اور محکمۂ تعلیم میں لیکچرار ہو گئے۔ ان دنوں اسلام آباد میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔

یوں تو مہرؔ کی ادبی زندگی کا آغاز سکول ہی کے دنوں سے ہو گیا تھا لیکن اس ذوق کو جلا دراصل کالج کے زمانے میں حاصل ہوئی۔ آپ نے شعر سے زیادہ نثر لکھی ہے۔ مہرؔ کا پہلا قابلِ ذکر مقالہ نگار لکھنؤ میں ۱۹۴۱ء کے مختلف شماروں میں بالاقساط شائع ہوا۔ آپ کا ایک شعری مجموعہ اور دو نثری کتابیں زیرِ ترتیب ہیں۔

علی سجاد مہر

تیر سا قلبِ فسردہ پہ ترا پیار لگے
انتہا ہو گئی اب عشق بھی آزار لگے

سر پہ میرے ہے کڑی دھوپ غموں کی لیکن
دھیان آئے جو ترا سایۂ دیوار لگے

آن پہنچی ہے اب اس حد پہ نزاکت دل کی
پیار کی بات بھی اب تو مجھے تلوار لگے

اے دلِ زار اسے عشق کی خامی ہی سمجھ
بدلی بدلی سی کبھی جب نگہِ یار لگے

میرے احباب کے کیا مجھ پہ کرم ہیں مت پوچھ
مختصر یہ۔ مرے دشمن مجھے غم خوار لگے

خود فریبی اسے کہہ لیجئے یا سادہ دلی
رات تھی اور ہمیں صبح کے آثار لگے

تم سے جو زخم لگا، اس نے سنبھلنے نہ دیا
ورنہ پہلے بھی ہمیں زخم کئی بار لگے

جان لینا کہ بس اب روزِ قیامت ہے قریب
مہرؔ کی بات بھی جب تم کو دل آزار لگے



عنایت علی خاں

پیدائش ۱۹۳۵ بمقام ریاست ٹونک۔ خاندان میں شعر و ادب کا چرچا بہت تھا۔ سات سال کی عمر میں پہلا شعر موزوں کیا۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے خاندان پاکستان آیا اور حیدرآباد میں مقیم ہوا۔ نامساعد حالات کے سبب دو تین سال تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا بعد ازاں گورنمنٹ اسکول حیدرآباد سے میٹرک اور سٹی کالج حیدرآباد سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد بی، ٹی کیا۔ ۱۹۶۲ء میں ایم، اے میں اوّل رہے۔

اردو کی درسی کتب برائے مدارسِ صوبہ سندھ، مقابلہ کی بنیاد پر لکھیں اور چھ کتابوں پر انعام ملا۔

عنایت علی خان کی تخلیقات جسارت، ایشیا اور سیارہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مزاحیہ اسٹیج ڈرامے بھی لکھے جو مقامی تعلیمی اداروں میں پیش کئے گئے۔

مجموعۂ کلام ابھی شائع نہیں ہوا۔

عنایت علی خان

ہوس کے شہر، طلب کے نگر میں رہتے ہیں
مقیم ہوتے ہوئے بھی سفر میں رہتے ہیں

اگرچہ محبس دیوار و در میں رہتے ہیں
یہ خوش گماں ہیں کہ ہم اپنے گھر میں رہتے ہیں

پڑوس کی کوئی آواز ہم کو پا نہ سکی
حفاظتِ نگہہ خود نگر میں رہتے ہیں

نشاطِ کم نگہی ہو کہ کربِ دیدہ وری
یہ سب مقام ہماری نظر میں رہتے ہیں

ہمارے عزم کو آسانیاں نہ بھٹکا دیں
اسی خطر سے رہِ پُر خطر میں رہتے ہیں

حدودِ ہوش میں آتے بھی ہیں جو دیوانے
تلاشِ چارہ گر و بخیہ گر میں رہتے ہیں

انہیں تو سایۂ ابر رواں بھی رحمت ہے
جو کم نصیب ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں

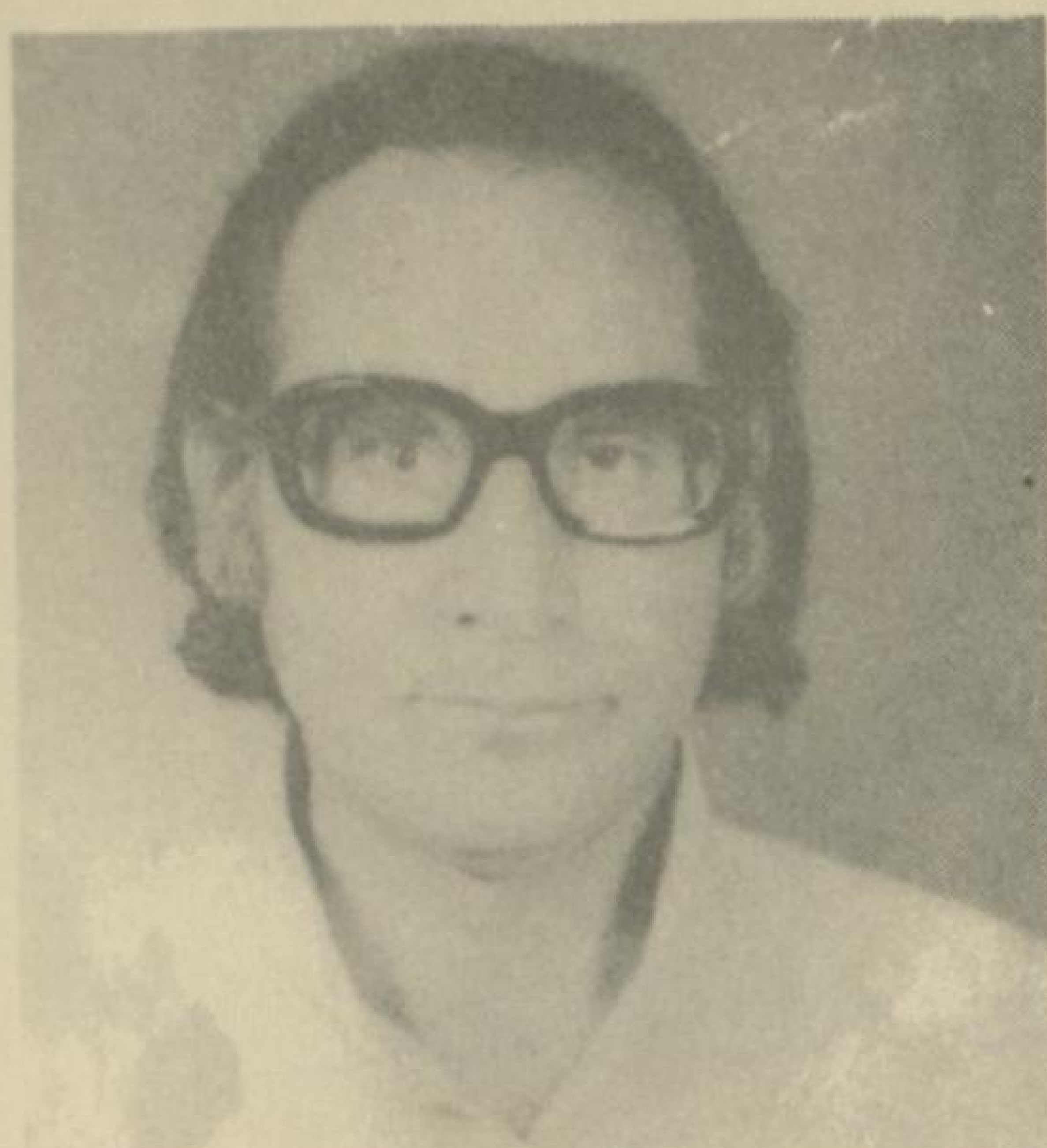
نظر جو تھک کے پلٹ آئے روزنِ در سے
امیدِ جنبشِ زنجیرِ در میں رہتے ہیں

پتہ جو پوچھ ہی بیٹھا کوئی تو کہہ دیں گے
غریبِ شہر ہیں، ہر رہگذر میں رہتے ہیں

بدلتی رُت کی ہوا کا کچھ اعتبار نہیں
عنایت ایسے سمے لوگ گھر میں رہتے ہیں

ہمارے دور میں یوں تو ہر قسم اور ہر قماش کے غزل گو پائے جاتے ہیں، مگر ان میں جو ذرا قابلِ برداشت قسم کے لوگ ہیں ان کو دو بڑی قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جن کا کلام تازگی کا احساس دلاتا ہے اور ایک وہ جن کی غزل میں پختگی پائی جاتی ہے (جن کے پاس نہ پختگی ہے نہ تازگی ان کا کیا ذکر)۔ ان دونوں میں سے کسی ایک گروہ کو پسند اور دوسرے کو ناپسند کرنے کی کوئی وجہ نہیں، پھر بھی تازگی رکھنے والے پختگی رکھنے والوں سے کم سے کم مجھے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ یوں کہ جس کے یہاں تازگی ہے اسے ہو سکتا ہے کہ پختگی بھی نصیب ہو جائے مگر جس کا کلام فقط پختگی کی پیداوار ہے اسے تازگی کا تحفہ کسی نئے جنم ہی میں ملے تو ملے۔

(مظفر علی سید)



عین سلام

پورا نام سید عبدالسلام بخاری۔
۱۹۲۹ء آپ کا سالِ پیدائش ہے۔ بلوچستان کے رہنے والے ہیں۔
گذشتہ پنتیس سال سے اردو میں شعر کہہ رہے ہیں۔
عین سلام کے دو شعری مجموعے "چاند آئینے میں" اور "چکیدہ" اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ بلوچی لوک گیت اور پشتو لوک گیت کے اردو تراجم "درپن" اور "سیلاب" کے نام سے بلوچی اکیڈمی اور پشتو اکیڈمی کی طرف سے چھپ چکے ہیں۔ نظموں اور غزلوں کے دو مجموعے "برناگ" اور "میرے خواب سراب" زیرِ ترتیب ہیں۔ عین سلام نے بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں پر مشتمل ایک کتاب "چہکار" کے نام سے جلد ہی شائع ہونے والی ہے۔

عین سلام

نہ تیرگی کے لیے ہوں نہ روشنی کے لیے
ستارۂ سحری ہوں میں زندگی کے لیے

یہ کون وقت کی صورت مجھے بدلتا ہے
یہ کیا کسی کے لیے کچھ ہوں کچھ کسی کے لیے

سراب خواب کی تعبیر جوئے آب سہی!!
میں سوچتا ہوں مگر دشتِ تشنگی کے لیے

وہ مطمئن ہوں گماں کو یقیں سمجھتا ہوں
یقیں کہ خود نہیں کچھ کم جو گمرہی کے لیے

کہیں وہ میری طرح میرا آشنا ہی نہ ہو
ہزار خواب بُنوں میں جس اجنبی کے لیے

وہ آسماں ہو کہ صحرا، وجود ہو کہ عدم
فضا بنی ہے یہ کس شرحِ خامشی کے لیے

کسی کنارے غمِ زندگی لگے تو کھلے
تلاطموں میں سفر ہے یہ کس خوشی کے لیے

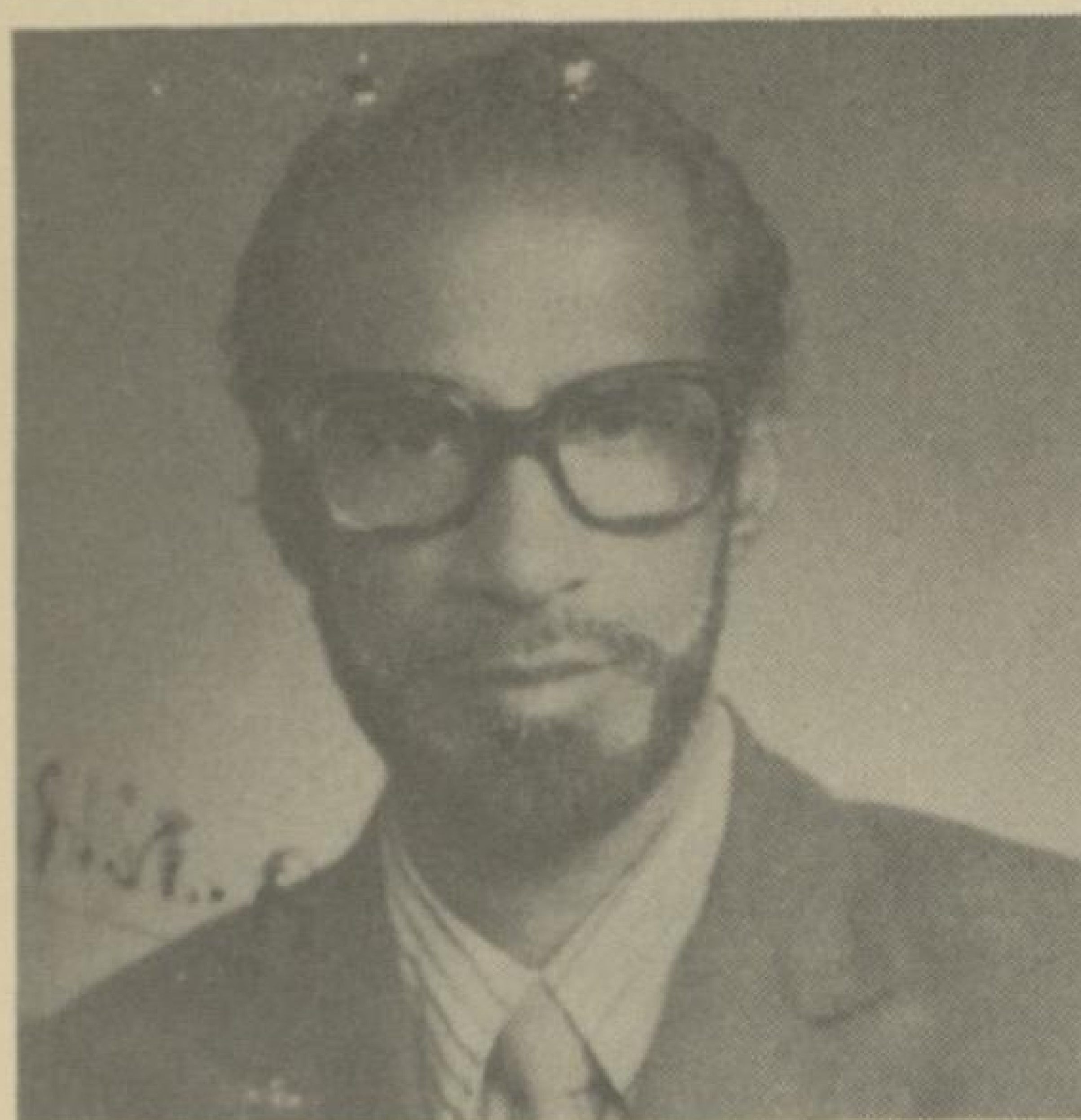
قریب کا وہی منظر ہے دور سے کچھ اور
ہر ایک رُخ ہے نیا چشمِ آگہی کے لیے

کبھی جب اس سے ملوگے تو خود سمجھ لوگے
بناؤ کتنا ضروری ہے سادگی کے لیے

ہر ایک دل کو یہ دولت کہاں نصیب سلاؔم
دعا نہ مانگ کبھی دردِ میں کمی کے لیے

عاشقانہ غزل گوئی کی ہمارے ہاں ایک ہی تو اہم روایت ہے۔ ہجر و فراق اور درد و الم والی غزل گوئی جس میں ہر تجربہ عشق و عاشقی کی فضا سے تقویت پاتا ہے۔ اس غزل گوئی کی عام جذباتی فضا عشقیہ الفاظ و اصطلاحات سے برگ و بار حاصل کرتی ہے۔

(ڈاکٹر وحید قریشی)



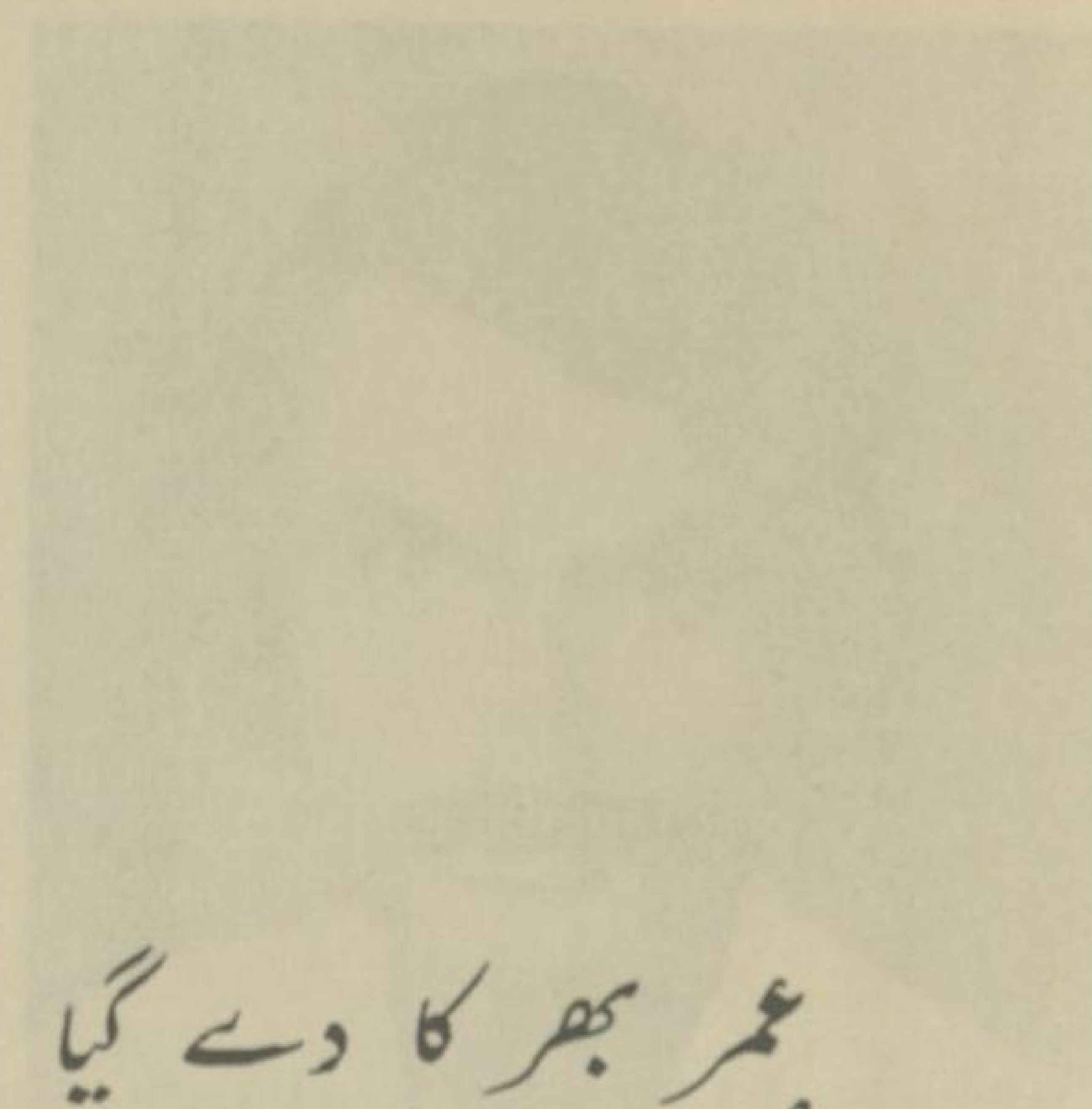
غلام جیلانی اصغر

شاعر، نقاد اور انشائیہ نگار۔ ان کے حالات خود انہی سے سنتے ہیں :۔

"سرکاری طور پر ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوا۔ غیر سرکاری طور پر کوئی سن کوئی گھڑی مناسب سمجھی جا سکتی ہے۔ ایک نجومی نے مجھے رازدارانہ طور پر بتایا تھا کہ اس سال یا اس کے قرب و جوار میں کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جس میں بڑا شاعر بننے کے امکانات پائے جاتے ہوں تعلیم ایم اے (انگریزی ادبیات)۔ ایم اے انگریزی میں اتفاقی طور پر داخلہ لے لیا۔ کیونکہ کوئی اور ایسی جگہ نہیں تھی جہاں داخلہ لے سکتا۔ پھر چالیس سال تک انگریزی پڑھاتا رہا۔ اور چالیس سال کی طویل نوکری کے بعد جب ریٹائر ہوا تو یہ راز کھلا کہ جس زبان کو میں انگریزی سمجھ کر پڑھاتا رہا وہ دراصل اردو پنجابی سے کوئی ملتی جلتی زبان تھی۔ غالباً میری انگریزی دانی سے ہی متاثر ہو کر مولانا صلاح الدین مرحوم نے ـــــ "اردو بولو، اردو لکھو اور اردو پڑھو" ـــــ کی تحریک چلائی تھی۔"

غلام جیلانی اصغر نے نصابی کتب بھی لکھیں۔ جن میں کچھ طلباء میں خاصی مقبول ہوئیں، غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر "نذرِ غالب" کے عنوان سے ایک کتابچہ مرتب کیا تھا۔ ۱۹۶۸ء کے بہترین شعری اور نثری ادب کا انتخاب ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ مل کر ترتیب دیا۔ انشائیوں کا مجموعہ زیرِ طباعت ہے۔ شعری مجموعہ "میں اور میں" کے عنوان سے مستقبل قریب میں منظرِ عام پر آجائے گا جو بقول شاعر مشرق قریب کی طرح ہے۔ یعنی آپ جوں جوں اس کے قریب ہوتے جاتے ہیں، یہ دور ہوتا جاتا ہے۔

حال ہی میں بطور پرنسپل گورنمنٹ کالج سرگودھا ریٹائر ہوئے ہیں۔ حکومتِ پاکستان نمغۂ امتیاز کا اعزاز دے چکی ہے۔



غلام جیلانی اصغر

عمر بھر کا دے گیا کوئی ستم گر سوچنا
اُس سے مل کر سوچنا، اُس سے بچھڑ کر سوچنا

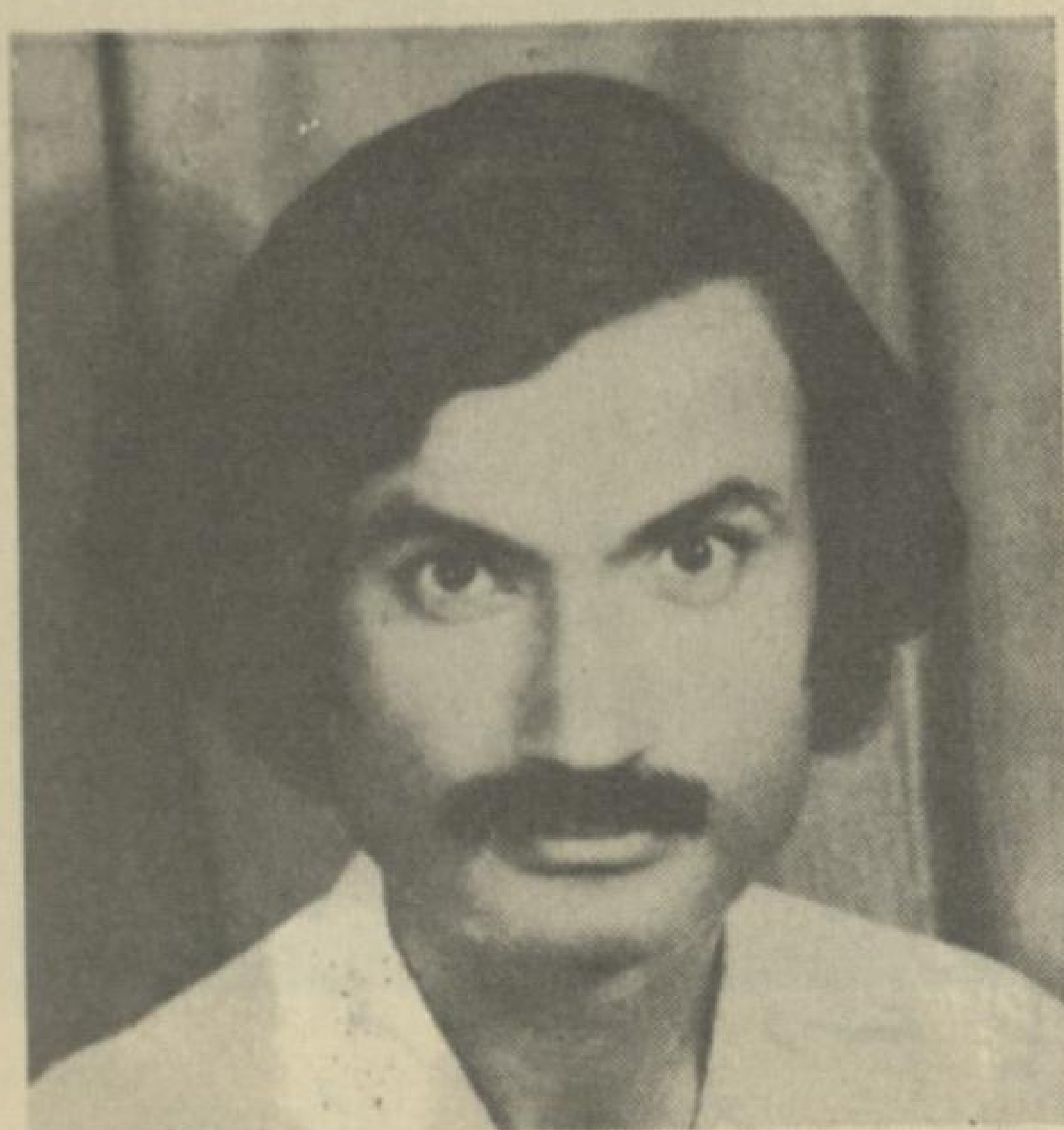
جس کو دیکھو اُس کے چہرے پر لکیریں سوچ کی
جیسے ہو جائے کسی شے کا مقدّر سوچنا

شاخِ گل ہوتا تو دیواروں سے تجھ کو جھانکتا
اب تو سب کو دیکھنا، اور آنکھ بھر کر سوچنا

رات خوابوں میں کئی دھندلے مناظر دیکھنا
دن کی تنہائی میں بھی خوابوں کا اکثر سوچنا

ٹوٹتا رہتا ہوں پہروں میں تضادِ کرب سے
اپنے باہر مسکرانا، اپنے اندر سوچنا

میں پرندہ ہوں کسی دن شاخ سے اُڑ جاؤں گا
پھر گئے گزرے دنوں کا، موجِ صرصر سوچنا



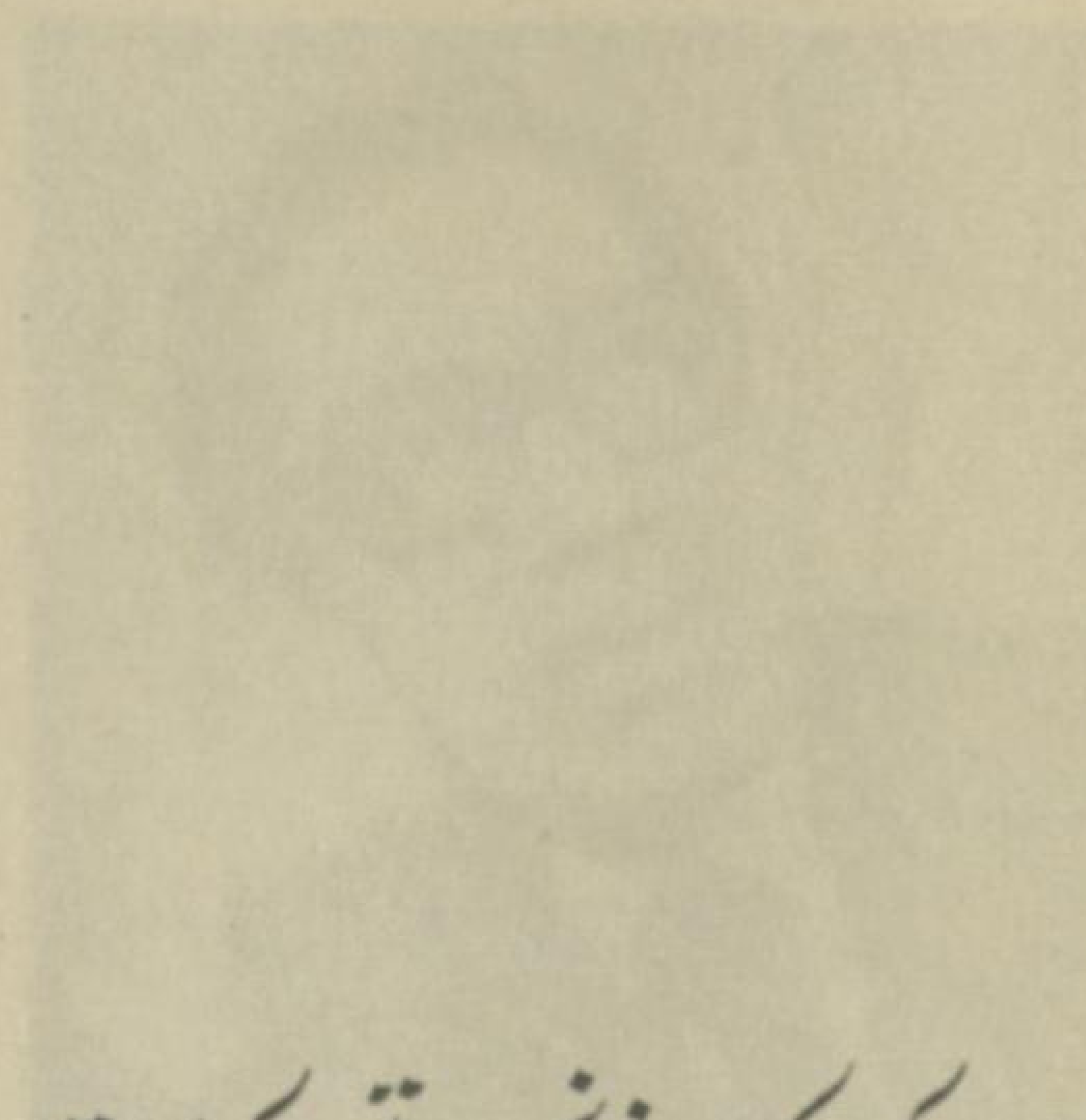
غلام محمد قاصر

۴ ستمبر ۱۹۴۱ء کو بمقام پہاڑپور — (ڈیرہ اسماعیل خان) پیدا ہوئے۔ اور وہیں سے ۱۹۵۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پہلے اپنے طور پر فاضل اردو اور پھر ایم اے اردو کے امتحانات پاس کیے۔

میٹرک کے بعد ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۷۵ء سے گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج مردان میں شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

قاصرؔ کا مجموعۂ کلام "تسلسل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

غلام محمد قاصر



جذبوں کو کیا زنجیر تو کیا، تاروں کو کیا تسخیر تو کیا
وہ شخص نظر بھر رک نہ سکا، احساس تھا دامن گیر تو کیا

کچھ بنتے مٹتے دائرے سے، اک شکل ہزاروں تصویریں
سب نقش و نگار عروج پہ تھے آنکھیں تھیں زوال پذیر تو کیا

خوش ہوں کہ کسی کی محفل میں ارزاں تھی متاعِ بیداری
اب آنکھیں ہیں بے خواب تو کیا، اب خواب ہیں بے تعبیر تو کیا

خواہش کے مسافر تو اب تک تاریکیٔ جاں میں چلتے ہیں
اک دل کے نہاں خانے میں کہیں جلتا ہے چراغِ ضمیر تو کیا

صحرائے تمنّا میں جس کے جینے کا جواز ہی جھونکے ہوں
اس ریت کے ذرّوں نے مل کر اک نام کیا تحریر تو کیا

لکھتا ہوں تو پوروں سے دل تک اک چاندنی سی چھا جاتی ہے
قاصر وہ ہلالِ حرف کبھی ہو پائے نہ ماہِ منیر تو کیا



فارغ بخاری

فارغ بخاری کا اصل نام احمد شاہ ہے، آپ ۱۹۱۷ء میں بمقام پشاور پیدا ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد، آپ نے السنہ شرقیہ کے متعدد امتحانات پاس کئے۔ فارغ بخاری کا شمار، ترقی پسند مصنفین میں ہوتا ہے۔

آپ ماہنامہ "نغمۂ حیات" اور ہفت روزہ "شباب" کے مدیر بھی رہ چکے ہیں، ان دنوں اپنے ادبی مجلّہ "سنگِ میل" کی ادارت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

فارغ بخاری نظم و نثر دونوں لکھتے ہیں۔ آپ کی مطبوعات میں زیر و بم، شیشے کے پیرہن، خوشبو کا سفر، غزلیہ، ادبیاتِ سرحد، پشتو کے لوک گیت، سرحد کے لوک گیت، باچا خان، پشتو شاعری، رحمان بابا کے افکار، خوشحال کے افکار، جرأت عاشقاں اور البم وغیرہ شامل ہیں۔

فارغ بخاری

کرے گا کوئی بغاوت حیات سے کیسے
نکل کے جائے کوئی کائنات سے کیسے

زبانیں شعلوں کی لہرائیں شہر بھی نہ جلیں
لگائے آگ کوئی احتیاط سے کیسے

وفا کے مرحلے دشوار ہوتے جاتے ہیں
بجائے تالی کوئی ایک ہات سے کیسے

میں کیسے اپنی تباہی کا افتتاح کروں
یہ فیتہ کاٹے کوئی اپنے ہات سے کیسے

سحر کے گیتوں سے سورج بنی ہے جسکی جبیں
رفاقت اس نے نبھائی ہے رات سے کیسے

نشاطِ سنگ زنی کو ترس رہا ہے جنوں
بچھڑ گیا ہے یہ دولہا برات سے کیسے

ہوا ہے پھر کس طوفاں کا سامنا فارؔغ
بچائیں دل کو نئی واردات سے کیسے



فاطمہ حسن

اصل نام سیّدہ انیس فاطمہ ہے۔ کراچی میں ۲۵ جنوری ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئیں۔ سات برس کی عمر میں ڈھاکہ چلی گئیں اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں آنرز کی طالبہ تھیں کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ پیش آیا۔ ۱۹۷۳ء میں بھارت اور نیپال سے ہوتی ہوئی کراچی پہنچیں۔ جامعہ کراچی سے صحافت میں ایم اے کیا اور ۱۹۷۷ء میں محکمہ اطلاعات حکومت سندھ کے شعبۂ اشاعت سے وابستہ ہوگئیں۔ آجکل اسی محکمہ کے فلم وسیاحت کے شعبہ میں کام کر رہی ہیں۔

شاعری اور افسانہ دونوں سے تعلق ہے۔ ان کی ایک تصنیف "بہتے ہوئے پھول" منظرِ عام پر آچکی ہے۔

فاطمہ حسن

بکھر رہے تھے ہر اک سمت کائنات کے رنگ
مگر یہ آنکھ کہ جو ڈھونڈتی تھی ذات کے رنگ

ہمارے شہر میں کچھ لوگ ایسے رہتے ہیں
سفر کی سمت بتاتے ہیں جن کو رات کے رنگ

الجھ کے رہ گئے چہرے مری نگاہوں میں
کچھ اتنی تیزی سے بدلے تھے ان کی بات کے رنگ

بس ایک بار انہیں کھیلنے کا موقع دو
خود ان کی چال بتا دے گی سارے مات کے رنگ

تماشا گاہ میں ہر آنکھ تھی جمی اس پر
وہ ایک شخص دکھاتا رہا جو گھات کے رنگ

ہوا چلے گی تو خوشبو مری بھی پھیلے گی
میں چھوڑ آئی ہوں پیڑوں پہ اپنے ہات کے رنگ



فضل احمد کریم فضلی

آپ ۱۷- رمضان المبارک ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء اعظم گڑھ (بھارت) میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر میں بزرگان دین کی صحبت میں حاصل کی۔ الہ آباد سے بی اے کا امتحان پاس کیا پھر آئی۔ سی۔ ایس کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور تربیت کے لئے آکسفورڈ بھیج دیئے گئے۔ وہاں سے آپ نے بی لٹ (B-LITT) کی ڈگری بھی حاصل کی واپسی پر بنگال میں آپ کی تعیناتی ہوئی۔ جہاں آپ نے بنگلہ زبان بھی سیکھ لی۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت امریکہ کی دعوت پر امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں مہمان لیکچرار کی حیثیت سے لیکچر دیئے۔ آپ کچھ عرصہ وزارت امور کشمیر کے سیکرٹری بھی رہے۔ بعد ازاں آپ فلم سازی کی طرف آ گئے۔ "ایسا بھی ہوتا ہے" کے نام سے آپ نے فلم بنائی۔

"اشتراکیت عقل کی کسوٹی پر"۔ "پاکستانی ثقافت و وطنیت کے چند پہلو" (کتابچے) "خون جگر ہونے تک" (ناول) آپ کی مطبوعہ تصانیف ہیں۔ "سحر ہونے تک" کے نام سے ناول زیر طبع ہے۔ شاعری کے دو مجموعے "نغمۂ زندگی" اور "چشم غزال" شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ "جمالِ غزل" کے نام سے اشاعت کے مرحلہ میں ہے۔

فضل احمد کریم فضلی

غموں سے کھیلتے رہنا کوئی ہنسی بھی نہیں
نہ ہو یہ کھیل تو پھر لطفِ زندگی بھی نہیں

نہیں کہ دل میں تمنا مرے کوئی بھی نہیں
مگر ہے بات کچھ ایسی کہ گفتنی بھی نہیں

ابھی میں کیا اٹھوں، نیت ابھی بھری بھی نہیں
ستم یہ اور کہ مے کی ابھی کمی بھی نہیں

ادائیں ان کی سناتی ہیں مجھ کو میری غزل
غزل بھی وہ کہ جو میں نے ابھی کہی بھی نہیں

حضورِ دوست مرے گومگو کے عالم نے
کہا بھی ان سے جو کہنا تھا بات کی بھی نہیں

ہمارے ان کے تعلق کا اب یہ عالم ہے
کہ دوستی کا ہے کیا ذکر دشمنی بھی نہیں

کہا جو ترکِ محبت کو شیخ نے تو کھلا
فرشتہ تو نہیں لیکن یہ آدمی بھی نہیں

خُدا کی بات کریں وہ جو ہوں خُدا آگاہ
خُدا گواہ، یہاں تو خود آگہی بھی نہیں

بڑا ستم یہ نہیں ہے کہ ہم ہوئے بے حس
ستم تو یہ ہے کہ احساسِ بے حسی بھی نہیں

ابھی لگا تھا کچھ ایسا وہ آئے ہوں جیسے
جو دیکھتا ہوں تو کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں

بڑی اذیّتیں جھیلیں تو میں نے ہیں، لیکن
میں اور ترکِ محبت؟ نہیں، کبھی بھی نہیں

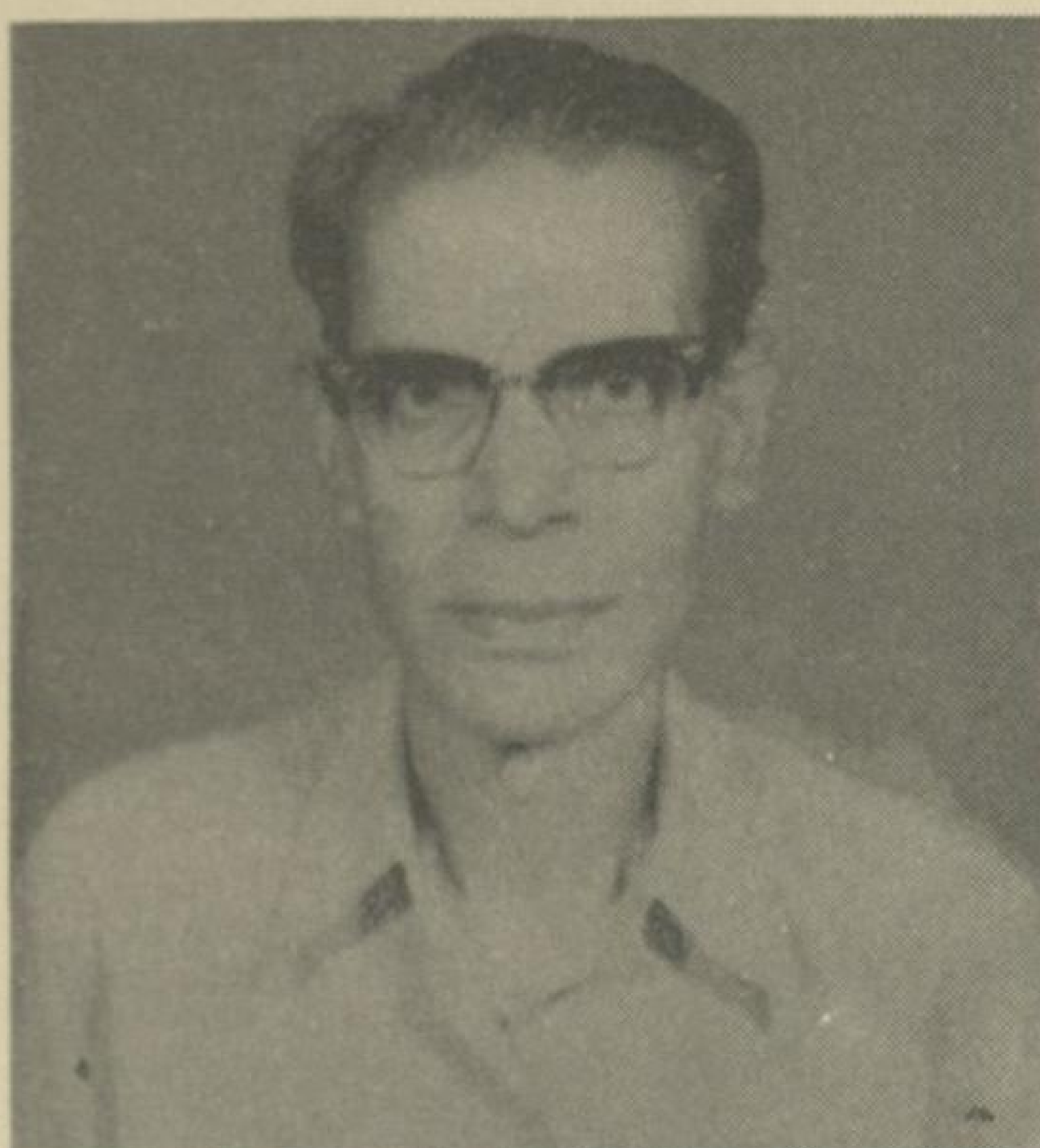
مرے کلام میں ہوتی ہے سادگی، لیکن
جو حُسنِ فن سے ہو عاری وہ سادگی بھی نہیں

بھلا دیا مجھے ظالم نے عادتاً بھی مگر
وہ بات جس سے میں یاد آؤں مجھ میں تھی بھی نہیں

وہ کہہ رہے ہیں مجھے قتل کر کے اے افضلؔ
کہ ہم نہیں جو ترے قدرداں کوئی بھی نہیں

قیامِ پاکستان کے گزشتہ تیس سال کے دور میں مسائل زندگی کی روحانی و مذہبی تعبیر کی جگہ آہستہ آہستہ سیاسی و مادی تفسیر نے لے لی -- سیاسی احوال و ظروف اور افکار و نظریات شعر و ادب کی غالب روایتِ فکر بنتے گئے اس رویّہ و رجحان نے غزل کے لب و لہجہ اور فضا کو بھی متاثر کیا۔ سیاسی بے اطمینانی اور نا آسودہ حالی غزل کے رموز و علائم میں ڈھلی۔ چنانچہ اس دور کی غزل کی فضا عشقیہ کے بجائے سیاسی اور لہجہ حزنیہ، عاجزانہ اور دردمندانہ کے بجائے ترش و تند جارحانہ اور رجزیہ ہے۔

(ڈاکٹر محمد اقبال احمد خان)



فطرت کاکوروی

اصل نام سرفراز احمد علوی اور فطرت تخلص۔

پیدائش ۲۱ مارچ ۱۹۱۷ء بمقام کاکوری ضلع لکھنؤ (بھارت) فطرت نے ادبی ماحول میں ہوش سنبھالا۔ لڑکپن کی اردو فارسی کی تعلیم اور اساتذہ کے کلام کے مسلسل مطالعہ نے شاعری کا شوق پیدا کیا۔ چنانچہ ان کی انگریزی تعلیم بھی ان کے مشرقی مذاقِ شعر کو کم نہ کر سکی۔ ۱۹۳۶ء سے باقاعدہ شعر کہہ رہے ہیں۔ ابتدا میں نظم و غزل دونوں کہتے رہے مگر آخر کار ان کی محبوب صنفِ سخن غزل قرار پائی۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد فطرت کراچی آگئے اور پھر ۱۹۶۳ء میں ڈھاکہ منتقل ہوگئے۔ کلام یکجا کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ نتیجتہً کلام ضائع ہوتا رہا۔ ۱۹۷۱ء کے المیۂ مشرقی پاکستان میں جنگی قیدی ہونا پڑا۔ اس ہنگامے میں رہا سہا کلام بھی تلف ہوگیا۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں کراچی پہنچے۔ چند غزلیں جو آپ کے بھائی حکیم نثار احمد علوی ساقی کے پاس موجود تھیں، اب وہی کل سرمایہ ہیں۔ مشاعروں کے ہنگامہ سے گریزاں ہیں البتہ مخصوص شعری نشستوں میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔

فطرتؔ کاکوروی

تمہیں ثبوتِ وفا دوں اگر برا نہ لگے
جگر کے داغ دکھا دوں اگر برا نہ لگے

تم آگئے ہو تو یہ گھر ہے آپ ہی روشن
میں اب چراغ بجھا دوں اگر برا نہ لگے

تمہارے وعدۂ فردا، تمہارا عہدِ وفا
میں آج یاد دلا دوں اگر بُرا نہ لگے

جو واقعات فسانے بنا دئے تم نے
وہ واقعات سنادوں اگر برا نہ لگے

ذرا ٹھہر کہ تری آستیں سے دامن سے
لہو کے داغ چھڑا دوں اگر برا نہ لگے

جو آگ سینے کے اندر ہو تم سے کیسے بجھے
میں آنسوؤں سے بجھا دوں اگر برا نہ لگے

پہنچ ہی جائیں گے خود لوگ بات کی تہ تک
کچھ اپنے شعر سنادوں اگر برا نہ لگے

یہ حشر ہے تمہیں پہچانتا نہیں ہے کوئی
کہو تو نام بتا دوں اگر برا نہ لگے

بہت سے زخم فقط آپ ہی کے نام کے ہیں
اشارتاً میں بتا دوں اگر برا نہ لگے

میں ایک دن تری محفل میں داستانِ الم
فسانہ کہہ کے سنا دوں اگر برا نہ لگے

بکا کیا ہے وہ کس کس کے ہاتھ اے فطرتؔ
کہے تو نام گنا دوں اگر برا نہ لگے

شاعری کی ایمائی زبان فلسفے کی استدلالی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ شاعر جن باتوں کو استعاروں اور تمثیلوں سے بیان کرتا ہے اور لطافت پیدا کرتا ہے۔ فلسفی انہیں باتوں کے پیچھے چھپے ہوئے اسرار کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس لطافت کو جسے شاعر نے داخلی سطح پر محسوس کیا ہے کثافت میں بدل ڈالتا ہے۔ (انور سدید)



فیض احمد فیض

پیدائش سیالکوٹ ۱۹۱۲ء۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ ہی میں حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے (انگریزی) اور ایم اے (عربی) کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۳۶ء میں ایم اے او کالج امرتسر میں شعبۂ درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔ کچھ عرصہ کے لئے مشہور ادبی مجلّہ "ادبِ لطیف" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۴۰ء میں ہیلے کالج آف کامرس لاہور آگئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران فوج کے محکمۂ نشرواشاعت سے بھی وابستہ رہے۔

۱۹۴۷ء میں جب لاہور سے روزنامہ "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" جاری ہوئے تو آپ ان سے منسلک ہوگئے۔ ۱۹۴۹ء میں عالمی امن کونسل میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ ادب کا لینن پرائز آپ کو مل چکا ہے۔

آپ کی تصانیف میں "نقشِ فریادی" ـــ "دستِ صبا" ـــ "زنداں نامہ" "دستِ تہہ سنگ" ـــ "شامِ شہرِ یاراں" ـــ "صلیبیں مرے دریچے میں" ـــ "متاعِ لوح وقلم" اور "سرِ وادیٔ سینا" شامل ہیں۔ مضامین کا مجموعہ "میزان" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

فیض احمد فیض

سہل یوں راہِ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے

ہم نے دل میں کھلا لئے گلشن
جب بہاروں نے بے رخی کی ہے

بات پر جب زبان کٹتی تھی
بے سخن ہم نے شاعری کی ہے

زہر سے دھو لئے ہیں ہونٹ اپنے
لطفِ ساقی نے جب کمی کی ہے

دشتِ ہجراں میں یار کی صورت
ہر شبِ مہ نے دلبری کی ہے

جو گزرتے تھے داغؔ پر صدمے
فیضؔ اب، کیفیت سبھی کی ہے



قائم نقوی

پورا نام سیّد قائم حسین نقوی۔ آپ ۶ جون ۱۹۴۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لاہور اور علی پور (مظفر گڑھ) میں حاصل کی۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد، آپ نے ملازمت اختیار کی۔ آج کل ماہنامہ "ماہِ نو" لاہور میں بطور نائب مدیر کام کر رہے ہیں۔

مجموعۂ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

قائم نقوی

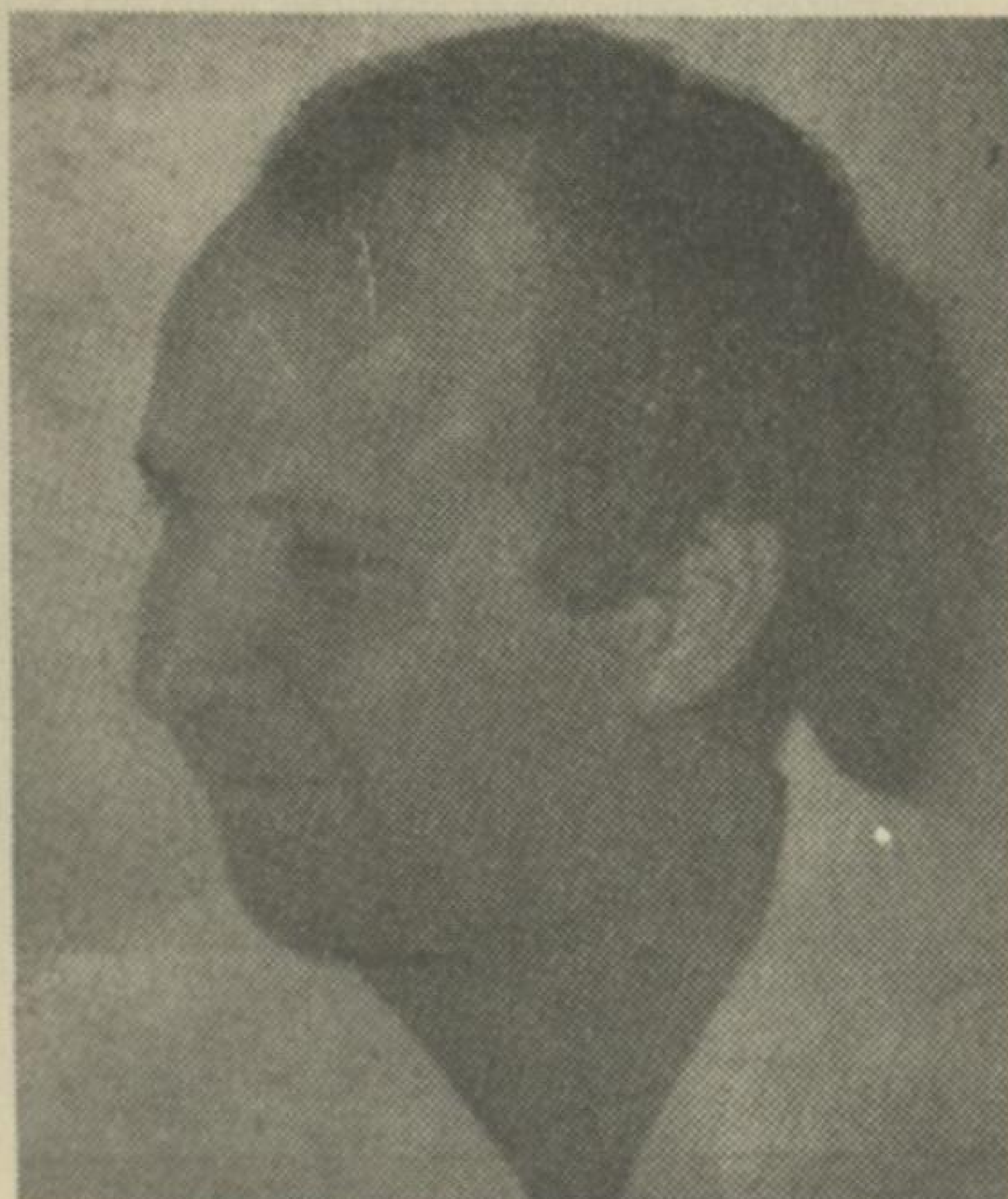
کھُلی کھڑکی سے دن بھر جھانکتا ہوں
میں ہر چہرے میں تجھ کو ڈھونڈتا ہوں

تجھے میں کس طرح پہچان پاؤں
کہ اپنے آپ سے ناآشنا ہوں

جہاں انسان پتھّر ہو چکے ہیں
میں اس بستی میں کیسے جی رہا ہوں

جہاں سے کل مجھے کاٹا گیا تھا
وہیں سے آج میں پھر اُگ رہا ہوں

میں اس سنگین سنّاٹے میں قائمؔ
کسی طوفاں کی آہٹ سُن رہا ہوں



قتیل شفائی

اصل نام اورنگ زیب خان، قتیل تخلص۔ حکیم یحییٰ خان شفاؔ کے شاگرد ہیں۔ اسی مناسبت سے شفائی کہلاتے ہیں۔ قتیل ۱۹۱۹ء میں ہری پور میں پیدا ہوئے جو ضلع ہزارہ (صوبہ سرحد) کا ایک مشہور مقام ہے۔ قتیل بہ سلسلہ ملازمت راولپنڈی میں بھی رہے ان دنوں لاہور میں مستقل قیام ہے۔

ایک کامیاب غزل گو اور فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے قتیل کا ایک ممتاز مقام ہے۔

آپ کے مجموعہ ہائے کلام میں ہریالی، گجر، جلترنگ، روزن، جھومر، مطربہ، گفتگو اور چھتنار کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

"آوازوں کے سائے" کے نام سے آپ کا تازہ کلام زیرِ ترتیب ہے۔

قتیل شفائی

دل کی تنہائی کا مجھ کو خود بھی اندازہ نہیں
یہ اک ایسا گھر ہے جس کا کوئی دروازہ نہیں

مہرباں مجھ پر بہت ہے ان دنوں ابرِ کرم
یہ کہیں میری دعاؤں کا تو خمیازہ نہیں

حسن کے مصرف میں اب رہتا ہے خونِ عاشقاں
کوئی بھی رخسار اب منّت کشِ غازہ نہیں

رنگ و نکہت میں جو بیتے موسموں سے ہو الگ
میرے گلشن میں کوئی ایسا گلِ تازہ نہیں

پنچھیوں کا شور باقی ہے نہ شیروں کی دہاڑ
چپ کے اس جنگل میں اب کوئی بھی آوازہ نہیں

نت نیا کابوس سوتے میں ڈراتا ہے مجھے
منتشر یونہی مرے خوابوں کا شیرازہ نہیں

ایک سے حالات لیتے ہیں جنم ہر دور میں
کون کہتا ہے قتیلؔ اپنی غزل تازہ نہیں



قمر ساحری

اصل نام سید علی رضا ہے مگر اپنے ادبی نام قمر ساحری سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ شہر حیدر آباد (دکن) میں ۷، نومبر ۱۹۲۱ء کو پیدا ہوئے۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہو گئے۔ ان دنوں گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی میں شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

اب تک اردو نظموں، غزلوں اور رباعیات پر مشتمل آپکے ۲ دو منتخب مجموعے "زلزلے" اور "ضربِ آتشیں" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ تازہ مجموعۂ کلام "یاسائے عہد" اور ایک طویل اردو و فارسی کی نظم "آسمان نامہ" زیرِ ترتیب ہے۔ اردو نثر میں افسانے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ فارسی شعر و ادب سے بھی خاصی دلچسپی ہے چنانچہ حیدر آباد دکن کی ادبی انجمن "بزمِ سعدی" آپ ہی کی قائم کردہ ہے۔ خود بھی فارسی میں شعر کہتے ہیں۔

قمر ساحری

چھائی نہ کبھی میرے ارادوں پہ اداسی
دنیا تو ہمیشہ سے رہی خون کی پیاسی

سوکھے ہوئے پیڑوں سے اترنے لگے سائے
نکلی جو مرے گاؤں میں اک دھوپ ذرا سی

اس عہد جنوں کے قدو قامت ہی نئے ہیں
اس عہد کو جچتی ہی نہیں شاہ لباسی

کچھ روز سے اس دھوپ میں تیزی سی نہیں ہے
کچھ روز سے چھائی ہوئی لگتی ہے گھٹا سی

اب بھی ہیں اسی چاند پہ سو جان سے قربان
کس دور میں رہتے ہیں مرے دور کے باسی

کیا جانیے کیا شہر میں ہونے کو ہے لوگو!
ہر شخص کے لب پر نظر آتی ہے دعا سی

پھر کوئی بلا تو نہیں آئے گی کہیں سے
راتوں کو سنا کرتا ہوں پر ہول صدا سی

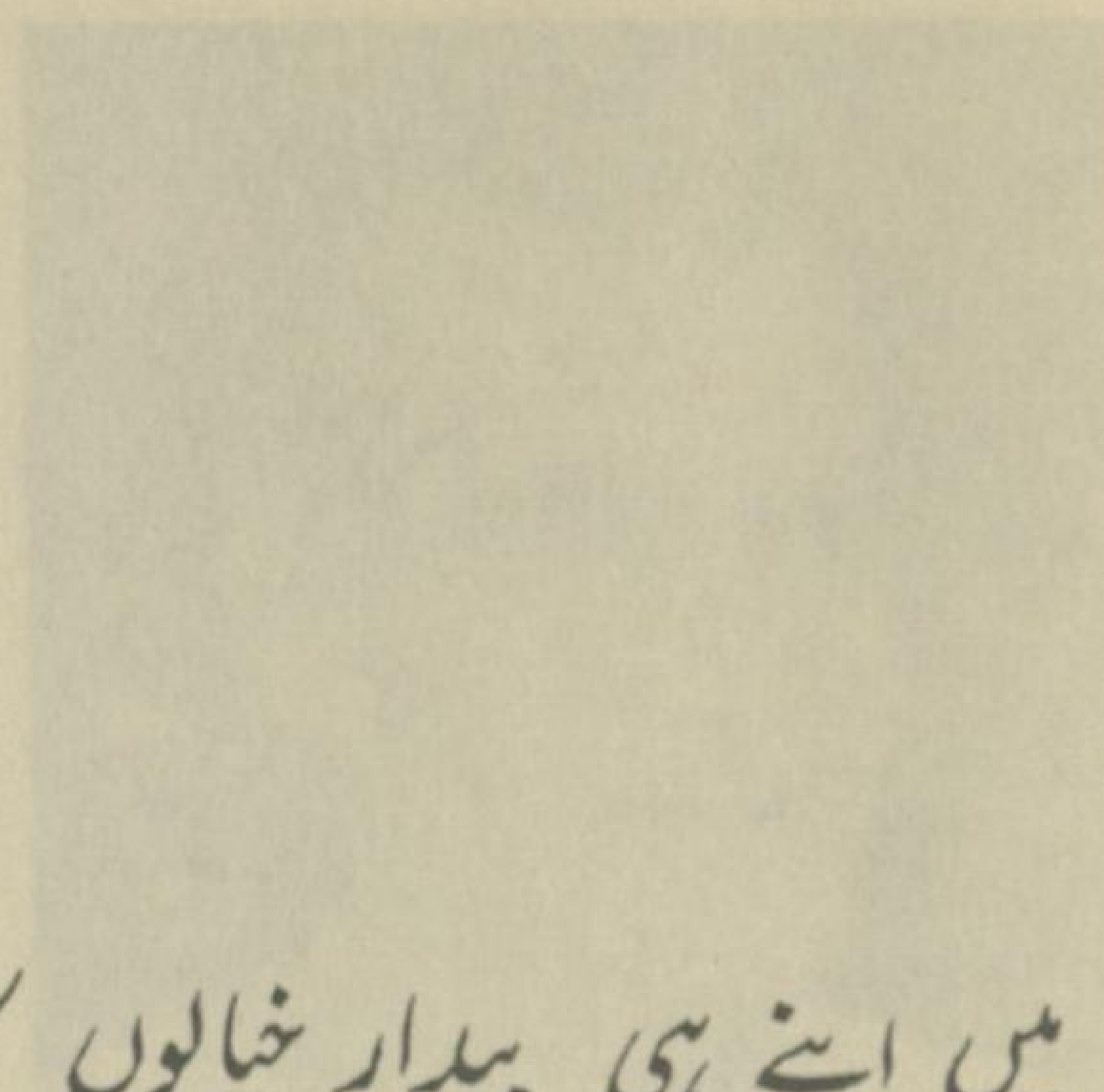
یہ شہر بدلتے ہوئے چہروں کا وطن ہے
اس شہر میں ممکن ہی نہیں چہرہ شناسی



قمر ہاشمی

قمر ہاشمی، ۲ فروری ۱۹۲۴ء کو ریاست ٹونک (بھارت) میں پیدا ہوئے۔
والد کا نام سید احمد ہاشمی تھا جو خانوادۂ احمد شہید بریلویؒ کے چشم و چراغ تھے۔
آپ نے ابتداً عربی فارسی پڑھی۔ پھر انگریزی تعلیم اٹاوہ اور علی گڑھ میں حاصل کی۔
شاعری میں اختر شیرانی آپ کے استاد تھے۔
قمر ہاشمی کی دو۲ طویل نظمیں کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔
شعری مجموعہ ابھی تک نہیں چھپا ہے۔

قمر ہاشمی



میں اپنے ہی بیدار خیالوں کا سفر ہوں
میں اپنے ہی خوابوں کے جزیرے کی سحَر ہوں

بکھرا ہوں تو مہکا دیے انفاس کے گلزار
سمٹوں تو بکھرتی ہوئی بوٹے گلِ تر ہوں

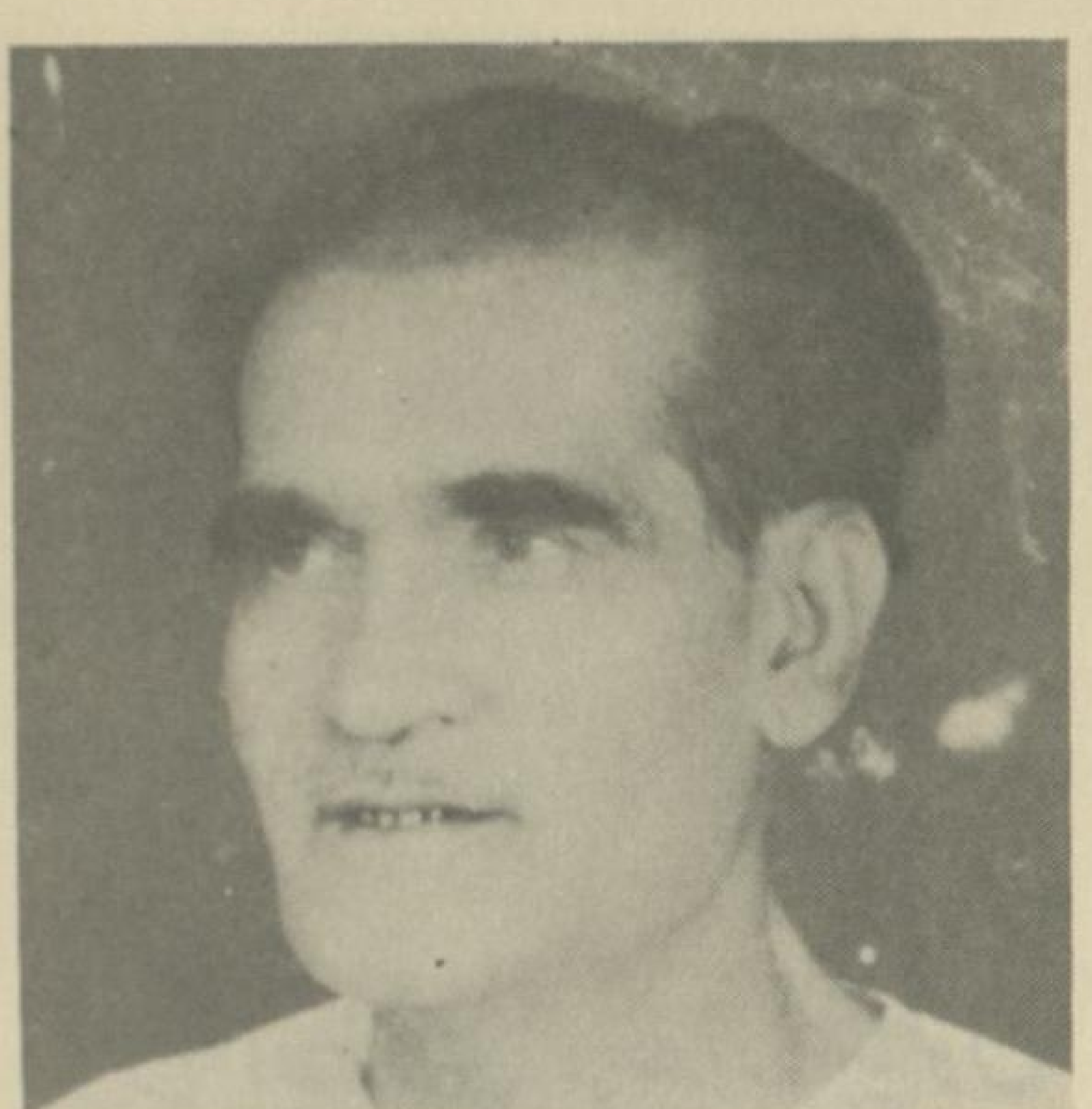
ہر پاؤں کی تکلیف کا احساس ہے مجھ کو
ہر چند کہ میں سنگِ سرِ راہ گزر ہوں

پتھّر ہوں تو کیا مجھ میں بھی سو رنگ نہاں ہیں
سینہ ہو اگر شق تو شبستانِ شرر ہوں

ہر حرفِ تمنا میں ہے سُرخی دل وجاں کی
ہر لفظ یہ کہتا ہے معانی کا شجر ہوں

ہر پَل افقِ ذہن پہ تاباں ہے ترا نام
اس قوسِ قزح میں تری یادوں کا سفر ہوں

راتوں میں قمرؔ مشعلِ جاں کہتی ہے مجھ سے
میں ظلمتِ ہستی میں اُجالوں کی خبر ہوں

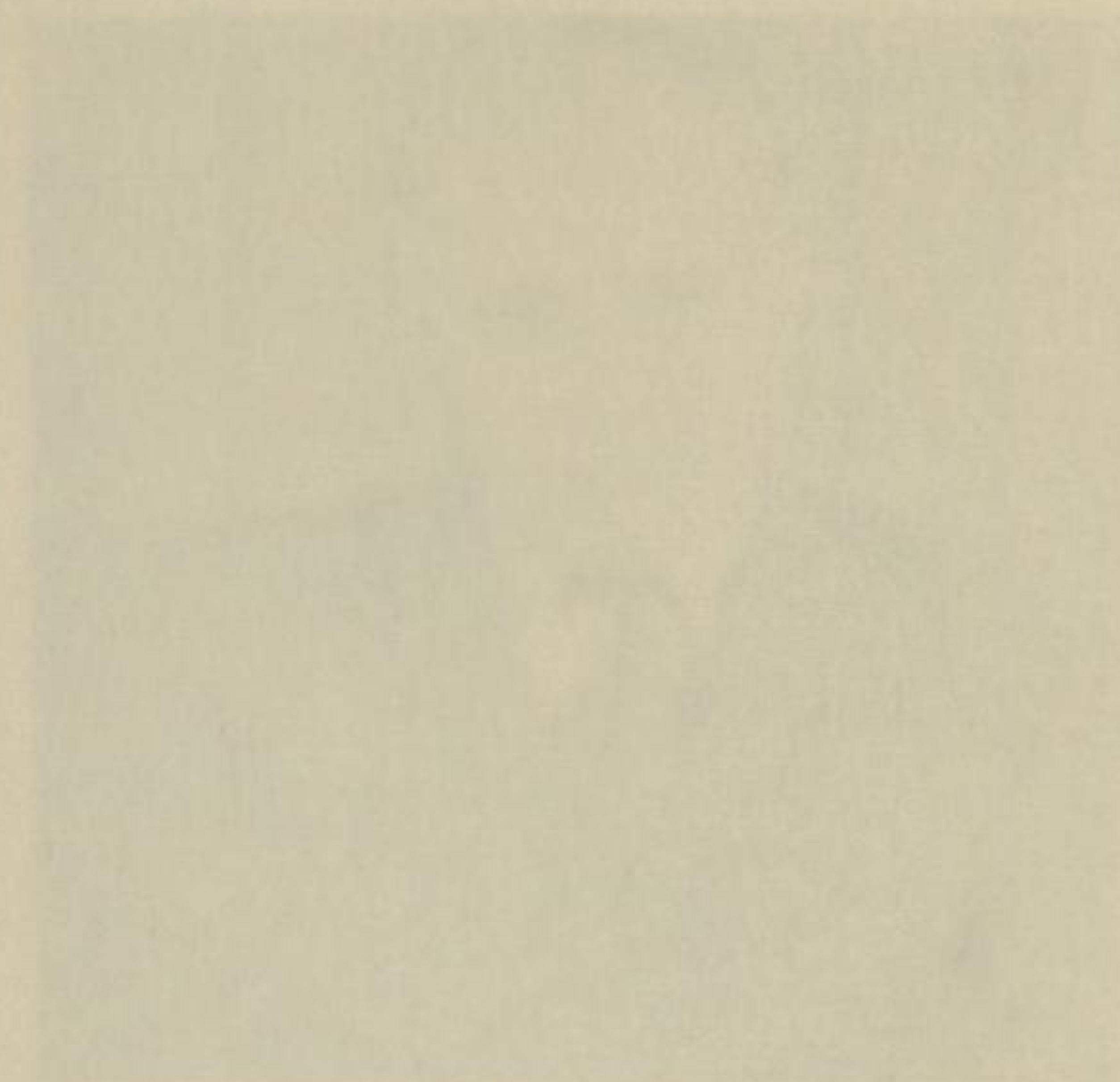


کرّارؔ نوری

نام سید کرّار میرزا۔ والد کا نام سید علی میرزا۔ پر دادا آگاہ دہلوی مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ وطن دہلی تھا، اب کراچی میں ہیں۔ کچھ عرصہ راولپنڈی بھی قیام رہا۔ جہاں روزنامہ "بادِ شمال" کے نائب مدیر اور روزنامہ "جدید پرواز" کے مدیر اعلیٰ رہے۔ ریڈیو راولپنڈی سے بھی وابستہ رہے۔ کراچی میں بھی اردو انگریزی کے مختلف رسائل اور روزناموں کے مدیر اور نائب مدیر رہے بلکہ پروف ریڈر، ٹائپسٹ اور سرکولیشن مینجر سب ہی کچھ رہے۔ اب ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ ہیں۔

تقسیم ملک سے پہلے جو کچھ کہا تھا سب وہیں رہ گیا۔ مشاعروں میں بار بار پڑھنے سے جو کلام زبانی یاد تھا وہی باقی رہا۔ اس کے بعد سے تقریباً ہر صنف ادب میں کافی لکھا ہے جن میں گیت، غنائیے، مرثیے بھی شامل ہیں۔ لوک دھنوں اور کلاسیکل راگوں میں موسیقاروں کی مدد سے آسان اردو میں بول کہے۔ اسی طرح ایک بنگالی پروفیسر اور موسیقار کی مدد سے قاضی نذر الاسلام کے گیتوں کا انہی کی مقرر کردہ دھنوں میں اردو میں آزاد ترجمہ کیا جن میں سے چند گیتوں پر مشتمل ایک کتابچہ "نذرل اکیڈمی" نے شائع بھی کیا ہے۔ غزل آپ کی سب سے زیادہ مرغوب صنفِ سخن رہی ہے۔ نثر میں دوسرے چھوٹے بڑے مضامین کے علاوہ "آج کے دن" کے عنوان کے تحت اخبارات اور ریڈیو کے لئے ہر خاص دن کی تاریخ کی مناسبت سے واقعات اور شخصیات پر ایک ہزار کے قریب مضامین لکھے ہیں۔

مجموعۂ کلام زیرِ ترتیب ہے۔



کرّار نوری

سمندروں سے جزیرے کی طرح ابھرا ہوں
رہوں تو کیسے رہوں اور چھپوں تو کیسے چھپوں

دماغ چیخ رہا ہے کہ دل کی بات سنوں
صدائے دل ہے کہ سب کچھ سنوں میں کچھ نہ کہوں

خدا کرے در و دیوار سب بکھر جائیں
پھر اس مکان میں اپنا سکونِ دل ڈھونڈوں

ملا وہ شخص تو منکر نکیر بن کے ملا
میں اپنے گھر میں ہوں جیسے عذابِ قبر میں ہوں

یہ وصفِ صورت و سیرت فقط روایت ہے
جو ہم مزاج نہیں اس کو کیسے پیار کروں

خدایا اپنے فرشتے نہ بھیج دُنیا میں
میں آدمی ہوں فرشتوں کے ساتھ کیسے رہوں

وہ دیکھتا ہے روایات کے دریچوں سے
میں سوچتا ہوں کہ آگے بڑھوں تو کیسے بڑھوں

کوئی نہ کوئی خرابی تو مجھ میں بھی ہو گی
یہ کیا ضرور کہ ہر بات اس کی رد ہی کروں

حیات و موت کی اس کشمکش میں ہوں نوریؔ
جیوں تو کیسے جیوں اور مروں تو کیسے مروں



کرم حیدری

ملک کرم داد، اصل نام۔ ادبی نام کرم حیدری ہے۔ آپ ۱۹۱۸ء میں مری کے ایک چھوٹے سے گاؤں تریٹ میں پیدا ہوئے۔ کرم حیدری کا خاندان ایک ممتاز علمی خاندان تھا۔ آپ کے والد، دادا، پڑدادا اور نانا سب کے سب فارسی اور عربی کے مروّجہ علوم کے فاضل تھے اور اپنی انگریزی دانی کی بدولت معزز سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ والدہ بھی اردو کے علاوہ عربی اور فارسی کی عالمہ تھیں۔ گویا کرم حیدری نے فارسی اور عربی علوم ورثے میں پائے۔

کرم حیدری نے شعر گوئی کا آغاز نویں جماعت سے کیا۔ استاد شاگردی کے رسمی تعلق سے بے نیاز رہے اور اپنے فطری ذوق ہی کو اپنا رہنما بنایا۔ انیس ۱۹ برس کی عمر میں آپ کی غزلوں اور گیتوں کا ایک مختصر مجموعہ "موسیقار" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں کرم حیدری جب ملازمت کے سلسلے میں مری پہنچے تو وہاں کی شعروادب کی محفلیں، ان کے ذوقِ شعری کے لئے مہمیز ثابت ہوئیں۔ "موسیقار" کے علاوہ آپ کے تین اور شعری مجموعے اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں: حکمتِ بیدار، دوش وفردا، اور سایۂ گل —— نثری تصانیف میں "داستانِ مری"، "پوٹھوہاری گیت"—"سرزمینِ پوٹھوہار" اور "آزادیٔ موہوم" شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اسلام آباد کی تاریخ وثقافت اور زبان وادب کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ انگریزی میں شائع ہوئی ہے۔ قائداعظم کی تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات بھی کتابی شکل میں منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ آپ کی جو تصانیف طباعت کے مراحل میں ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

"ملّت کا پاسبان"۔ "قائداعظم اور اسلام" اور مجموعۂ نعت ومنقبت۔

کرم حیدری

عشق کی دنیا میں کیا کیا ہم کو سوغاتیں ملیں
سونی صبحیں ، روتی شامیں ، جاگتی راتیں ملیں
یا برستی دھوپ میں تپتے سلگتے دن ملے
یا ردائے درد میں لپٹی ہوئی راتیں ملیں

کچھ صباحت، کچھ ملاحت تھی نصیبِ عاشقاں
آنسوؤں کے رنگ میں نمکین برساتیں ملیں
گہ اجڑ جانے کا ماتم ، گہ بچھڑ جانے پہ شور
دل کے اندر جب ملیں نوحوں کی باراتیں ملیں

کھوکھلے چہروں پہ سیم و زر کی تھیں آرائشیں
اہلِ معنی کو مگر لفظوں کی خیراتیں ملیں
کھیلنے والے وہی دس بیس شطرنجی رہے
دیکھنے والوں کو شہ ماتوں پہ شہ ماتیں ملیں

زلزلے آئے تو جو پیکر تھے سنگ و خشت کے
ان کے ہونٹوں پر دعائیں اور مناجاتیں ملیں
عشق کو فکر و شعورِ زندگی درکار تھا
اور اسے ناپختہ ذہنوں کی کراماتیں ملیں
ہم انہی کو شعر کا قالب عطا کرتے رہے
بے صدا ہونٹوں پہ جو بکھری ہوئی باتیں ملیں
کس طرح کہتے کرمؔ دنیا سے اپنے دل کا حال
دوستوں سے بھی ادھوری سی ملاقاتیں ملیں

بحور و قوافی و ردیف بالکل ذیلی اور ضمنی چیزیں ہیں۔ اصل شے تخیّل اور اسلوب بیان ہے۔ ایک کا تعلق شاعر کی قوتِ متخیّلہ سے اور دوسرے کا ذخیرۂ الفاظ سے ہے لیکن غزل کے اندر جو ایک روح دوڑتی ہے جو صرف لفظوں سے نہیں، لفظوں کے آہنگ سے لفظوں کے مزاج سے، ان کی زیروبم سے، ان کی نرمی اور گرمی سے پیدا ہوتی ہے نہ وہ صرف تخیّل سے پیدا ہوتی ہے نہ صرف اسلوبِ بیان یا لفظوں کی نشست و برخاست اور نہ دونوں کے امتزاج و انضمام سے بلکہ اس کا تعلق شاعر کے مزاج سے، شاعر کے مذاق سے اور شاعر کے ماحول سے ہے۔

آغا سہیل



کشور ناہید

نام کشور ناہید۔ ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئیں۔ محکمہ اطلاعات و نشریات کے ادبی مجلہ "ماہِ نو" کی چیف ایڈیٹر رہ چکی ہیں۔ آج کل پاکستان نیشنل سنٹر لاہور کی ریذیڈنٹ ڈائریکٹر ہیں۔

آپ کی تصانیف ہیں "لبِ گویا"—"بے نام مسافت"—"ایشیا کی لوک کہانیاں"—"نظمیں" اور "گلیاں، دھوپ، دروازے" شامل ہیں۔

کشور ناہید

ہری تھی شاخ تو بیٹھا نہ اس پہ پنچھی کیوں
لگے ہے اجڑے ہوئے خواب سی یہ بستی کیوں

مجھے خبر ہے، مرے گھر میں سانپ آنکھیں ہیں
وگرنہ غم کے خزینے چھپا کے رکھتی کیوں

تمہی سے تہمتِ عالم کی نسبتیں، موسوم
تمہیں کو کہتے ہیں سب لوگ سب سے اچھی کیوں

خزاں کو میرے ہی خوابوں کے نام کیوں لکھا
زمیں نے اپنی یہ دولت مجھی کو سونپی کیوں

مرا وجود بھی، کیا کچھ خدا سے ملتا ہے
سوال و شک سے ہے بیگانہ، میری ہستی کیوں

یہ اشک، سلسلۂ جاں کے بولتے لب ہیں
چھپا کے دولتِ نایاب تم نے رکھی کیوں

وجود اپنا کسے کب عزیز تھا ناہیدؔ
ہوئی ہے شام سے پہلے ہی شام گہری کیوں



کلیم عثمانی

نام احتشام الٰہی، قلمی نام کلیم عثمانی۔ آپ دیوبند ضلع سہارن پور (بھارت) میں ۲۸ فروری ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابھی لڑکپن کا زمانہ تھا کہ تحریکِ پاکستان نے زور پکڑا اور انہوں نے اپنی نوعمری کے باوجود اس تحریک میں بھرپور حصّہ لیا۔ جد وجہد کے دوران بابائے قوم قائدِ محترم سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا جسے کلیمؔ اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع سمجھتے ہیں۔

آپ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہجرت کر کے لاہور آ گئے، اس وقت سے اب تک مستقل طور پر لاہور ہی میں مقیم ہیں۔ لگ بھگ سترہ برس پاکستان ٹوبیکو کمپنی سے وابستہ رہے۔ اس عرصہ میں اپنا ایک ادبی رسالہ "لالہ رخ" بھی نکالتے رہے۔ دورانِ ملازمت جب لاہور چھوڑنے کی بات چلی تو انہوں نے ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔ معاشی تقاضوں کے تحت فلمی دنیا سے وابستگی اختیار کر لی جو اس وقت تک قائم ہے۔

کلام کے دو مجموعے مرتب کر چکے ہیں مگر ابھی تک کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے اشاعتِ کلام سے زیادہ مشاعروں کے ذریعہ کلیم عثمانی کا رابطہ، ادب کے قاریوں سے قائم رہا ہے۔ اس صورتِ حال پر وہ خود لکھتے ہیں:

"میرے شعر چھپنے سے زیادہ براہ راست عوام تک پہنچتے ہیں۔ اس لئے طویل عرصے تک مشاعرہ میری زندگی رہا ہے، برصغیر پاک وہند کا شاید ہی کوئی بڑا شہر ہو جہاں میرا شعر اور میری آواز نہ پہنچی ہو مگر اب — اب تو یہ عالم ہے:-

ہے اگرچہ شہر میں اپنی شناسائی بہت
پھر بھی رہتا ہے ہمیں احساس تنہائی بہت

اس سال کلیم عثمانی کو مرکزی وزارتِ تعلیم و ثقافت نے پاکستان آرٹس کونسل کی گورننگ باڈی میں شامل کیا ہے۔

کلیم عثمانی

ہے اگرچہ شہر میں اپنی شناسائی بہت
پھر بھی رہتا ہے ہمیں احساسِ تنہائی بہت

اب یہ سوچا ہے کہ اپنی ذات میں سمٹے رہیں
ہم نے کر کے دیکھ لی سب سے شناسائی بہت

منہ چھپا کر آستیں میں دیر تک روتے رہے
رات ڈھلتی چاندنی میں اس کی یاد آئی بہت

قطرہ قطرہ اشکِ غم آنکھوں سے آخر بہہ گئے
ہم نے پلکوں کی انہیں زنجیر پہنائی بہت

اپنا سایہ بھی جدا لگتا ہے اپنی ذات سے
ہم نے اس سے دل لگانے کی سزا پائی بہت

اب تو سیلِ درد تھم جائے، سکوں دل کو ملے
زخمِ دل میں آ چلی ہے اب تو گہرائی بہت

شام کے سایوں کی صورت پھیلتے جاتے ہیں ہم
لگ رہی تنگ ہم کو گھر کی انگنائی بہت

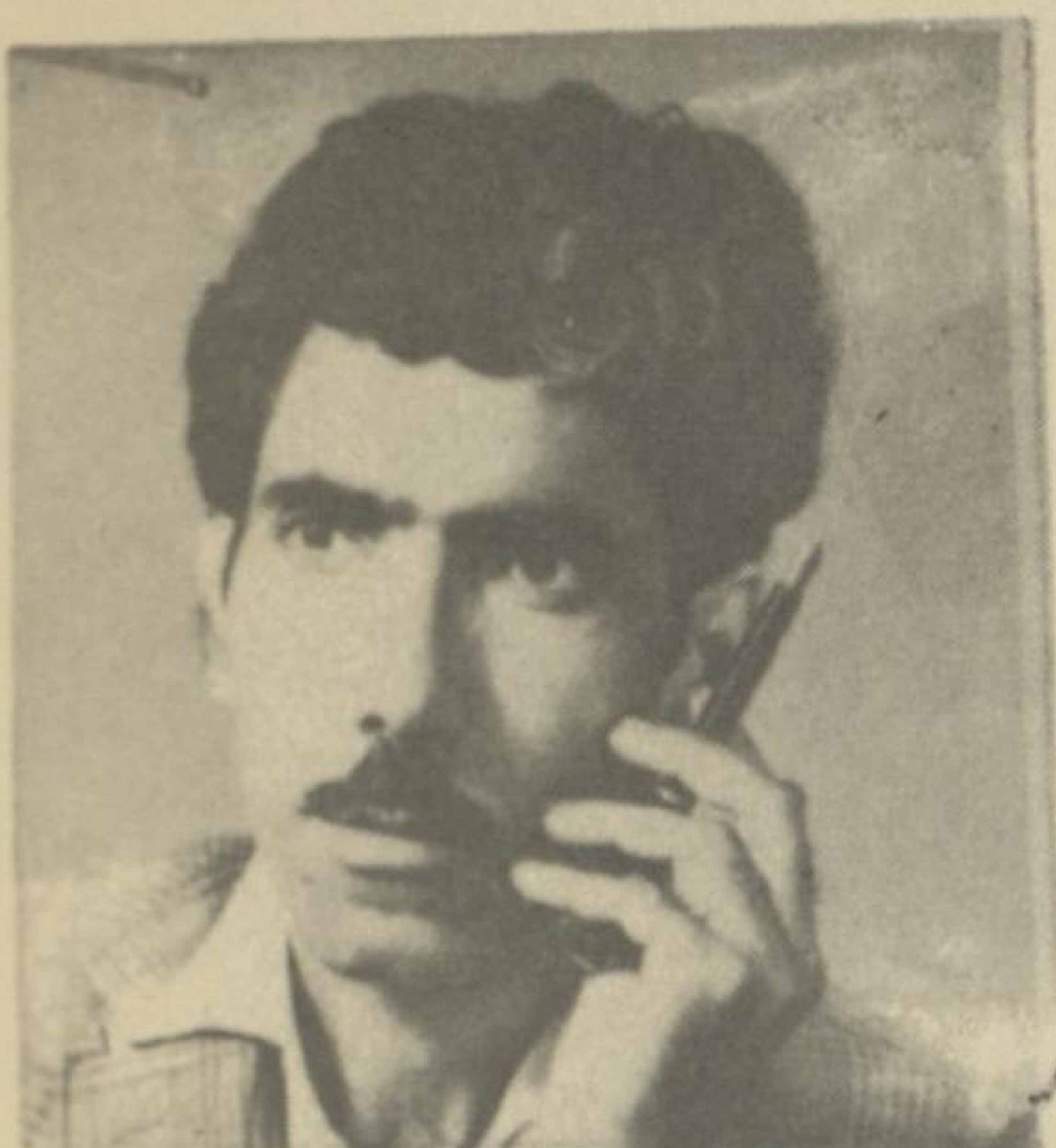
آئنہ بن کے وہ صورت سامنے جب آگئی
عکس اپنا دیکھ کر مجھ کو ہنسی آئی بہت

وہ سحر تاریکیوں میں آج بھی روپوش ہے
جس کے غم میں کھوچکے آنکھوں کی بینائی بہت

میں تو جھونکا تھا، اسیرِ دام کیا ہوتا کلیمؔ
اس نے زلفوں کی مجھے زنجیر پہنائی بہت

غزل کے نفسیاتی مطالعہ میں تلازم خیالات کی اہمیت کو تسلیم کر لیا جائے اور پھر اس کی رہنمائی میں مزید تفحص سے کام لیا جائے تو مطالعۂ غزل کو کئی نئی جہات سے روشناس کرایا جا سکتا ہے۔ تلازم کا انحصار چونکہ شعوری دلچسپی اور لاشعوری عوامل پر ہوتا ہے۔ اس لئے تلازمہ کے لئے ہیج بننے والا لفظ خیال یا تصور ایک ایسے مرکز کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کے گرد شعوری دلچسپی اور لاشعوری عوامل اسی طرح گردش کناں ملیں گے جیسے ایٹم میں نیوکلس کے گرد الیکٹرون اور پروٹون ملتے ہیں۔

(ڈاکٹر سلیم اختر)



کیف انصاری

کیف کی عمر اس وقت اڑتالیس سال کے قریب ہے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں، کیونکہ بقول انکے والدین نے تاریخ پیدائش لکھنے یا یاد رکھنے کا تکلّف کیا ہی نہیں۔ اور یہ تکلّف ان کے خیال میں کرنا بھی نہیں چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ تکلّف صرف سالگرہ منانے کے لئے کیا جاتا ہے اور سالگرہ امراء کے بچوں کے لئے مخصوص ہے۔

کیف کا اصل نام خیر محمد ہے۔ ان دنوں ڈیرہ غازی خان سے نکلنے والے ہفت روزہ "غرب" میں بطور مدیر معاون اور کالم نویس کام کر رہے ہیں۔ کیف انصاری کی تعلیم و تربیت قدیم انداز میں ہوئی ہے انہوں نے صرف قرآنی اور دینی تعلیم حاصل کی۔ شاعری میں ان کے استاد جناب عاصی متھراوی ہیں۔

شاعری کا ایک مجموعہ "زنجیروں کا نوحہ" شائع ہو چکا ہے۔

کیف انصاری

اک میں نہیں تھا درد کے منظر سے ہمکلام
شکنیں بھی سینکڑوں رہیں بستر سے ہمکلام

اک روز ختم ہو کے رہے گا شدید حبس
تیور، ہوا کے ہوں گے کھلے در سے ہمکلام

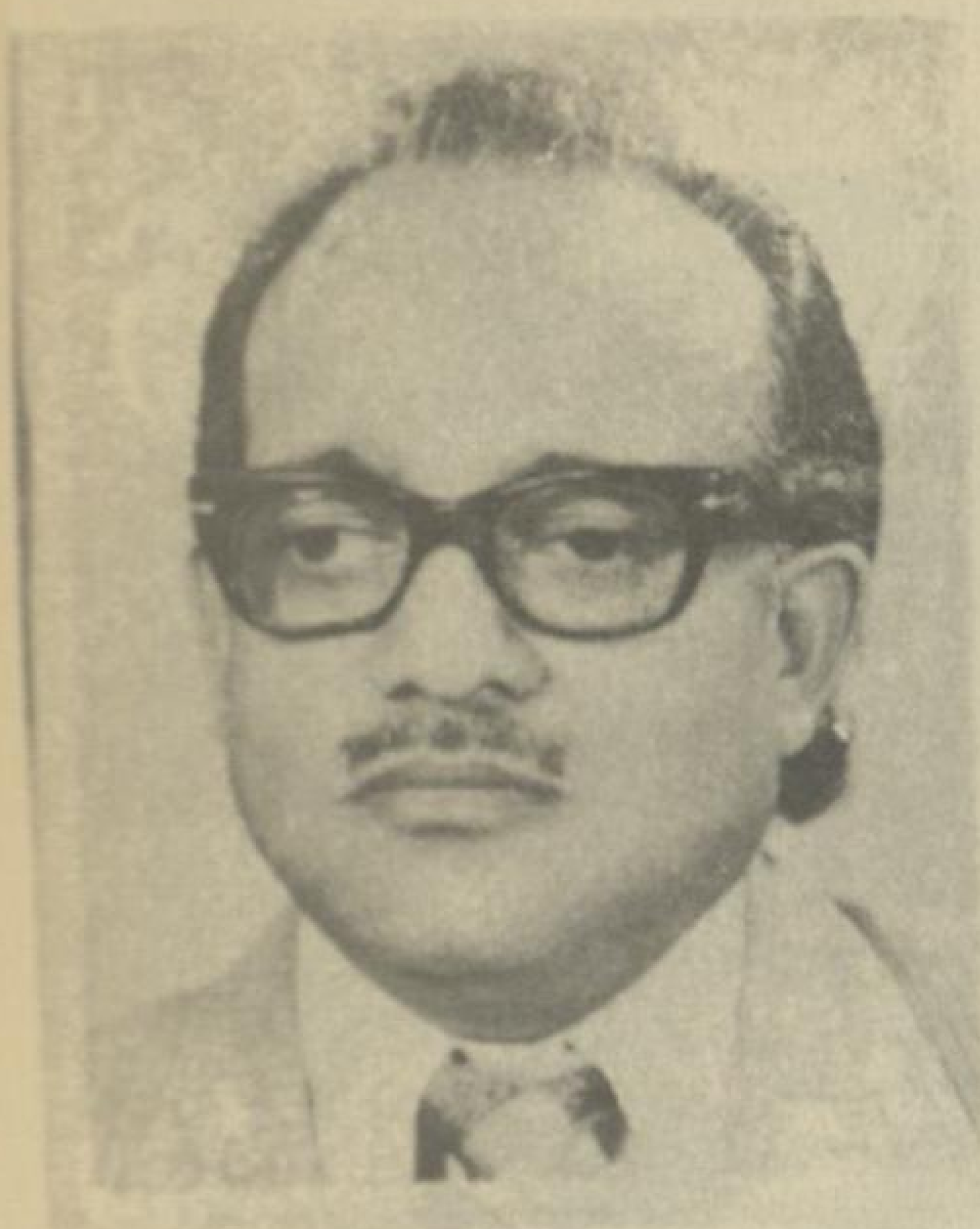
لہروں نے اس کو پھینک دیا خشک ریت پر
کشتی ہوئی تھی تیز سمندر سے ہمکلام

تصویرِ شامِ وصل ہے میری نگاہ میں
بامِ خیال ہے ترے پیکر سے ہمکلام

اپنائیں کیوں نہ پھول روش احتجاج کی
ہے شاخِ سبز، موجۂ صرصر سے ہمکلام

طاری رہے گا کشف کا عالم پرند پر،
جب تک ہے چونچ، سمٹے ہوئے پر سے ہمکلام

لکھی ہوئی ہیں ٹھوکریں آوارگی نے کیفؔ
ہونا ہے میرے پیر کو پتھر سے ہمکلام

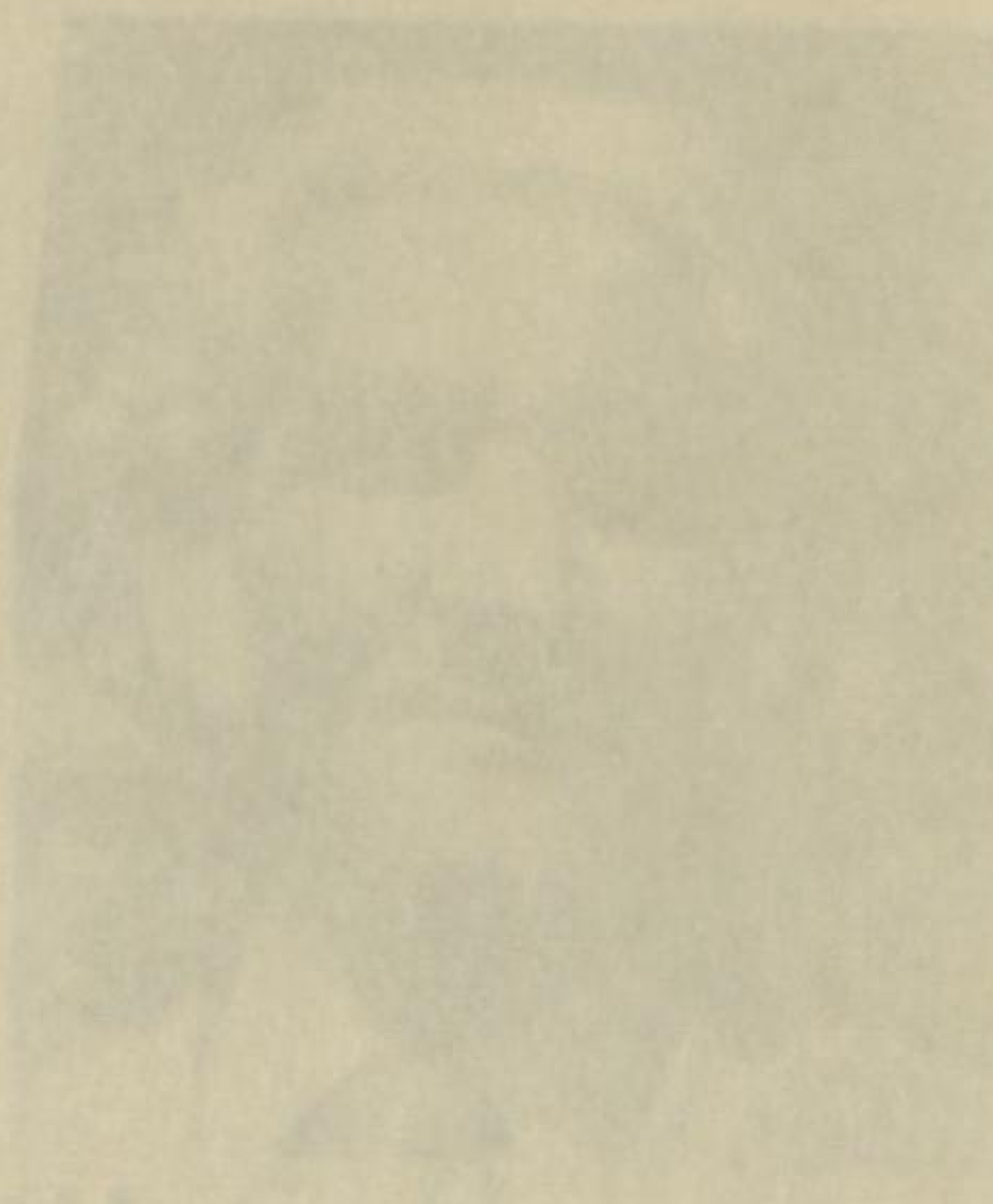


لیث قریشی

۶ مئی ۱۹۲۲ء کو غازی پور (بھارت) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن اعظم گڑھ ہے۔ آپ کا پورا نام ابواللیث قریشی ہے لیکن ادبی دنیا میں لیث قریشی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ شعر گوئی کا آغاز ۱۹۴۶ء سے کیا جو اب تک قائم ہے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت اختیار کی۔ آج کل نیشنل بنک آف پاکستان میں ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز ہیں۔ اپنی شاعری اور بنک کی ملازمت پر، ان کا تبصرہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں:

> "عالمِ دین کا بیٹا ہوں مگر آپ اس کو کیا کہیں گے کہ بنکاری بھی کرتا ہوں اور شاعری بھی۔ جبکہ یہ دونوں ہی فعل غیر شرعی ہیں۔ اوّل الذکر پیشہ ہے جو افتادِ وقت ہے اور موخر الذکر ذوق ہے جو افتادِ طبع ہے۔ بیک وقت دونوں ہی سے بحسن و خوبی نباہ کر رہا ہوں۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ ایک سے جبر و اکراہ کے ساتھ اور دوسرے سے برضا و رغبت۔"

۱۹۷۷ء میں آپ کی شاعری کا پہلا مجموعہ "لمسِ گریزاں" شائع ہوا ــــ دوسرا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔



لیث قریشی

بارہا یورشِ افکار نے سونے نہ دیا
فکر آزار ہے آزار نے سونے نہ دیا

بند تھیں دائرۂ خواب میں آنکھیں اپنی
فکر کی گردشِ پرکار نے سونے نہ دیا

تھی تصوّر میں نہاں خانۂ دل کی تصویر
رات بھر دیدۂ بیدار نے سونے نہ دیا

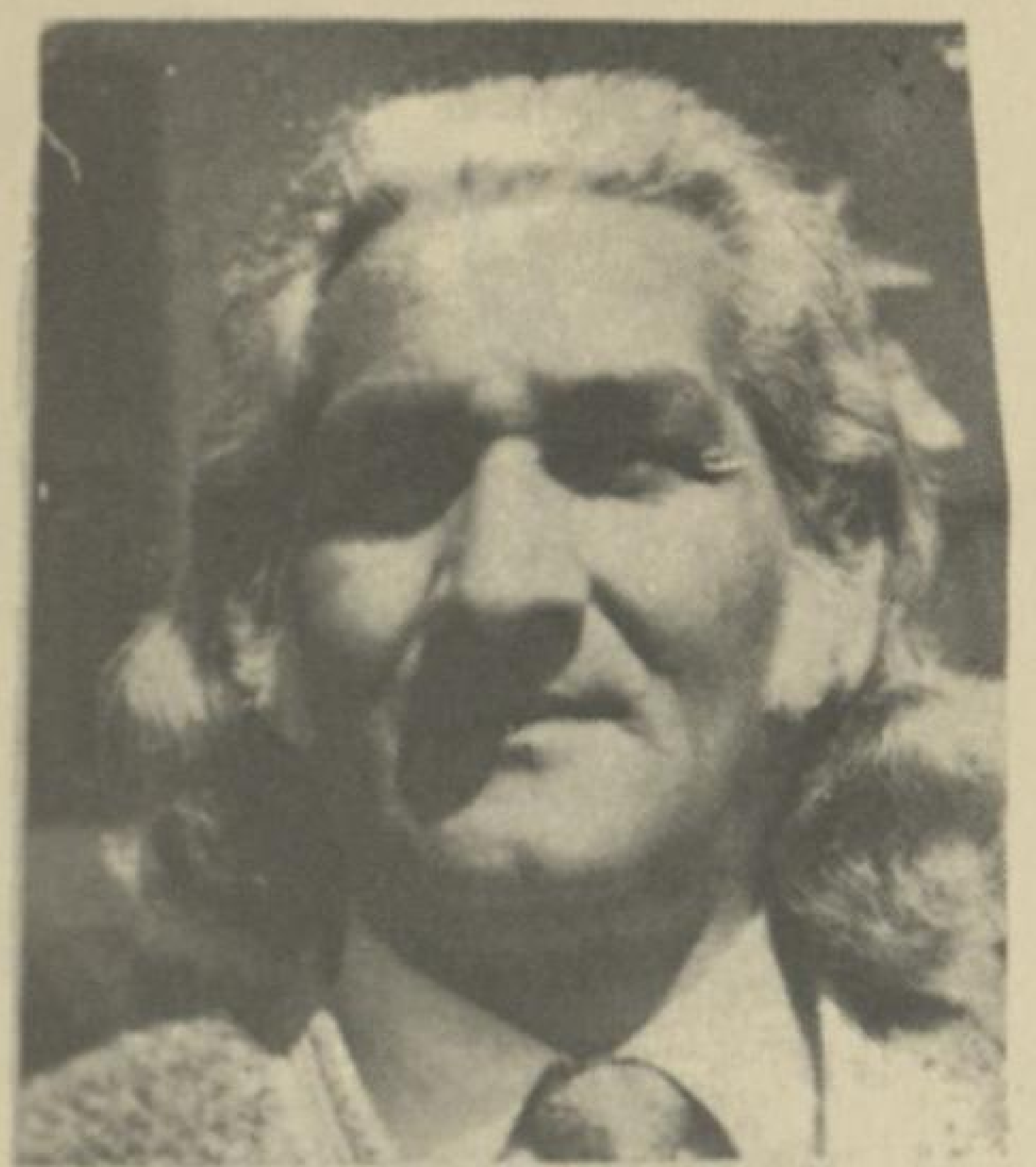
کوئی منظر تھا کہ تھا منظرِ رنگیں کا فریب
کیا کہیں خوابِ پراسرار نے سونے نہ دیا

مجھ پہ اس طرح سے روشن تھی حقیقت اپنی
عمر بھر چشمِ خبردار نے سونے نہ دیا

میں نے کچھ دھوپ میں جلتے ہوئے چہرے دیکھے
پھر مجھے سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا

رات بھر بارشِ الہام رہی ہے دل پر
صبح تک ابرِ گہر بار نے سونے نہ دیا

لیثؔ موضوعِ سخن ذکرِ بشر تھی، ہم تھے
اور پھر گرمیٔ گفتار نے سونے نہ دیا



ماجد الباقری

ماجد الباقری نام اور ماجد تخلص ہے۔ ۲۳ جولائی ۱۹۲۸ء کو ضلع آگرہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اعتماد پور اور ٹونڈلہ میں حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کے علاوہ لندن اسکول آف جرنلزم سے صحافت کا ڈپلومہ حاصل کیا۔

۵۰۱ سینٹرل ورکشاپ چکلالہ اور محکمۂ ترقی دیہات میں چندے ملازمت کرنے کے بعد اگست۔ ۱۹۶۰ء سے محکمۂ تعلقاتِ عامہ (پنجاب) میں ضلعی آفیسر اطلاعات ہیں۔

شاعری کا آغاز ۱۹۴۲ء کے لگ بھگ ہوا۔ غزلوں کا انتخاب "لفظ کی چادر" کے عنوان سے زیرِ ترتیب ہے۔

۱۹۶۸ء میں افسانوں کا مجموعہ "تاک جھانک" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

ماجد الباقری

کیا زمانہ آ گیا ہے دوست بھی دشمن لگے
جسم دل کی آنکھ سے دیکھو تو اک مدفن لگے

بے لباسی کو عطا کرتے ہیں لفظوں کا لباس
جب گریباں ہی نہیں ہے آستیں دامن لگے

چھاؤں میں اپنے ہی کپڑوں کی بدن جلتا رہے
چارپائی گھر لگے اور پائنتی آنگن لگے

بے معانی لفظ کی کثرت ہے ہر تحریر میں
مسئلہ جو بھی ہے اک بڑھتی ہوئی الجھن لگے

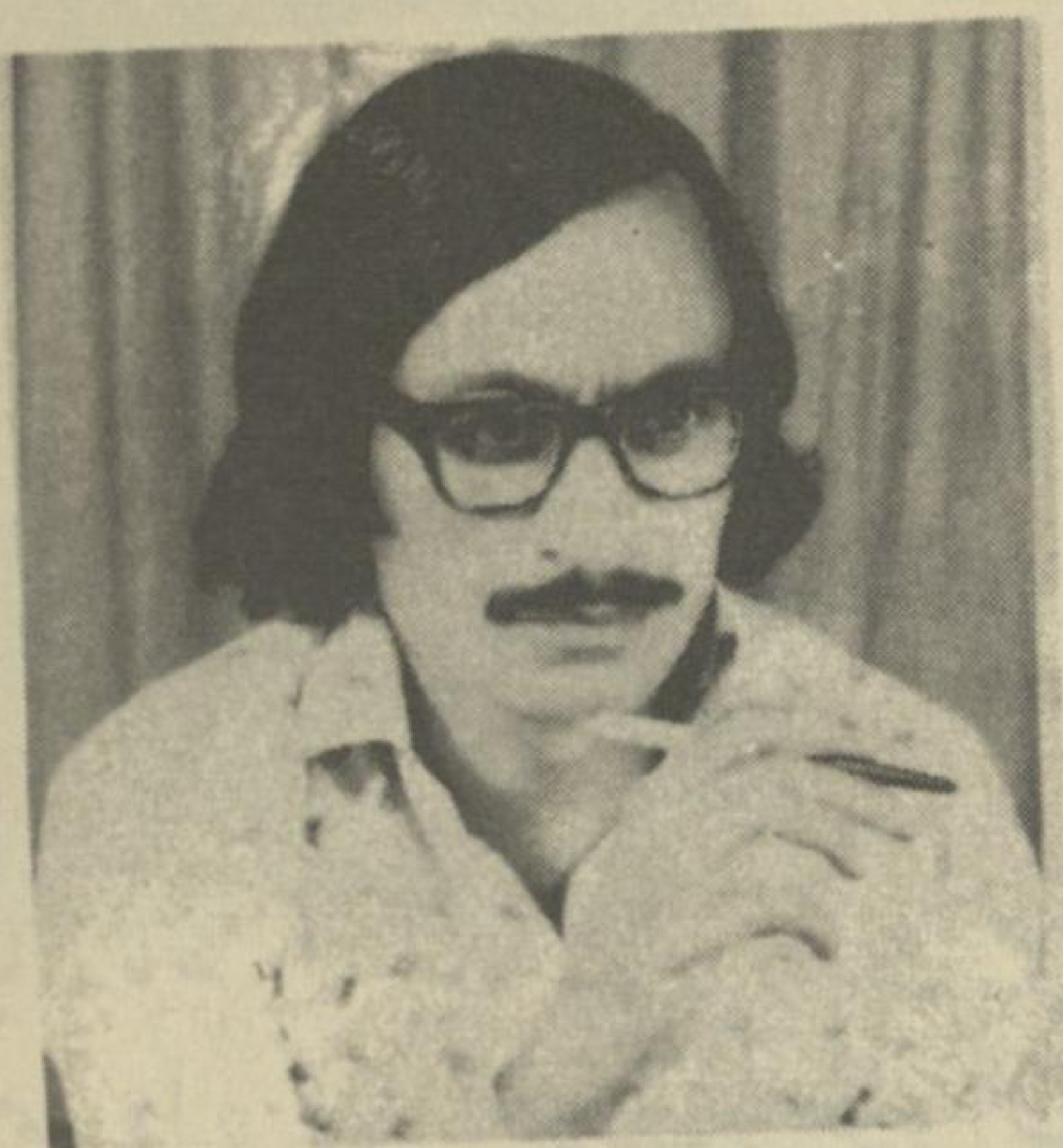
کورے کاغذ پر لکیروں کے گھنے جنگل تو ہیں
آج کا لکھا ہوا کل کے لئے ایندھن لگے

ذہن میں اگتے ہیں اب بے فصل چہروں کے گلاب
جو بھی صورت سامنے آتی ہے اک چلمن لگے

بستیوں کو توڑ دیتا ہے گھروندوں کی طرح
یہ بڑھاپا بھی مجھے انسان کا بچپن لگے

چھپ کے جب سایہ جڑوں میں بیٹھ جائے پیڑ کی
اجڑی اجڑی ڈالیوں کا سلسلہ گلشن لگے

دھوپ میں بے برگ ماجدؔ ہو گئی شاخِ صدا
وہ امس ہے جون کی گرمی میں بھی ساون لگے



ماجد صدیقی

ماجد صدیقی کا اصل نام عاشق حسین ہے، آپ یکم جون ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں شعبۂ اردو سے منسلک ہیں۔

ماجد صدیقی، اردو کے علاوہ پنجابی کے بھی شاعر و ادیب ہیں، آپ کی نظم و نثر، اور تراجم کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اردو شاعری: کروٹ کروٹ خوشبو، شاد باد منزلِ مراد، ہوا کا تخت، سرِ نور، یہ انسان، تمازتیں۔

پنجابی شاعری: وتھّاں ناپدے ہتھ، سوہناں لیندی اکھ، رتینجناں، میں کنّے پانی وِچ آں، گنگے دیاں رمزاں، ہاسے دا سیھا، سچ سہاگ اچیچ۔

نثر: صورت احوال آنکہ، دیگر احوال آنکہ۔

تراجم: کلام شاہ مراد، کلام شاہ شرف، رات دی رات، پرتاں، داشنا۔

ماجد صدیقی

فرہاد کی آس ہو چلا ہوں
میں سخت اُداس ہو چلا ہوں

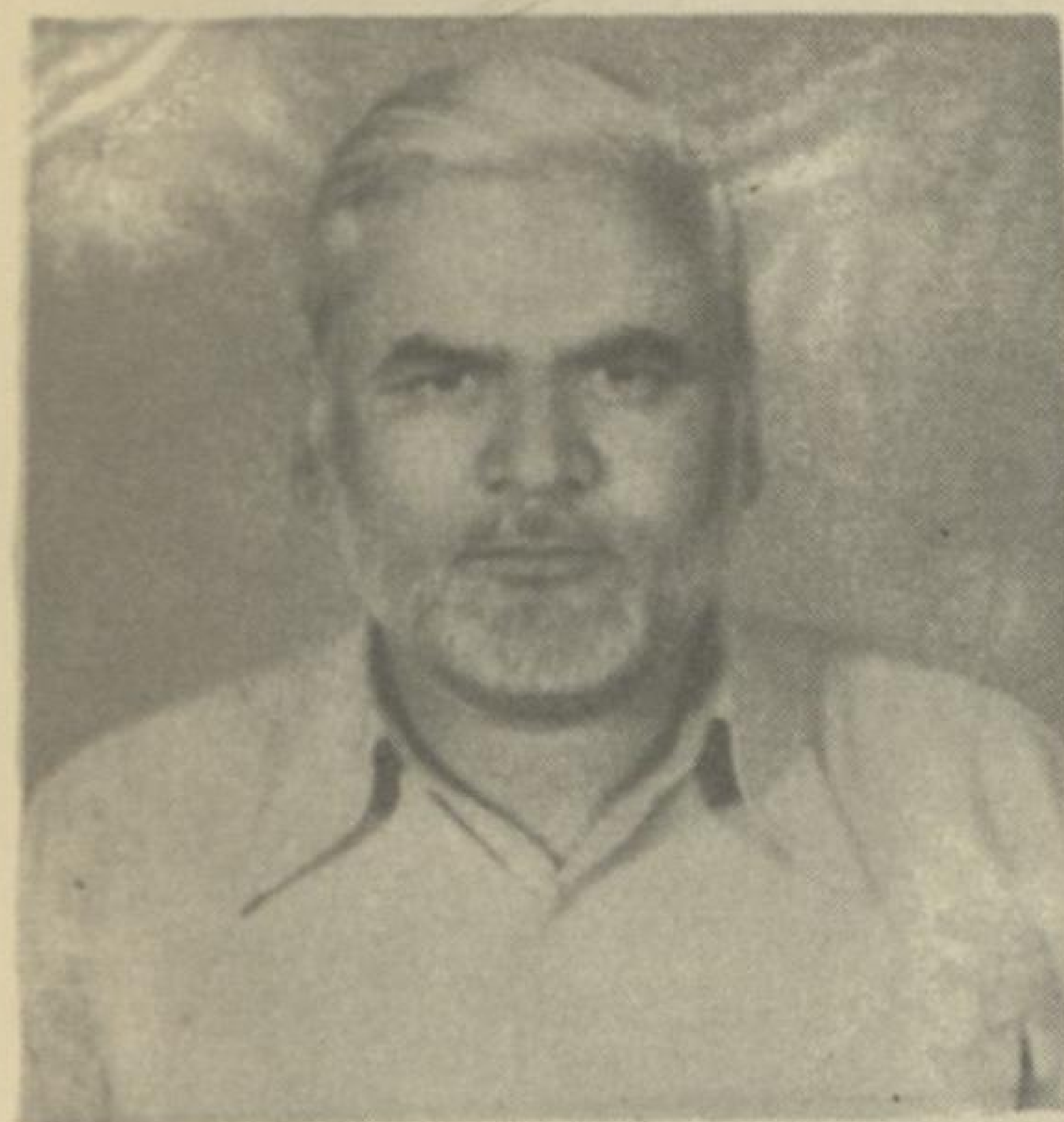
ہجرت پہ گئے ہوں جس کے باسی
اُس صحن کی گھاس ہو چلا ہوں

جس کی نہ اُٹھے کبھی عمارت
اُس گھر کی اساس ہو چلا ہوں

شاخوں سے جھڑے ہوئے گُلوں کی
بکھری ہوئی باس ہو چلا ہوں

ٹانکے کوئی مجھ کو بادلوں میں
میں دشت کی پیاس ہو چلا ہوں

ماجدؔ مجھے جانے کیا ہُوا ہے
برحق تھا قیاس ہو چلا ہوں



مبارک اکمل گیلانی

نام مبارک حسین شاہ، قلمی نام مبارک اکمل گیلانی، تعلیم ایم، اے (اردو) بی، ٹی۔ روزگار تعلیم و تدریس۔ ۱۹۳۷ء میں ہزارہ کے شہر مانسہرہ کے قریب موضع خوش حالہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۲ء میں مانسہرہ ہائی سکول سے میٹرک، ۱۹۵۶ء میں پشاور یونیورسٹی سے بی، اے، ۱۹۵۸ء میں بی، ٹی اور ۱۹۶۱ء میں ایم، اے (اردو) کے امتحانات پاس کئے، ۱۹۵۸ء سے محکمۂ تعلیم سے منسلک ہیں، پہلے پہل کچھ دنوں ایک سکول میں پڑھایا، آجکل آپ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں اردو کے استاد ہیں۔

۱۹۷۱ء تک بیشتر غزل کہی۔ یوں تو آپ کی غزل میں عصری رجحانات اور سماجی شعور کی چھاپ ہمیشہ سے رہی ہے لیکن ۱۹۷۱ء کا المیۂ پاکستان اپنے درد کے اظہار کے لئے ایک واضح تر پیرایۂ بیان یعنی غزل کے ساتھ نظم گوئی تک لے گیا۔ ان کی چند خاص مطبوعہ نظمیں یہ ہیں: "نصیبِ اقوام مشرق" ــــ "آگہی کا قطرہ قطرہ زہر" ــــ اور "نفی کی فصل کا حاصل"۔

مبارک اکمل گیلانی

وہ ایک شخص بھی دیکھا، تو دشمنوں میں تھا
کہ نام جس کا مرے دل کی دھڑکنوں میں تھا

قدم قدم پہ وُہ مڑ مڑ کے دیکھتا تھا مجھے
کہ مجھ کو چھوڑ تو نکلا، پہ الجھنوں میں تھا

چھُپے پڑے تھے سبھی لوگ بند کمروں میں
کہ آگہی کا بڑا خوف آنگنوں میں تھا

میں اس کی یاد بھُلانے، جو گھُومنے نکلا،
وُہ شہر کے سبھی چہروں میں، چلمنوں میں تھا

کوئی بھی سمت نہ تھی، تیرے دام سے باہر
میں جس طرف بھی گیا تیرے بندھنوں میں تھا

سروں کے بوجھ سے آزاد ہو کے بھی دیکھا
شناختوں کا وہی طوق گردنوں میں تھا

یہ کیا سفر تھا کہ جب لوگ لوٹ کر آئے
تو بس غُبارِ ندامت ہی دامنوں میں تھا

صبا یہ کیسی تھی اکمل کہ جس کے جھونکوں سے
فروغ شعلوں کا ہم سوختہ تنوں میں تھا



محبؔ عارفی

اصل نام محب اللہ ہے لیکن محبؔ عارفی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ محبؔ عارفی ۲ جنوری ۱۹۱۹ء کو قصبہ یوسف پور ضلع غازی پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ بچپن کے ابتدائی سال وہیں گزرے۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم بنارس شہر میں حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ پہنچے اور چھ تعلیمی سال وہاں گزار کر بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۰ء میں مرکزی حکومت کی ملازمت اختیار کی۔ اور وزارت خزانہ سے متعلق رہے۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل طور پر کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔

نظموں اور غزلوں کا ایک مختصر مجموعہ "گلِ آگہی" ترتیب دیا جو ایک کتاب کے حصّہ کے طور پر ۱۹۶۲ء میں چھپا۔ اس کتاب کا نام "تین کتابیں" تھا۔ ۱۹۷۶ء میں آپ کا دوسرا مجموعہ (چند غزلیں، چند نظمیں اور فلسفۂ شاعری کے بارے میں ایک مضمون) "چھلنی کی پیاس" کے نام سے شائع ہوا۔ چند ادبی مضامین بھی لکھے ہیں جو ادبی رسائل میں طبع ہو چکے ہیں۔

محبؔ عارفی کی شاعری کی عمر خاصی ہے مگر ان کا کلام اس کی مناسبت سے بہت ہی کم ہے۔ اپنی کم گوئی کا سبب بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"شاعری کا سودا لڑکپن سے ہے۔ انواع و اقسام کی شعر انگیز کیفیتیں ہر شاعر کے دل پر گذرتی ہیں لیکن جس کیفیت کے متعلق مجھے اطمینان نہیں ہو جاتا کہ پائیدار ہے میں عموماً اس سے شعر کشید نہیں کر پاتا۔ یہ ایک بڑی وجہ ہے اس بات کی کہ میری شعری تخلیقات کی مقدار بہت کم ہے۔"

محب عارفی

عمر بھر جس پہ تکیہ رہا، کچھ نہ تھا، دل نہیں مانتا
کیا کروں تجزیوں کا اٹل فیصلہ، دل نہیں مانتا

کوند کر ایک لمحہ جو پھر جا ملا وقت کے ابر میں
چھوڑ دے گی اسے وقت کی مامتا، دل نہیں مانتا

گھُپ اندھیرے سے لیتی ہے کیونکر جنم، روشنی کی لگن
یہ کرشمہ نہیں ہے کسی شمع کا، دل نہیں مانتا

خشک ہی کیوں نہ ہو جائے دریا مرا، لہر بن بن کے میں
ڈھونڈنا چھوڑ دوں خشکیوں کا سرا، دل نہیں مانتا

اپنے مرکز کو اک وہم سمجھا کیا، عقل کا دائرہ!
جس کو کچھ اپنے دامِ کشش کے سوا، دل نہیں مانتا

اس کی تصویر کو دیکھتے دیکھتے، یہ ہُوا کیا مجھے
یعنی بے حِس ہے تصویر کی ہر ادا، دل نہیں مانتا

دل میں کچھ ہے، زباں سے نکلتا ہے کچھ، بات ایسی ہے کچھ
میرا مطلب محبؔ کوئی پا جائے گا، دل نہیں مانتا



محسن احسان

اصل نام احسان الٰہی اور تخلص محسنؔ ہے۔ کسی زمانے میں احسان نیّرؔ تھے، پھر احسان محسنؔ ہوئے اور اب محسن احسان ہیں۔ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ آپ پشاور کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اس خاندان کو چونکہ شعروادب سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے پہلے پہل ان کی ادبی کاوشیں تضحیک کا نشانہ بنیں مگر بعد میں عزّت اور شہرت کے حصول سے افرادِ خاندان مطمئن ہو گئے۔

محسنؔ نے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا ہے اور گذشتہ بیس برس سے اسلامیہ کالج پشاور سے وابستہ ہیں۔

"ناتمام" کے نام سے مجموعۂ کلام چھپنے والا ہے۔ انگریزی کے تین ڈراموں کے اردو تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

محسن احسان

جو زخم زمین دھو رہا ہے
وہ نت نئے خواب بو رہا ہے
تر دستیٔ کوہکن کے آگے
کوہسار، غبار ہو رہا ہے
غنچوں کی قبائیں سینے والا
نیزوں میں انہیں پرو رہا ہے
ہم بھی ہیں مرید نامرادی
یہ ابر ہمیں پہ رو رہا ہے
کچھ ایسی ہوا چلی کہ سب کو
احساسِ گناہ ہو رہا ہے
اسلوبِ جمال تیرا پڑھنے
ماہتاب طلوع ہو رہا ہے
کر خدمتِ پیرِ شب پرستاں
یہ سب کے گناہ دھو رہا ہے
خورشید کی روشنی کو جگنو
عجلت سے گھر اپنے ڈھو رہا ہے
تو جاگ کے کیا کرے گا محسنؔ
جب ملک ہی سارا سو رہا ہے



محسن بھوپالی

نام عبدالرحمٰن اور تخلص محسنؔ۔ تاریخ پیدائش ۲۹ ستمبر ۱۹۳۲ء بمقام بھوپال۔ ابتدائی تعلیم الیگزینڈر ہائی سکول بھوپال سے حاصل کی۔ تقسیم برصغیر کے وقت آپ کے والد نے جو محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے، پاکستان آنا منظور کر لیا تھا اس لئے محسنؔ اہل خاندان کے ہمراہ ۷ انومبر ۱۹۴۷ء کو لاڑکانہ پہنچے۔ میٹرک کی سند، سندھ یونیورسٹی اور انجینئرنگ کا ڈپلومہ این ای ڈی کالج سے حاصل کیا۔ حال ہی میں ایم اے (اردو) کا امتحان کراچی یونیورسٹی سے پاس کیا ہے۔ ۱۹۵۲ء سے محکمۂ تعمیرات حکومت سندھ میں ملازم ہیں اور آج کل اسسٹنٹ انجینئر ہیں۔

مختلف ادبی تنظیموں سے وابستہ رہے ہیں۔ بزمِ قابل کے کنوینر، ایوانِ ادب کے جنرل سیکرٹری اور رائٹرز گلڈ صوبہ سندھ کی مجلسِ عاملہ کے رکن ہیں۔ اب تک محسن کے تین شعری مجموعے ۱۹۶۱ء میں "شکستِ شب"، ۱۹۶۹ء میں "جستہ جستہ" اور ۱۹۷۵ء میں "نظانے" شائع ہو چکے ہیں۔ نظموں غزلوں پر مشتمل تازہ مجموعہ "ماجرا" زیرِ طبع ہے۔

تقریباً بیس سال اندرون سندھ مختلف شہروں میں بسر ہوئے۔ اس دوران سندھی کے معروف شعراء کی نظموں کے منظوم اردو ترجمے کئے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔
گذشتہ گیارہ برس سے کراچی میں مقیم ہیں۔

محسن بھوپالی

اس سے پیماں ہی کچھ ایسا باندھا
جسم سے سانس کا رشتہ باندھا

کسی عالم میں بھی مایوس نہ تھے
ہم نے حسرت کو تمنّا باندھا

پیش اس کے وہی سیراب ہوا
جس نے قطرے کو بھی دریا باندھا

سوچ کر حرفِ زیاں ورد کیا؟
جان کر درد سے رشتہ باندھا

مثلِ خاشاک رہے گرمِ ستیز
زورِ دریا نے بلا کا باندھا

پھر گزارے ہوئے موسم لوٹے
پھر خط و رنگ نے نقشہ باندھا

پھر ہوا سلسلۂ اشک رواں
پھر خیالات نے تانتا باندھا

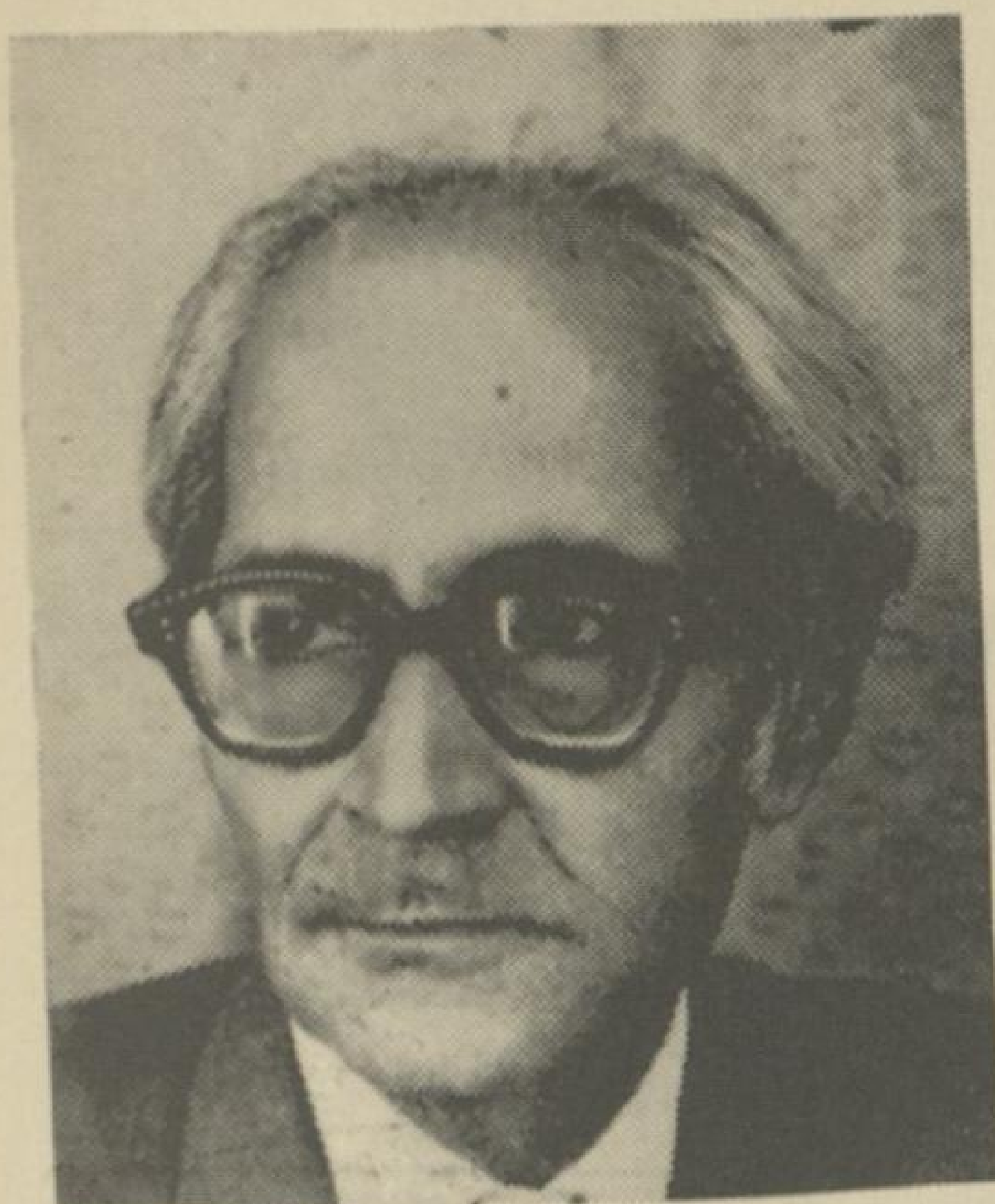
اس کو دیکھا نہ نظر بھر کے کبھی
اور شعروں میں سراپا باندھا

بات کہنے کی ہمیشہ بھولے
لاکھ انگشت پہ دھاگا باندھا

دیر تھی اذنِ سخن کی محسنؔ
پھر سماں ہم نے بھی ایسا باندھا

کوئی بھی شاعر اس لئے غزل نہیں کہتا کہ وہ تغزّل کو نبھانا چاہتا ہے بلکہ بنیادی طور پر اس کا مقصد اپنے جذبات اور خیالات کے ذریعہ اپنی شخصیت کا اظہار کرنا ہوتا ہے اور چونکہ انسانی شخصیت کسی ایک موضوع کی پابند نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی ایک دور تک محدود ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی اکائی ہے جو بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے ساتھ ساتھ پھیلتی ہے اور پھر چونکہ اس کی بناوٹ میں گزرا ہوا اور آنے والا زمانہ بھی شامل ہوتا ہے اس لئے اس کا تعلق نہ صرف اپنے زمانہ بلکہ ہر زمانے سے ہوتا ہے ۔

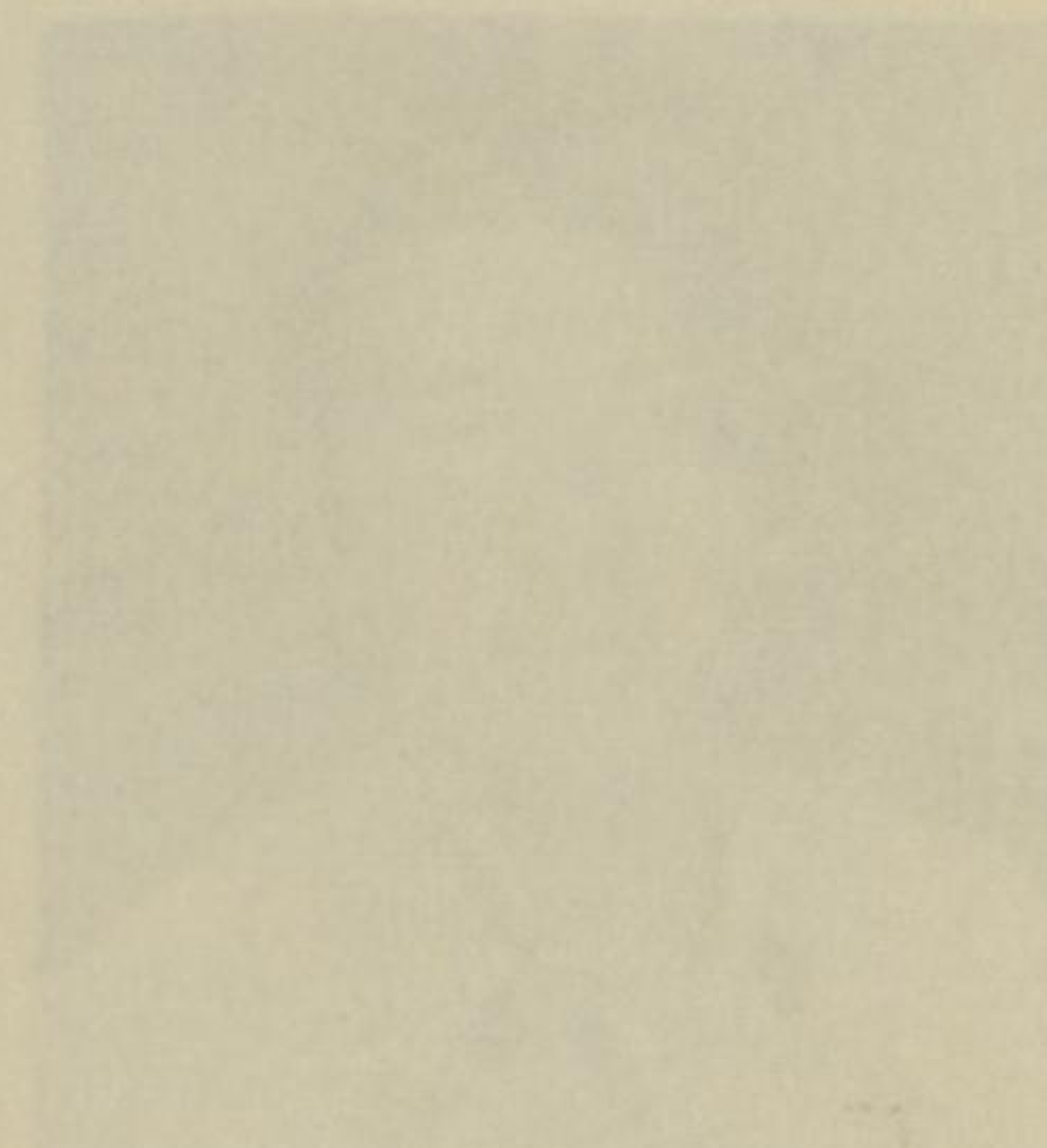
(صلاح الدین ندیم)



محشر بدایونی

اصل نام فاروق احمد اور ادبی نام محشر بدایونی ہے۔ اردو کے غزل گو شعراء میں ایک اہم نام کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے مجلّہ "آہنگ" کراچی کے ایک عرصہ تک مدیر رہے۔ آج کل کراچی ہی میں مقیم ہیں۔

شہرِ نوا، شاعر نامہ، سائنس نامہ، بین باجے اور غزل دریا، آپ کی مطبوعہ تصانیف ہیں۔



محشر بدایونی

نہ صحن و بام نہ دیوار و در پرانے ہیں
اگر مکیں ہیں پرانے تو گھر پرانے ہیں

سخاوتوں ہی کے دم سے ہے تازگی کا بھرم
ثمر نہ دیں تو یقیناً شجر پرانے ہیں

دل ایسی صورتِ تعمیر پر جمے کب تک
تمام نقش ہی دیوار پر پرانے ہیں

میں اس دیار میں اب بھی ہوں تازہ ضو کہ جہاں
ادھر جلاؤ دیے اور ادھر پرانے ہیں

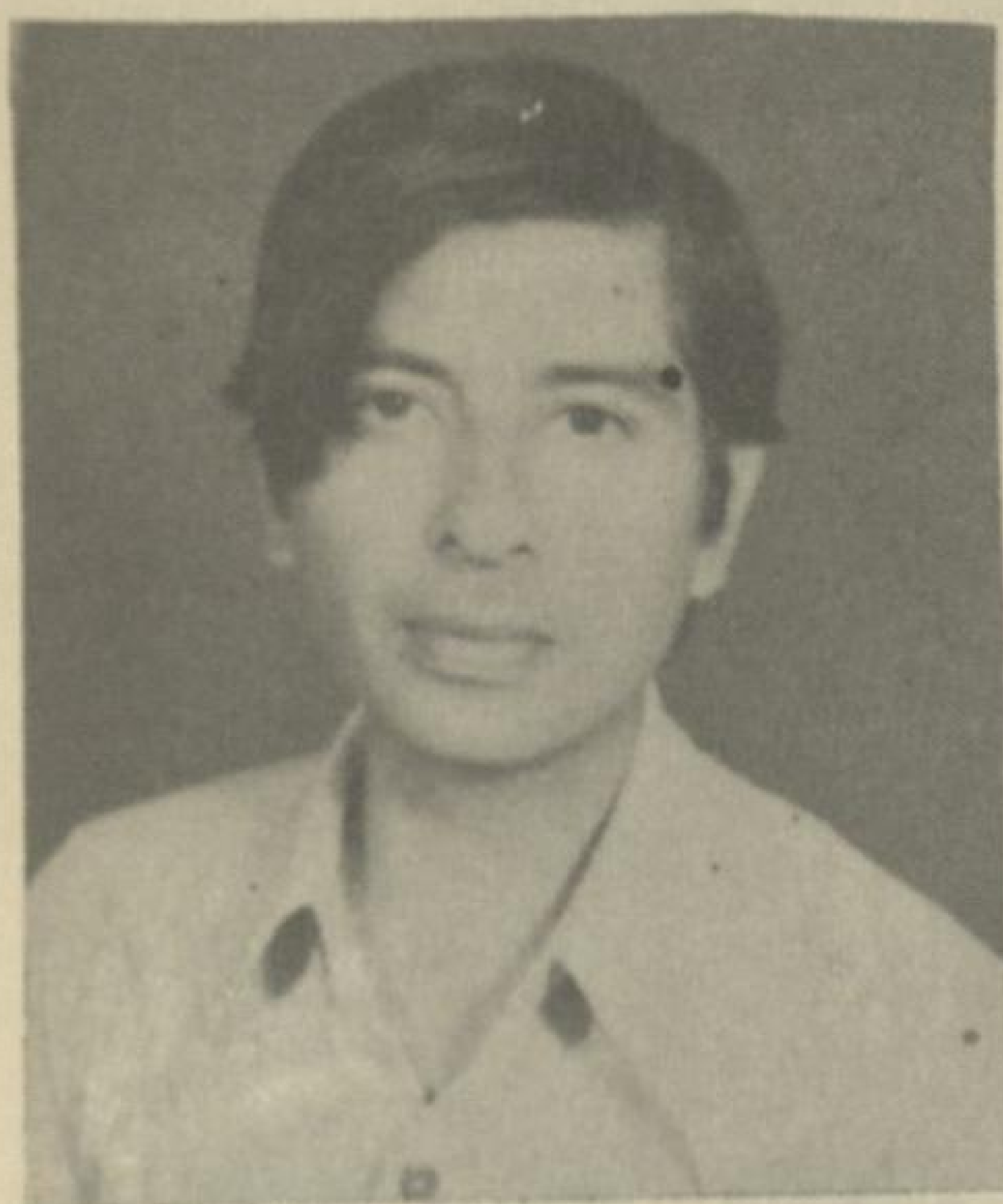
ہوا کی لہر ہے اب جس طرح بھی شہرت دے
جنوں پرانا نہ آشفتہ سر پرانے ہیں

قباحتیں تو یہی ہیں مسافتوں میں مری
سفر نیا ہے شریکِ سفر پرانے ہیں

میں نابلد ہوں رفو کی روایتوں سے تو پھر
نکلتے کیوں نہیں جو بخیہ گر پرانے ہیں

یہ ربطِ خیر نشاں ہے صفِ ہنر کے لیے
جو کچھ نئے ہیں تو کچھ دیدہ ور پرانے ہیں

سبھی خرابے ہیں دوشِ زمیں پہ بار مگر
زیادہ بوجھ وہ ہیں جو کھنڈر پرانے ہیں

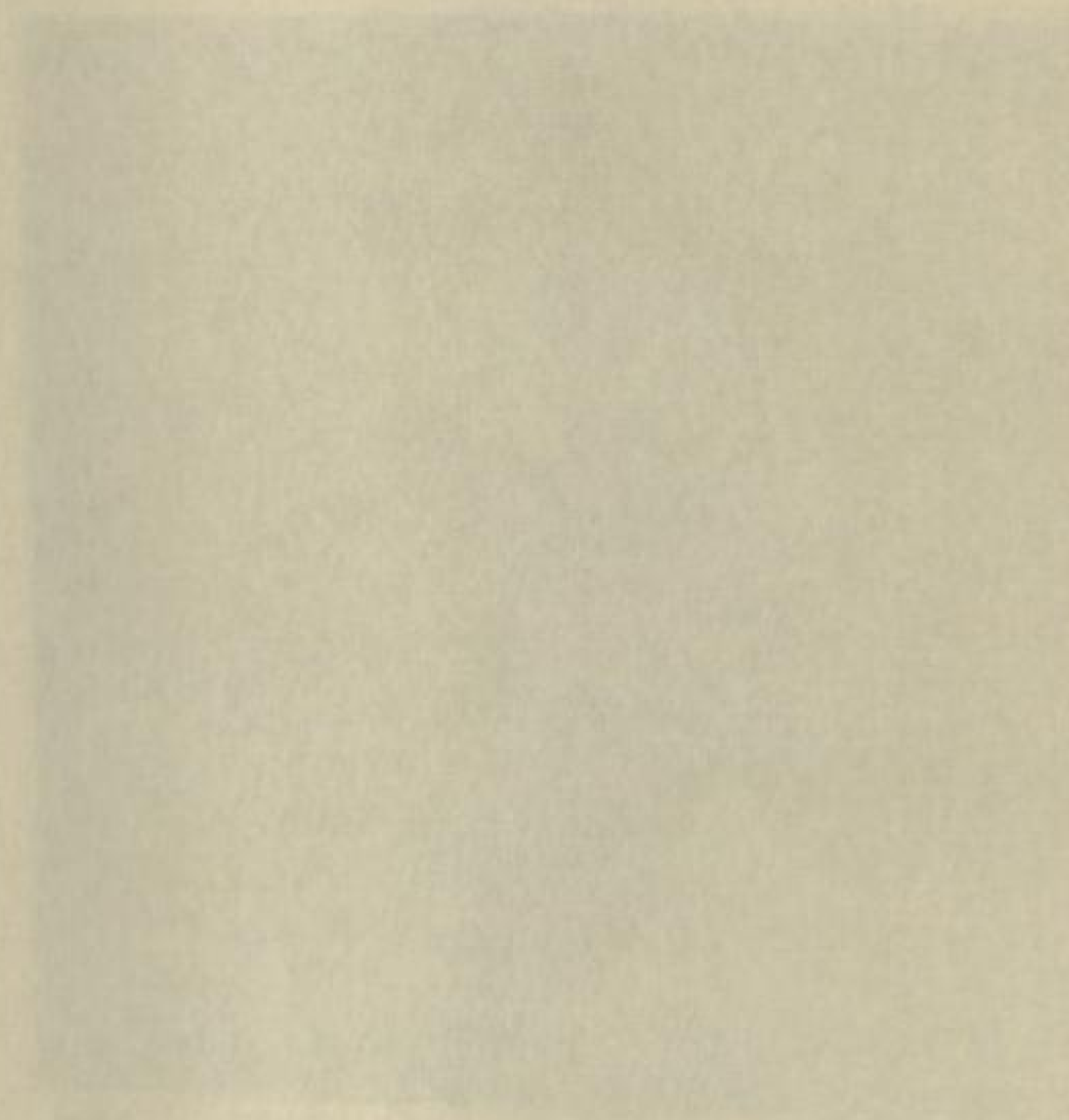


محمد رئیس

نام محمد رئیس، رئیسؔ تخلص۔ والد کا اسم گرامی مولانا محمد یونس ہے۔ آپ ۲۵ جنوری ۱۹۴۲ء کو بمقام متیؔ (بارہ بنکی، بھارت) پیدا ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ تک، لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی، جس کے بعد آپ پاکستان آگئے اور کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۶۳ء میں بی اے اور ۱۹۶۵ء میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۶۵ء ہی سے آپ سراج الدولہ کالج کراچی میں شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

محمد رئیس نے نظموں اور غزلوں کے علاوہ، تنقیدی اور تعلیمی موضوعات پر مضامین بھی لکھے ہیں۔

مجموعۂ کلام "آشنا" کے نام سے زیر ترتیب ہے۔



محمد رئیس

جوں زمیں دُور آسماں سے ملے
دشمنِ جاں بھی مہرباں سے ملے

سارے موسم اسی کے موسم تھے
فصلِ گل سے ملے، خزاں سے ملے

موسمِ گل میں جیب و داماں کے
ہم کو ٹکڑے کہاں کہاں سے ملے

کچھ بھٹکتے ہوئے پرندوں کو
اس کی آنکھوں میں آشیاں سے ملے

وہ گیا ہے تو ہم گئے سب سے
وہ ملا ہے تو اک جہاں سے ملے

کل سیہ رات کے سفینے میں
کیا سفر تھا کہ رفتگاں سے ملے



محمود شارب

محمود شارب کا اصل نام محمود علی خاں ہے، آپ یوسف زئی پٹھان ہیں۔ شارب ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ جہاں آپ کے والد بہ سلسلہ ملازمت مقیم تھے یوں تو محمود شارب کے بزرگوں کا اصل وطن مرزا پور تھا مگر الہ آباد کو وطنِ ثانی کا درجہ حاصل تھا یہیں شارب نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور یہیں کے ادبی ماحول میں ان کا ذوق شعری پروان چڑھا۔ محمود شارب نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔

کم عمری میں شادی کے بندھنوں میں جکڑے جانے کے سبب، جسم و جاں کے رشتہ کو برقرار رکھنے کے لئے، انہوں نے دہلی کا رُخ اختیار کیا۔ ملک تقسیم ہوا تو شارب دہلی سے لاہور آ گئے اور جب سے یہیں مقیم ہیں۔

آپ کا مجموعۂ کلام "لب و لہجہ" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ قطعات کا ایک مجموعہ "سنگ در سنگ" کے عنوان سے ترتیب و تکمیل کے مراحل میں ہے۔

محمود شارب

سوال یہ نہیں قائم ہے تیرگی کیسے
سوال یہ ہے کہ پیدا ہو روشنی کیسے

مری طرح یہ زمانہ بھی سوچتا ہوگا
سمیٹ لوں میں زمانے کی ہر خوشی کیسے

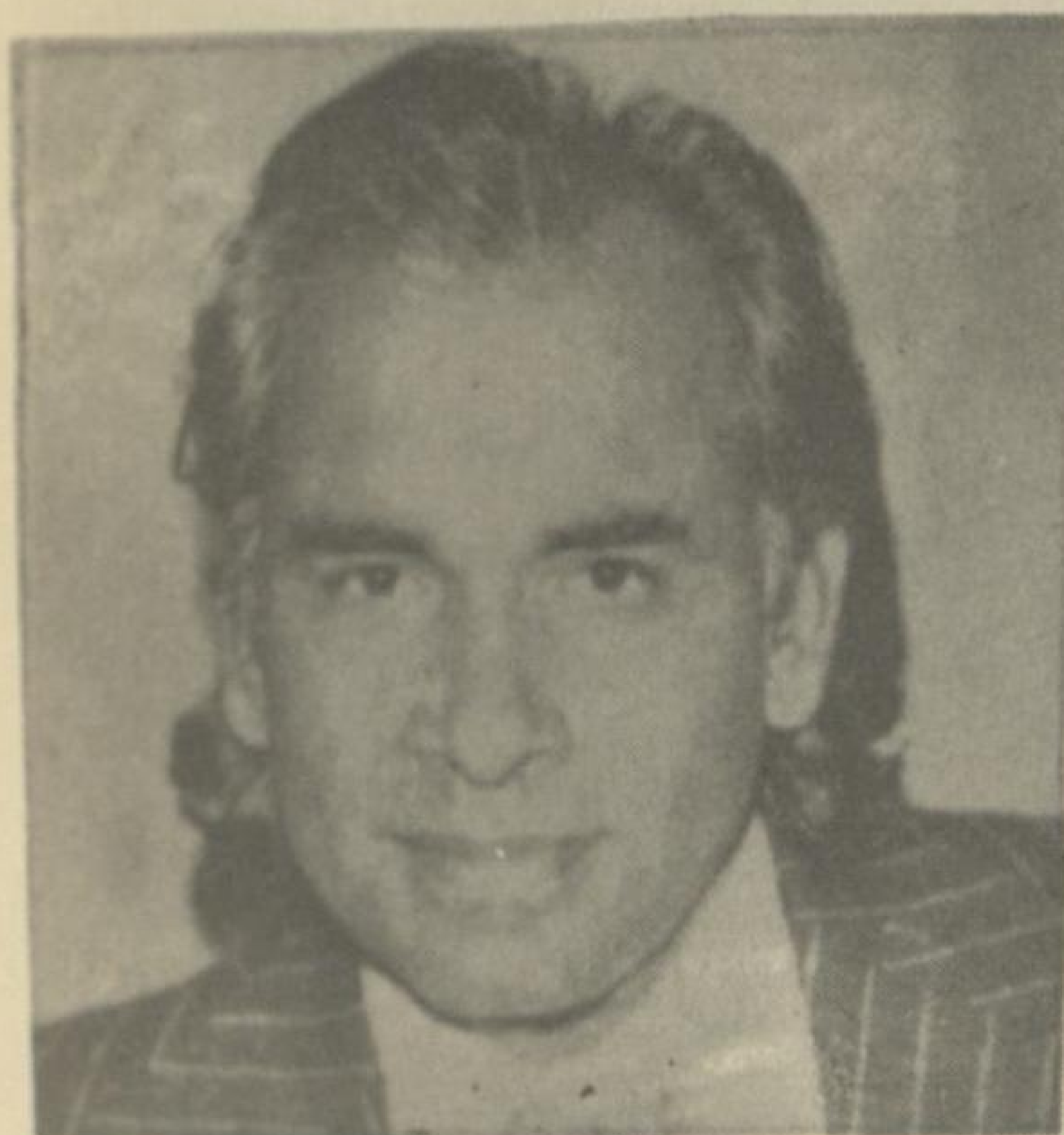
ملا ہے اپنا بھی اپنوں سے اجنبی کی طرح
تو پھر کسی کو کہے کوئی اجنبی کیسے

مرا خلوص تصنّع ، مرا سلوک فریب
کرے گا کوئی بھلا مجھ سے دوستی کیسے

مری نظر میں عبادت ہے فقر و فاقہ بھی
ترے خیال میں ہوتی ہے بندگی کیسے

نہ زندگی کا تصوّر نہ زندگی کی تڑپ
یہ تیرے شہر میں بستے ہیں آدمی کیسے

ضرور ہوگا کوئی اور مشغلہ شاربؔ
کسی کی چین سے کٹتی ہے زندگی کیسے



مرتضیٰ برلاس

مرتضیٰ برلاس ریاست رام پور کے 'ملک مغلاں' کی بستی میں ۲۰ جنوری ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ کالج مراد آباد (یوپی) سے اور ریاضی میں ایم ایس سی ۱۹۵۵ء میں آگرہ یونیورسٹی سے کیا۔ اعزازی طور پر ہیوٹ مسلم انٹر کالج مراد آباد میں ایک سال تک پڑھاتے رہے۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں آپ نے پاکستان ہجرت کی۔ ۱۹۶۰ء میں آپ پنجاب کی سول سروس میں منتخب ہوئے اور مختلف اضلاع میں بطور مجسٹریٹ اور اسسٹنٹ کمشنر کے فرائض سرانجام دیئے۔

۱۹۷۶ء میں پاکستان آرٹس کونسل لاہور (الحمرا) کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر مقرر ہوئے اس کے بعد آپ پھر صوبائی سول سروس میں واپس آگئے اور آج کل سرگودھا ڈویژن میں ایڈیشنل کمشنر ہیں۔

آپ نے اپنے بڑے بھائی جناب مصطفیٰ راہی تلمیذ جگر مراد آبادی کے شعری ذوق کے زیر اثر شعر کہنا شروع کیا، باقاعدہ اصلاح کسی سے نہیں لی۔ معاشرتی کرب کے بیباک شعری اظہار کا منفرد لہجہ آپ کی پہچان ہے۔

غزلیات کا پہلا مجموعہ "تیشۂ کرب" چھپ چکا ہے۔ ایک سرگزشت "اپنے زخموں کا لہو" زیر ترتیب اور دوسرا شعری مجموعہ "گرہ نیم باز" زیر طبع ہے۔

مرتضیٰ برلاس

بدن میں جاگ اٹھیں کپکپاہٹیں کیسی
میں سن رہا ہوں یہ فرداشی آہٹیں کیسی

وجود ٹوٹ رہا ہو تو کیسی نغمہ گری
جو دل سکوں سے نہ ہو گنگناہٹیں کیسی

مکیں کو یاد ہزیمت کی داستاں ہے اگر
تو اس کے گھر میں ہیں یہ جگمگاہٹیں کیسی

شکستِ دل کا جو احساس اب بھی زندہ ہے
تو پھر یہ ہونٹوں پہ ہیں مسکراہٹیں کیسی

فرازِ دار مقدر بنے کہ زہر کا جام
دیارِ شوق میں اب ہچکچاہٹیں کیسی

سمجھ کے سنگ جسے چھو لیا بدن تو نہ تھا
رگوں میں دوڑ گئیں سنسناہٹیں کیسی

قبولِ عام کا منصب جو میرے فن کو ملا
تو دوستوں کو ہوئیں تلملاہٹیں کیسی



مرزا اسد بیگ

مرزا اسد بیگ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ ٹنڈو ٹھوڑو (حیدرآباد) میں پیدا ہوئے۔ آپ شمس العلماٗ مرزا قلیچ بیگ صاحب صوبۂ سندھ جیسی مشہور و معروف شخصیت کے بڑے فرزند ہیں۔

آپ نے پہلے ایم، اے اور پھر ایل ایل بی کیا۔ سرکاری ملازمت محکمۂ امداد باہمی سے شروع کی۔ جس کے دوران آپ سندھ کے مختلف علاقوں، ملتان اور لاہور میں مقیم رہے۔ ایک مطالعاتی دورے پر سیلون بھی تشریف لے گئے۔ حج بیت اللہ اور زیارات کی سعادت بھی حاصل کی۔ ۱۹۷۰ء میں بحیثیت پرنسپل کو آپریٹو ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ریٹائر ہوئے۔ جس کے بعد مسلم آرٹس اینڈ سائنس کالج حیدرآباد میں پرنسپل مقرر کئے گئے مگر جب کالج قومی ملکیّت میں لے لئے گئے تو آپ نے علیحدگی اختیار کر کے وکالت شروع کر دی۔ ان دنوں زمینداری کی دیکھ بھال کے علاوہ اپنے والد کی لائبریری کی نگرانی کرتے ہیں جس سے طلباء استفادہ کرتے ہیں۔

شعر و ادب سے دلچسپی کالج کے زمانہ سے قائم ہوئی۔ جس کو ان کے عمیق مطالعہ نے مزید نکھارا۔ شاعری کی جملہ اصناف پر قدرت رکھتے ہیں۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے کچھ مختصر کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

دیوانِ قاسم کا مقدمہ لکھا اور ادبی بورڈ سے انعام بھی حاصل کیا۔ آپ کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں "گلشنِ بہار" سرِ فہرست ہے۔ ماہنامہ "قلیچ" کے ۱۹۵۲ سے ۱۹۵۸ء تک ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔

مرزا اسد بیگ

صورت سے ہو عیاں تو کہیں کیا زباں سے ہم
تو نے خبر نہ لی تو گئے دو جہاں سے ہم

داغِ جگر سے یا کہ گریباں کے چاک سے
تم ہی بتاؤ داستاں چھیڑیں کہاں سے ہم

دردِ فراق پر یہ ستارے گواہ ہیں
رویا کئے لپٹ کے دلِ ناتواں سے ہم

بیتابیٔ فراق میں اٹھنے تو دو دھواں
اک آسماں بنائیں گے آہ و فغاں سے ہم

آنسو امڈ کے شب کو جو پلکوں پہ چھا گئے
کرتے رہے اجالا اسی کہکشاں سے ہم

ہوں گردِ راہ آج ستاروں کی منزلیں
بڑھ کر جو کام لیں کبھی عزمِ جواں سے ہم

کہنے کی بات ہے کہ ستاروں سے بڑھ گئے
لیکن ابھی وہیں ہیں چلے تھے جہاں سے ہم

کیسی کشش ہے کوچۂ جاناں کی خاک میں
اڑتے چلے بہار کو دورِ خزاں سے ہم

ہم نے بھی دیکھ دیکھ کے مرکز بنا لیا
جوڑا جو تیر، کیسے ہٹیں اب نشاں سے ہم

قوم و ادب کی خدمتیں کیں جس نے سندھ میں
رکھتے اسدؔ ہیں واسطہ اس خانداں سے ہم

پچھلے چند سالوں سے اُردو غزل میں کئی لسانی تجربے کئے گئے جن میں ایک اہم تجربہ یہ بھی ہے کہ شعراء نے اپنے اظہار کے لئے نئے الفاظ، نئے استعارے، نئی تشبیہیں اور نئی علامتیں تشکیل کیں۔ اور یہ علامات و الفاظ ایسے تھے کہ اب تک اُردو غزل نے انہیں اس طور سے برتا ہی نہ تھا۔ پچھلے چند برسوں کی غزل کا جائزہ لینے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شعراء نے خیال کے ساتھ ساتھ زبان کی طرف بھی خاص توجہ کی ہے اور نئے الفاظ اپنائے ہیں۔

(قرۃ العین طاہرہ)



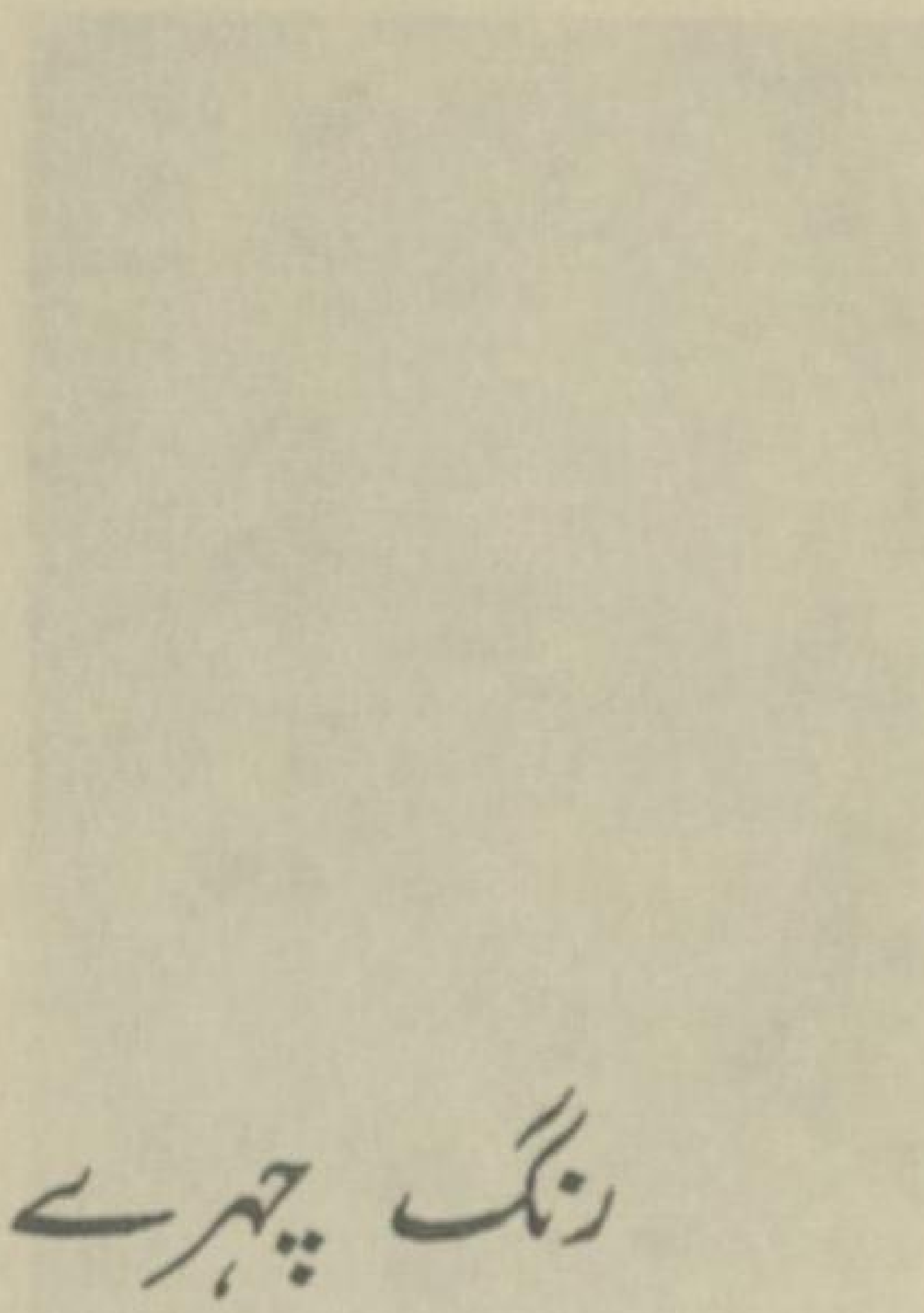
مسعود انور شفقی

آبا و اجداد سولہویں صدی کے اوائل میں مشرقی ایران سے افغانستان کے شہر جلال آباد کے قریب بے سُود نامی قصبے میں آباد ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب درّانیوں سے ملتا ہے۔ شفقی کی پیدائش ۱۹۳۰ء میں پشاور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اسلامی مدرسوں میں ہوئی۔ مڈل تک تعلیم ہندوستان کے شہر ڈیرہ دون میں حاصل کی جہاں آپ کے والد فوج کی ملازمت کے زمانے میں مقیم تھے۔ میٹرک پنجاب یونیورسٹی اور پھر اس کے بعد بی، اے اور ایم۔ اے کے امتحانات پشاور یونیورسٹی سے پاس کئے۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں جب پشاور سے روزنامہ "شہباز" کا اجراء ہوا تو شفقی ایک زیر تربیت کارکن کی حیثیت سے نہایت معمولی مشاہرہ پر اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ اس وقت اخبار کے اعلیٰ مدیر اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی تھے۔ اُن سے آپ نے نہ صرف میدان صحافت میں تربیت لی بلکہ فنِ شعر میں بھی اکتساب کیا۔ کچھ عرصہ بعد اخبار کی ملازمت ترک کر کے ایک ذاتی اشاعتی ادارہ قائم کر لیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ سرکاری ملازمت بھی کی۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۸ء تک روزنامہ "انجام" کے ایڈیٹر رہے۔ جب "انجام" کی اشاعت کراچی اور پشاور سے بند ہو گئی تو شفقی روزنامہ "مشرق" کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

شعر گوئی کا شوق ۱۹۴۷ء سے شروع ہوا۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ صحافتی شاعری بھی کی ہے جس میں بیشتر طنزیہ و مزاحیہ قطعات شامل ہیں۔ یہ مجموعہ "رات اور اُلّو" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لئے فیچر اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

مسعود انور شفقی



رنگ چہرے پہ حیا کا جو نکھرتا ہوگا
بھولنے والا مجھے یاد تو کرتا ہوگا

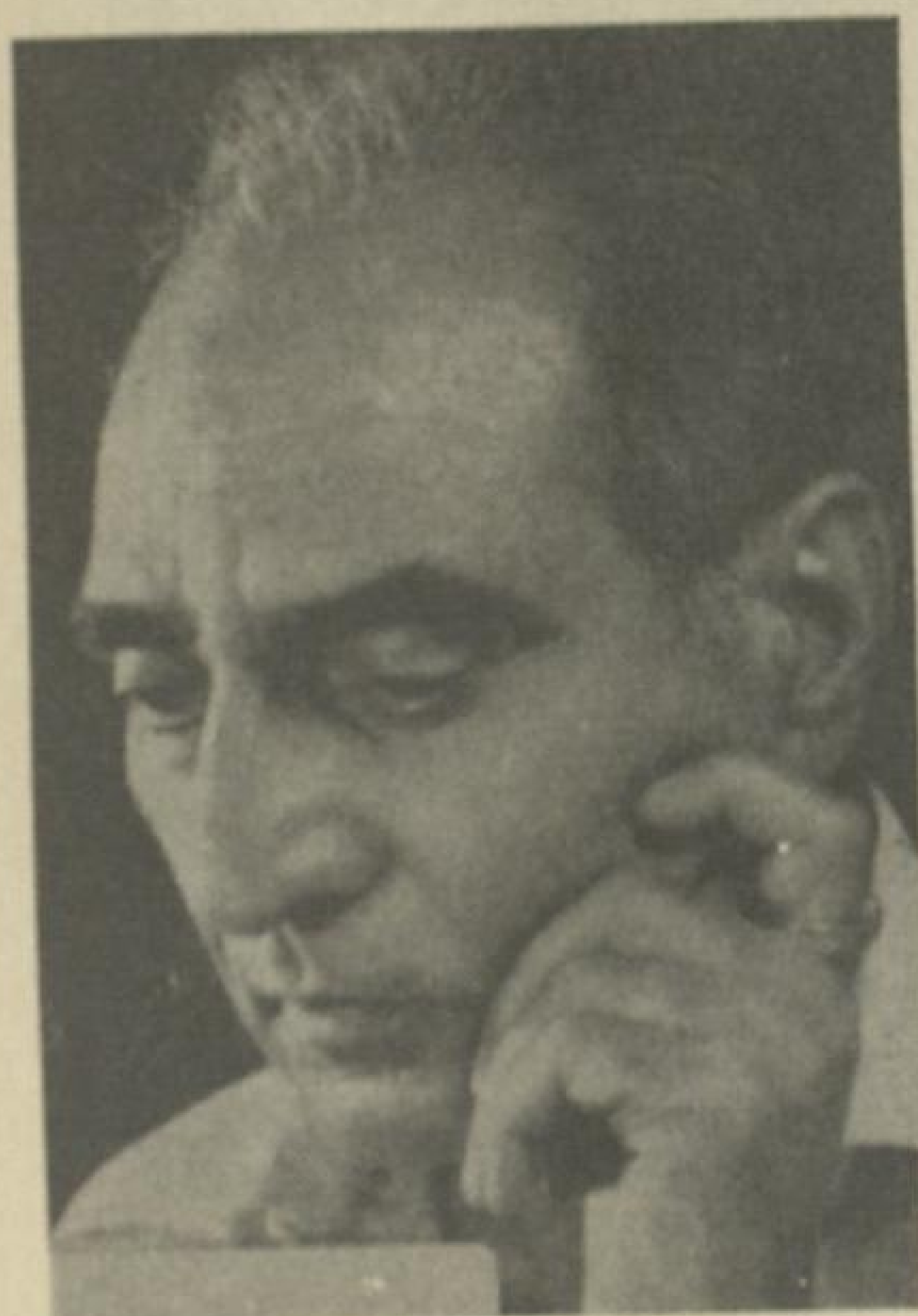
زلف اب بھی تیرے ماتھے پہ مچلتی ہوگی
تجھ سے بالوں کا وہ جھرمٹ نہ سنورتا ہوگا

اب بھی برسات کی بھیگی ہوئی ہر شام کیساتھ
جانے تو کتنے ہی رنگوں میں بکھرتا ہوگا

تُو نے سوچا ہے کبھی جھانک کے دل میں اپنے
کوئی دیوانہ اِدھر سے بھی گزرتا ہوگا

سوچتا ہوں تیرے ہونٹوں کے اُفق پر بھی کبھی
کیا میرے نام کا سورج بھی ابھرتا ہوگا

میں جو زندہ ہوں تو یہ بات بھی سچی ہوگی
ہجر کے زہر سے انسان نہ مرتا ہوگا



مسعود قریشی

مسعود قریشی جالندھر شہر میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام گل محمد تھا جو شاعر تھے اور سفیر تخلص کرتے تھے۔ کالج کے زمانے ہی سے شعر کہنے اور تنقیدی مضامین لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ اس دور کی تخلیقات "ادبِ لطیف"۔ "ادبی دنیا"۔ اور "ہمایوں" میں شائع ہوتی رہیں۔

پاکستان بننے کے بعد آپ پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور ان دنوں ریڈیو پاکستان اسلام آباد کے کنٹرولر ہیں۔

کوئی بارہ برس کی خاموشی کے بعد ۱۹۷۴ء میں کوچۂ شعر کو لوٹے۔ پہلا شعری مجموعہ "آشوبِ آگہی" ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ دوسرا شعری مجموعہ "حرفِ حجاب" کے عنوان سے مرتب ہو چکا ہے مگر ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ "عکسِ باہو" (ابیاتِ سلطان باہو کا منظوم ترجمہ) اور "قلوپطرہ کی ایک رات اور دوسرے ڈرامے" دونوں کتب طباعت کے مراحل میں ہیں اور جلد ہی منظرِ عام پر آجائیں گی۔

مسعود قریشی

کون مصلوب ہوا، حسن کا کردار کہ ہم
شہرِ عشق میں بدنام ہوا یار کہ ہم

دن کو تھا کوچۂ دلدار میں سایوں کا ہجوم
رات آئی تو گئے سایۂ دیوار کہ ہم

عشق کے ربط سے ہے حسن کا پیکر تاباں
کٹ کے اب آپ ہوئے نقش بہ دیوار کہ ہم

ہم نہ کہتے تھے کہ رہنے دو مروّت کا حجاب
اب ملاقات سے کترانے لگے یار کہ ہم

ظلمتِ شب کا عدو کون ہے سورج کہ کرن
جرمِ تنویر میں مصلوب ہوں اشعار کہ ہم

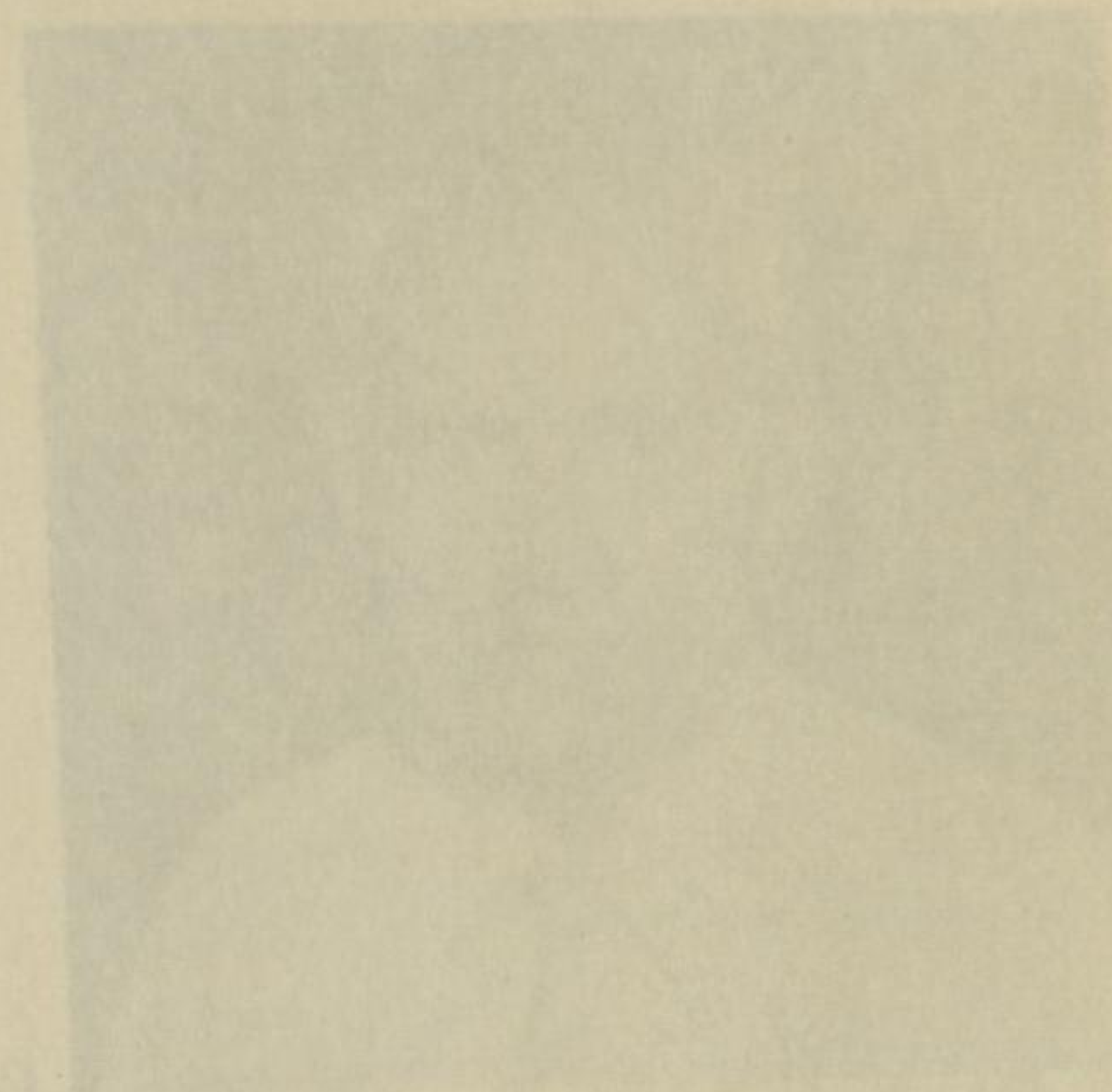
شورِ تحسین سے ہیں خلق کے چہرے روشن
سرخرو بازوئے قاتل ہے، کہ تلوار، کہ ہم

کس کو خاموش محبت پہ بھروسا نہ رہا
وہ ہیں لفظوں میں محبت کے طلب گار کہ ہم



مشفق خواجہ

۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں کراچی آ گئے۔ کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۵۷ء میں بی اے (آنرز) اور ۱۹۵۸ء میں ایم اے کیا۔ طالب علمی کے زمانہ میں انجمن ترقی اردو سے منسلک ہو گئے۔ اُن دنوں تمام علمی و ادبی کاموں کی نگرانی آپ کے سپرد تھی۔ مجلّہ سہ ماہی "اردو" اور "قومی زبان" کی سترہ برس تک ادارت کی۔ ۱۹۷۳ء کے آخر میں انجمن سے الگ ہو گئے۔ اب اردو مخطوطات سے متعلق ایک تحقیقی منصوبے پر کام کر رہے ہیں جس کی پہلی جلد جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، مرکزی اردو بورڈ لاہور کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ "تذکرہ خوش معرکۂ زیبا" بھی دو جلدوں میں مرتب کیا جو مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔



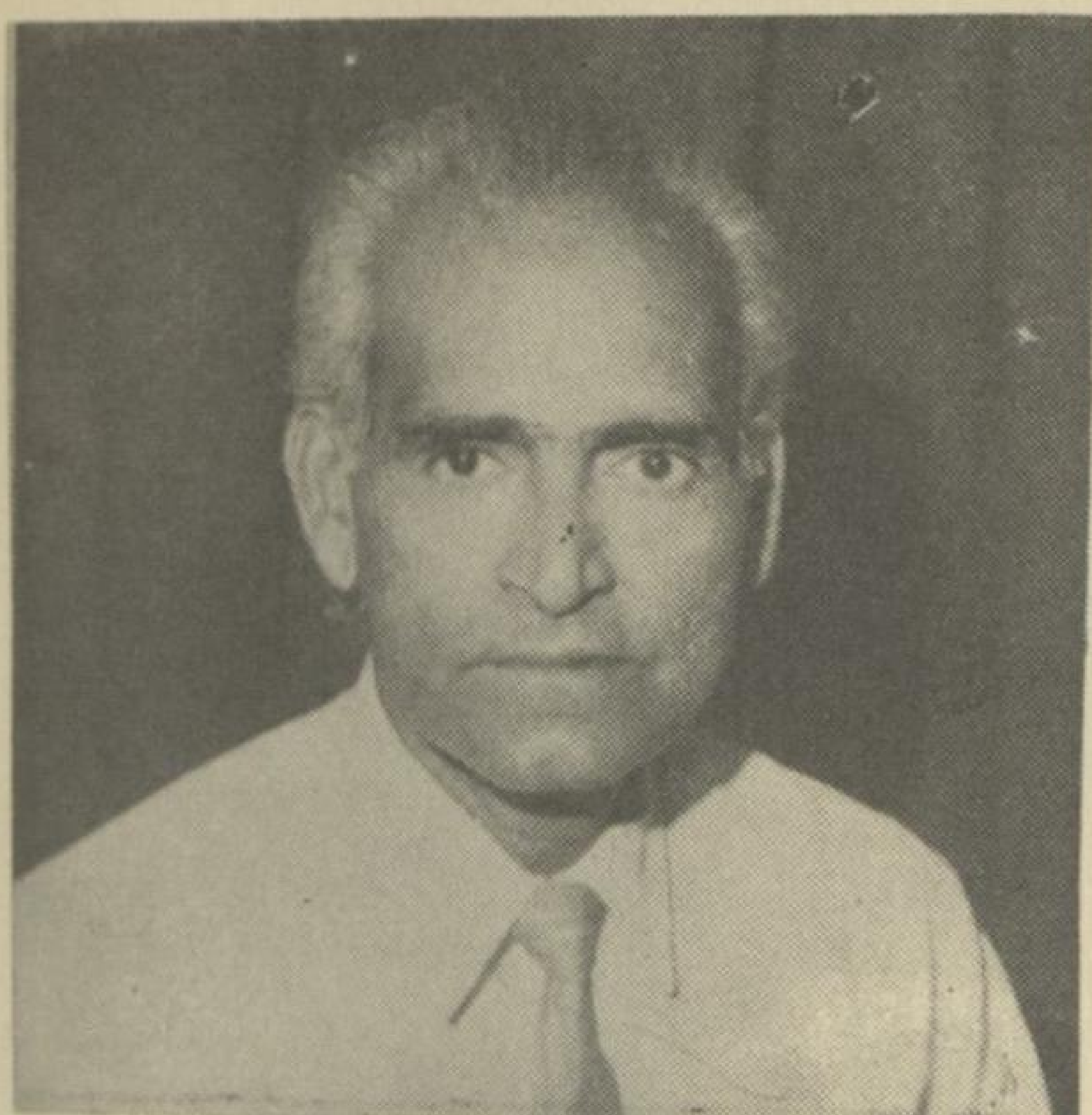
مشفق خواجہ

یہی نہیں کہ وہ بے تاب و بے قرار گیا
مری رگوں میں بھی اک زہر سا اتار گیا

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو
اسے بھی دیکھو، جو اک عمر یاں گزار گیا

وفا کے باب میں اُس سے تو کچھ کمی نہ ہوئی
میں آپ اپنی خوشی سے یہ بازی ہار گیا

ہوائے سرد کا جھونکا بھی کتنا ظالم تھا
خیال و خواب کے سب پیرہن اتار گیا



مضطر اکبر آبادی

سید ابو حامد نام، مضطرؔ تخلص۔ آپ ۱۹۲۲ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اعتماد پور میں حاصل کی پھر آگرہ آ گئے اور یہاں تعلیم کی تکمیل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر معلمی کا پیشہ اختیار کیا جس کو جلد ہی ترک کر دیا۔ ۱۹۴۳ء میں لاہور آ گئے اور یہاں مختلف ادبی اداروں اور رسائل سے وابستہ رہے۔

لاہور میں آپ کا قیام ۱۹۴۶ء تک رہا۔ قیام پاکستان سے کچھ قبل مضطرؔ وطن واپس چلے گئے۔ مگر ۱۹۴۷ء میں راولپنڈی آ گئے اور یہاں پہلے پہل کتابوں کا کاروبار کیا۔ ۱۹۵۳ء سے ریڈیو پاکستان سے منسلک ہیں اور آپ کے فرائض منصبی میں بچوں کے پروگرام کی ترتیب اور پیش کش شامل ہے۔

مضطرؔ ۱۹۳۸ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ غزل کے شاعر ہیں اگرچہ کبھی کبھی نظم بھی کہہ لیتے ہیں۔ شاعری کے ابتدائی مراحل ـــ جناب مصطفےٰ اکبر آبادی کی رہنمائی میں طے کیے۔

مجموعۂ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

مضطر اکبر آبادی

دیکھا جو آنسوؤں کو تبسّم میں ڈھال کے
کچھ اور زخم ہو گئے گہرے ملال کے

سیلابِ درد تھم گیا دل کو جھنجوڑ کر
موجیں بکھر گئی ہیں سفینہ اُچھال کے

پھر بھی ہے ان کہی سی بدستور دل کی بات
رُخ آزما لئے ہیں سبھی عرضِ حال کے

سب غرق اُس کی جھیل سی آنکھوں میں ہو گئے
جتنے بھی حوصلے تھے جواب و سوال کے

جو منظرِ حیات ہے اب گرد گرد ہے
دھندلا گئے ہیں آئنے خواب و خیال کے

واقف ہوں منزلوں سے نشیب و فراز کی
گزرا ہوں مرحلوں سے عروج و زوال کے

دنیا کے تلخ و ترش سے ہوں خوب آشنا
چکھے ہیں گرم و سرد بہت ماہ و سال کے

دل میں ہیں شرق و غرب کی نادیدہ وسعتیں
آنکھوں میں فاصلے ہیں جنوب و شمال کے

مضطر جنہیں شمار میں لانا محال ہے
دیکھے ہیں اتنے دور فراق و وصال کے



مظفر وارثی

محمد مظفر الدین احمد نام، تخلص مظفر وارثی۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۳۳ء بمقام میرٹھ (بھارت) پیدا ہوئے۔ آپکے والد فصیح الہند علامہ صوفی وارثی اپنے عہد کے بلند پایہ شاعر تھے شاعری کے ابتدائی مراحل ان ہی کی رہنمائی میں طے کئے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں میرٹھ سے پاکستان تک کا سفر، حصولِ تعلیم اور اسٹیٹ بنک کی ملازمت تک کے مراحل اپنے اندر بقول شاعر قیامتیں سمیٹے ہوئے ہیں۔ مظفر وارثی نے ۱۹۴۹ء میں پہلا شعر کہا۔

اپنی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

"شعر کے معاملے میں اپنے اسلوب کا سختی سے قائل ہوں۔ اگلے ہوئے لقمے چباتے کا قائل نہیں۔ فن کسے کہتے ہیں بالکل نہیں جانتا، البتہ اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے دکھ، چیخیں، تاریکیاں، قہقہے، کاسۂ احساس میں سمیٹ لیتا ہوں اور پھر ایک مہا سخی کی طرح ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ خوش نصیب اتنا کہ قاری کا بے پناہ پیار ملا اور بدنصیب ایسا کہ پھر بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں"۔

شاعری کے مجموعے "برف کی ناؤ" اور "بابِ حرم" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعۂ کلام "سبز دریچے سرخ ہوا" زیرِ اشاعت ہے۔

مظفر وارثی

مہک ملی ہے، حرارت شکار کرنے سے
گلاب بن گیا شعلہ بھی، پیار کرنے سے

پہن کے رنگ ہزاروں، دکھائے رنگ اپنا
لگے وہ اور بھی سادہ، سنگھار کرنے سے

صدائیں ٹوٹ رہی ہیں فضا سے ٹکرا کر
سکوت اور بھی پھیلے، پکار کرنے سے

شبِ فراق کو آبِ حیات پلوا دو
طلب کی عمر بڑھے، انتظار کرنے سے

خود اپنے خون سے ڈھانپی برہنگی اپنی
قبا ملی ہے، بدن تار تار کرنے سے

مرے دکھوں نے مجھے قہقہوں میں دفنایا
مرا ہوں، زندہ دلی اختیار کرنے سے

جو حلق تر کرے وہ ایک بوند ہے کافی
بجھے نہ پیاس، سمندر کو پار کرنے سے

مظفر اپنی اڑانیں بھی ساتھ چھوڑ نہ دیں
ہوا کے بازوؤں پر انحصار کرنے سے



مظہر اختر

نام محمد مظہر اور اختر تخلص۔ آپ ۱۵ جنوری ۱۹۴۰ء کو بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد مظہر اختر جھنگ آگئے اور یہیں آپ نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی جس کے بعد آپ محکمۂ امداد باہمی میں سب انسپکٹر ہو گئے۔ ان دنوں جھنگ ہی میں مستقل قیام ہے۔

ابتداء میں ساحر صدیقی سے مشورۂ سخن کیا۔ آپ کی شاعری کے دو مجموعے — "سنگِ ملامت" اور "سایۂ لب" عنقریب شائع ہونے والے ہیں۔

مظہر اختر

نیا افق نئی تہذیب کے خزانے ملے
نئی رتیں نیا سورج نئے زمانے ملے

تھلوں میں ریشمی زلفوں کے شامیانے ملے
جنوں طراز محبت بھرے ٹھکانے ملے

وہ نیلی آنکھ کہ جھیلوں پہ آہوانِ ختن
شراب خانے کے اندر شراب خانے ملے

وہ چہرہ صبحِ بنارس وہ زلفِ شامِ اودھ
بس اک مقام پہ ٹھہرے ہوئے زمانے ملے

فصیلِ دل پہ وہ آنکھیں ستارہ بار ملیں
ملاپ میں بھی جدائی کے شاخسانے ملے

بڑھی ہے بھوک اور مہنگائی اتنی تیزی سے
کہ جتنے شہروں میں کثرت سے کارخانے ملے

گھروندے ریت کے اور وہ بھی زد پہ طوفاں کی
ہمیں تو جتنے بھی اختر بڑے گھرانے ملے



منظر ایوبی

منظر ایوبی کا خاندانی نام عزیز احمد ایوبی ہے، آپ جنوری ۱۹۳۲ء میں بمقام بدایوں (بھارت) پیدا ہوئے۔ منظر ایوبی نے اپنی تعلیم کی تکمیل پاکستان آکر کی۔ چنانچہ پہلے بی۔کام اور پھر ایم اے کے امتحانات کراچی سے پاس کئے۔ اس کے بعد آپ تدریس کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ ان دنوں گورنمنٹ ڈگری سائنس کالج کراچی سے وابستہ ہیں۔

آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں :-

"بیسویں صدی کی اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش"۔ (تحقیقی مقالہ)

"اردو شاعری میں انقلابی شعور" (زیر ترتیب)

"الاؤ" (نظموں کا مجموعہ، زیر طبع)

ان کے علاوہ آپ غزلوں کا ایک مجموعہ اور ریڈیائی فیچر اور ڈرامے بھی کتابی صورت میں ترتیب دے رہے ہیں۔

منظر ایوبی

وصال و ہجر کے قصّے نہ یوں سُناؤ ہمیں
اب اس عذابِ شب و روز سے بچاؤ ہمیں

کسی بھی گھر میں سہی روشنی تو ہے ہم سے
نمودِ صبح سے پہلے تو مت بجھاؤ ہمیں

نہیں ہے خونِ شہیداں کی کوئی قدر یہاں
لگا کے داؤ پہ ہم کو، نہ یوں گنواؤ ہمیں

تمام عمر کا سودا ہے ایک پل کا نہیں
بہت ہی سوچ سمجھ کر گلے لگاؤ ہمیں

گزر چکے ہیں مقامِ جنوں سے دیوانے
یہ جان لینا، اگر کل یہاں نہ پاؤ ہمیں

ہمارے خوں سے نکھر جائے غم، تو کیا کہنا
بڑھاؤ دستِ ستم، دار پر چڑھاؤ ہمیں

کرشمہ سازئ فکر و نظر سے کیا حاصل
بنے ہو خضر، تو پھر راستہ دکھاؤ ہمیں

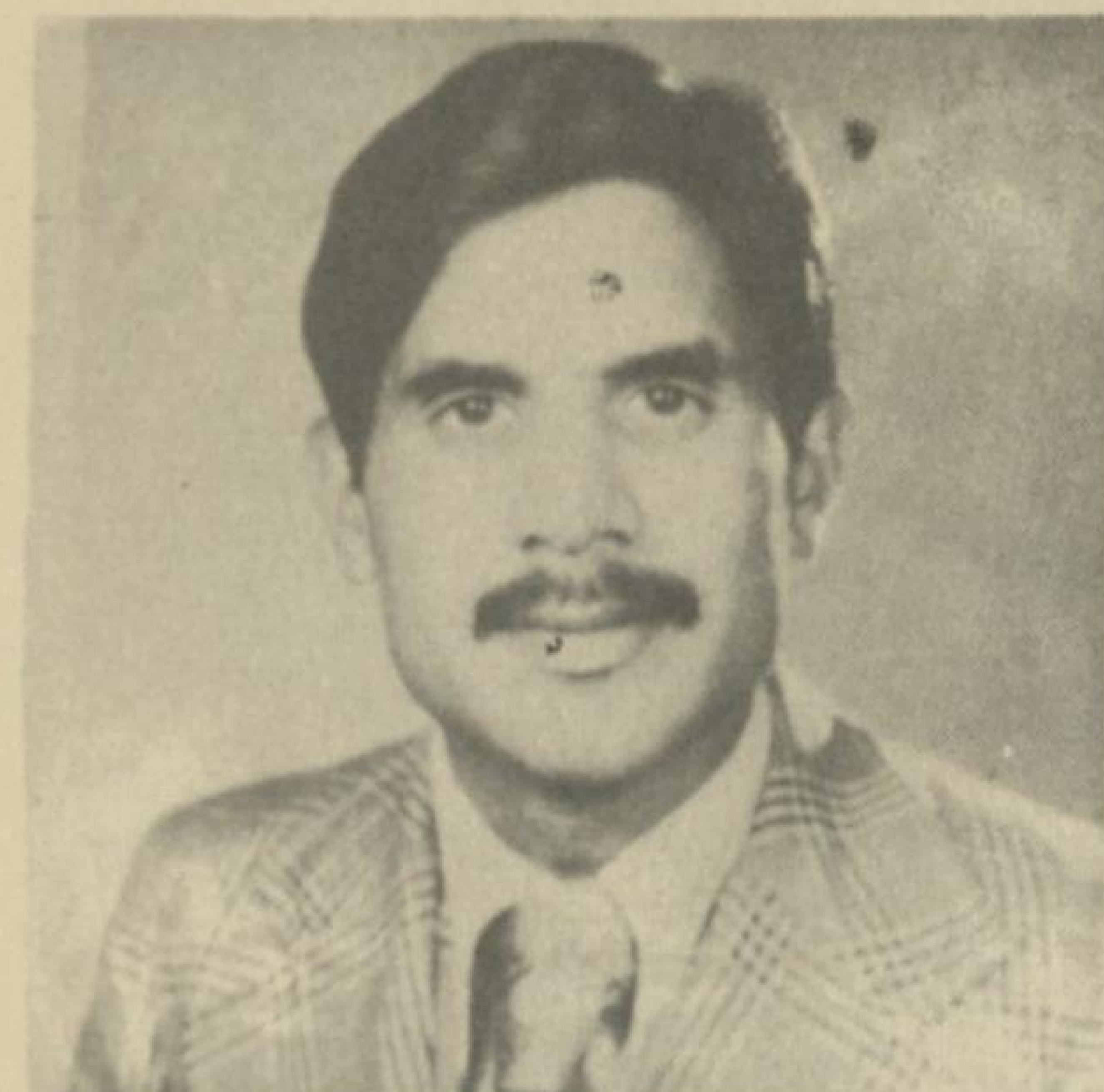
یہ لمحہ بھر کا تصوّر تو جان لیوا ہے
جو یاد آؤ تو تا عمر یاد آؤ ہمیں

کتابِ عشق ہیں، لیکن نہ اتنی فرسودہ
کہ بے پڑھے ہی فقط میز پر سجاؤ ہمیں

اُجڑ نہ جائے عروسِ سخن کی مانگ کہیں
خیال و فن کی نئی جنگ سے بچاؤ ہمیں

شاعر اپنی تسخیر کی کوششوں میں کرب برداشت کرتا ہے تو اس عمل کے دوران میں وہ کسے آواز دیتا ہے ۔ وہ کس کے آنے کی خبر دیتا ہے اور جب وہ کہتا ہے کہ "تو نہیں ہے" تو اس اشارے سے مراد کون ہے ۔ کوئی بھی صورت حال اس اشارے کے بغیر فتح نہیں ہو سکتی ۔ یہ اشارہ اپنی مختلف صورتوں میں ہمیشہ پوشیدہ رہتا ہے جیسے سورج کے پہلو میں دن اور عورت کے پہلو میں محبوب ۔

(جیلانی کامران)

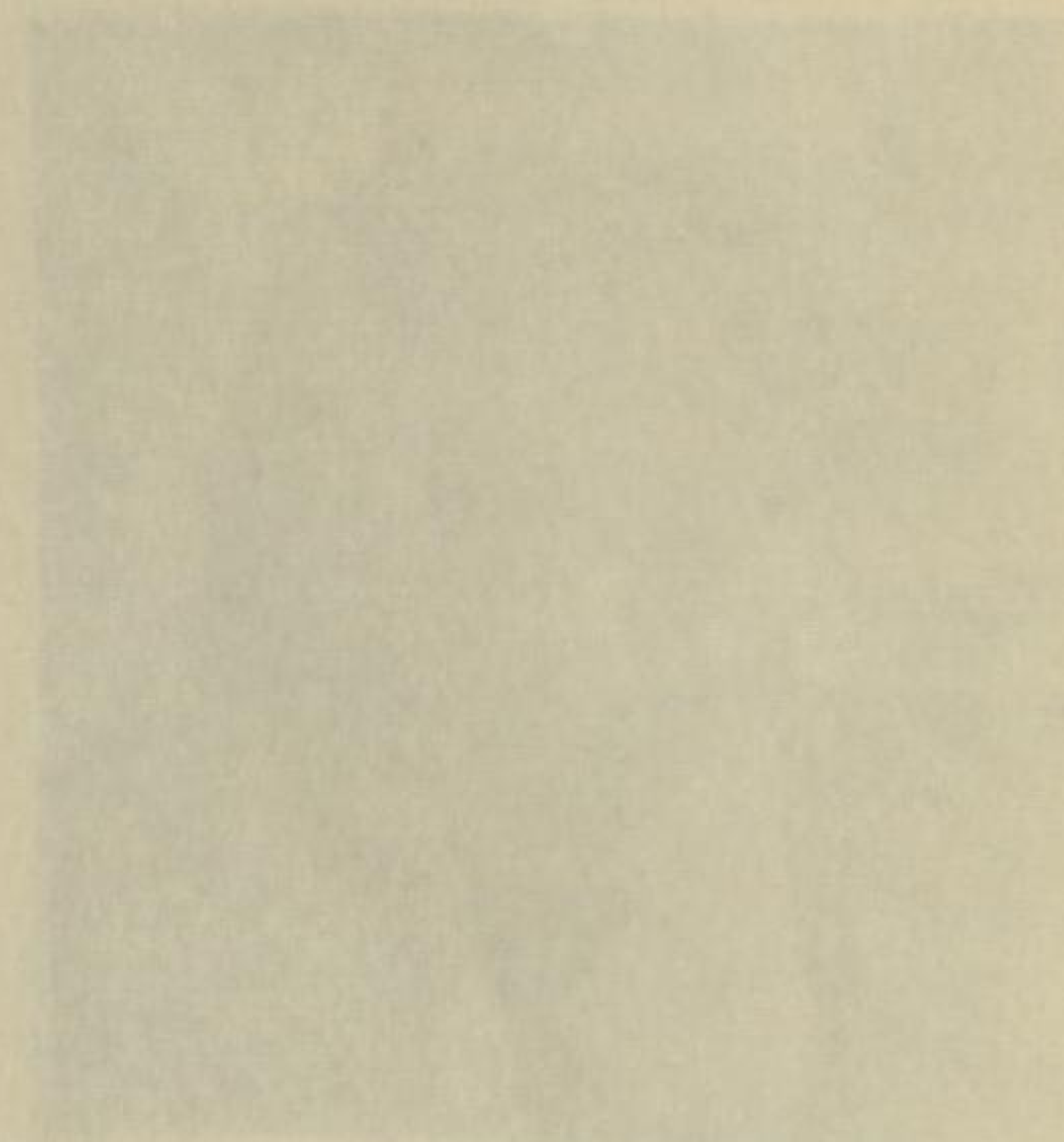


منوّر عزیز

منور عزیز کا آبائی گھر نارو وال (ضلع سیالکوٹ) میں ہے جہاں اُن کی پیدائش ۲ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ہوئی۔ والد کا نام عزیز عمرالدین ہے اور وہ پادری ہیں۔

منور نے ابتدائی تعلیم تلونڈی بھنڈاراں میں حاصل کی پھر سی۔ ٹی۔ آئی سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔ منور عزیز ان دنوں نیو اپوسٹالک چرچ آرگنائزیشن میں ڈسٹرکٹ ریکٹر (DISTRICT RECTOR) ہیں۔

منور ۱۹۷۱ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔



منوّر عزیز

آئنہ بھی آئنہ گر سے اُلجھتا رہ گیا
میں ہی اس بہروپ گھر میں ایک جھوٹا رہ گیا

آنکھ کھُلتے ہی اُمڈ آئی ہے کتنی تیرگی
دیکھتے ہی دیکھتے سورج ستارہ رہ گیا

سرپھری آندھی نے آخر کر دیا قصّہ تمام
میں چراغوں کی لووں پر ہاتھ رکھتا رہ گیا

نقش دھندلائے تو چہرے کی شناسائی گئی
آنکھ پتلی میں لرزتا اک ہیولا رہ گیا

موجِ صحرا سے ملے شاید نمو کا ذائقہ
جھلملاتا آبِ دریا ریگِ دریا رہ گیا

اب منوّر کون لائے گا خبر اُس پار کی
کس کو لہروں سے نمٹنے کا سلیقہ رہ گیا



منیر نیازی

اصل نام محمد منیر نیازی ، ۹۔ اپریل ۱۹۲۳ء کو ہوشیار پور میں پیدا ہوئے ۔ جدید شعراء میں آپ ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ آپ پنجابی کے بھی اعلیٰ درجہ کے شاعر ہیں، بلکہ آپ جدید پنجابی شاعری کے بانیوں میں ہیں ۔ اب تک آپ کے نو مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں تیز ہوا اور تنہا پھول ، جنگل میں دھنک، دشمنوں کے درمیان شام ، ماہِ منیر ، اس بے وفا کا شہر، چھ رنگین دروازے (اردو) اور سفر دی رات ، چار چپ چیزاں اور رستہ دسّن والے تارے (پنجابی) شامل ہیں۔
زیرِ طبع کتابوں میں "کتابِ منیر" (اردو مجموعۂ کلام) اور "قصّہ دو بھراواں دا" (پنجابی ڈرامے) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ آج کل منیر نیازی پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن سے منسلک ہیں۔

منیر نیازی

ردا اس چمن کی اڑا لے گئی
درختوں کے پتّے ہوا لے گئی

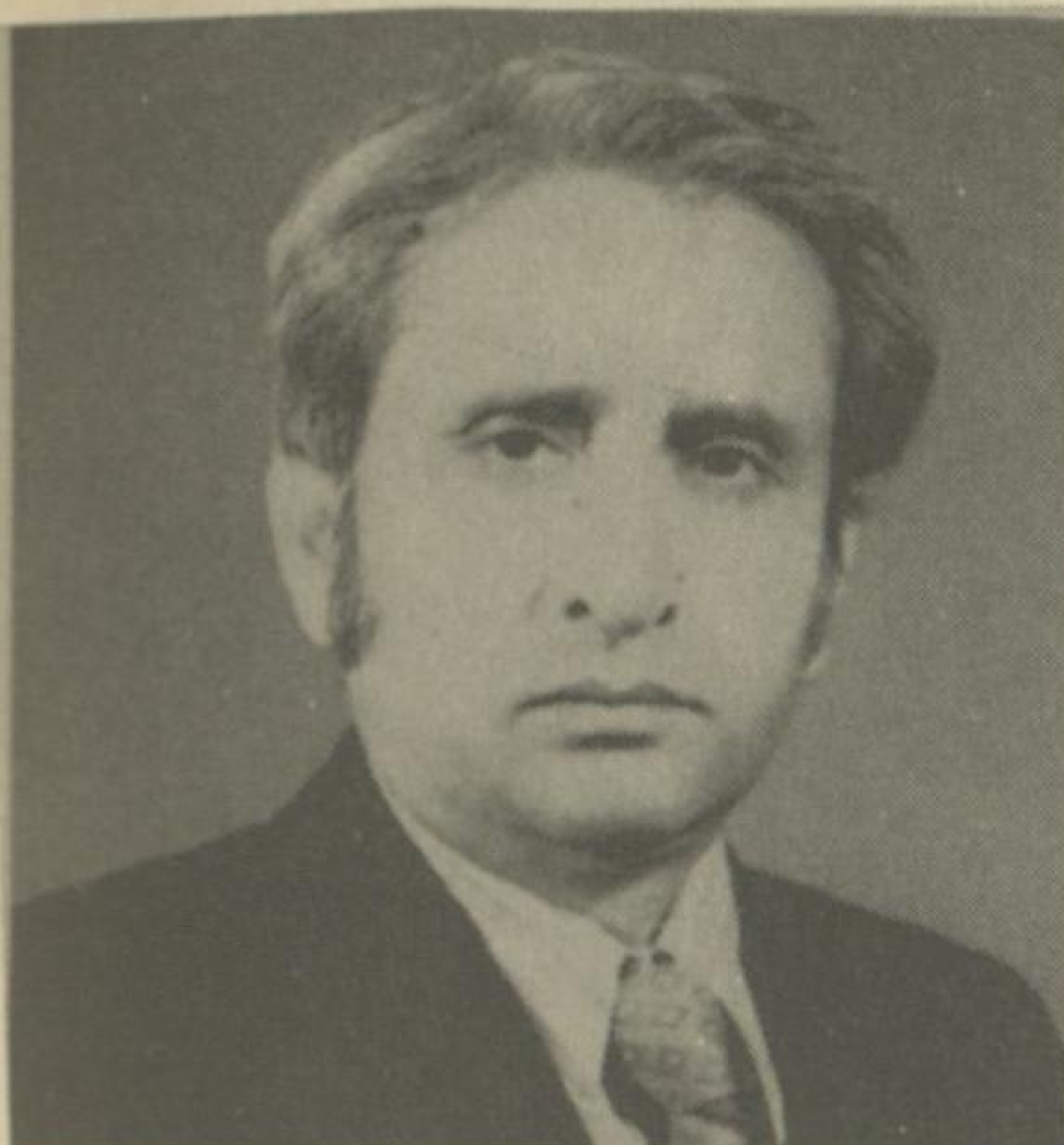
جو حرف اپنے دل کے ٹھکانوں میں تھے
بہت دور ان کو صدا لے گئی

چلا میں صعوبت سے پُر راہ پر
جہاں تک مجھے انتہا لے گئی

گئی جس گھڑی شامِ شہرِ وفا
مناظر سے اک رنگ سا لے گئی

نشاں اک پرانا کنارے پہ تھا
اسے موجِ دریا بہا لے گئی

منیؔر اتنا حسن اس زمانے میں تھا
کہاں اس کو کوئی بلا لے گئی



مہتاب ظفر

آزادی سے قبل آپ کا تعلق بدایوں سے تھا۔ بہ سلسلۂ تعلیم علی گڑھ گئے۔ اور وہاں سے بی۔اے کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں پاکستان آ گئے۔ یہاں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ والد حضرت جام نوائی بدایونی کے زیر تربیت اور بدایوں کے عام ادبی ماحول کے سبب زمانہ طالب علمی ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا جو ہنوز جاری ہے۔ ملازمت کے سلسلے میں بغداد اور پھر تقریباً دس سال تک انقرہ (ترکی) میں قیام رہا۔ ۱۹۶۹ء میں ترکی سے واپس آئے اور آج کل وزارت داخلہ میں بطور سیکشن افسر کام کر رہے ہیں۔

مجموعۂ کلام زیر ترتیب ہے۔

مہتاب ظفر

ہر جبیں پر گرد تھی ہر آنکھ میں ویرانہ تھا
شہر میں تھا تو مگر اتنا بھی سنّاٹا نہ تھا

زہر کا اک جام تھا یا دار کا افسانہ تھا
دل کا جو بھی فیصلہ تھا آبرومندانہ تھا

زخمِ سر تو ایک مدّت سے ہے تقدیرِ جنوں
آج جو آیا ہے وہ پتّھر کوئی پہلا نہ تھا

دوسروں کے خال و خد تھے جن کا موضوعِ سخن
ان کے ہاتھوں میں یقیناً کوئی آئینہ نہ تھا

آج اک بستی کو آنکھیں دیکھتی ہی رہ گئیں
لوگ چل پھر تو رہے تھے کوئی بھی زندہ نہ تھا

زخم تھے تو دل میں لیکن اس قدر گہرے نہ تھے
درد تھا سینے میں پہلے بھی مگر اتنا نہ تھا

اور گہرے کر گیا اندازِ پرسش دل کے زخم
کم سے کم پہلے ترا لہجہ تو ہمدردانہ تھا

زندگی مہتابؔ کیسے پیچ و خم میں کھو گئی
ہم جہاں پر تھے وہاں آگے کوئی رستہ نہ تھا



نازش حیدری دہلوی

محمد خورشید حسن نام ۔ نازش تخلص ۔ آپ چونکہ خیامُ الہند سید جلال الدین حیدؔر دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے اور ان کے جانشین ہیں، اس لئے تخلص کے ساتھ خود کو حیدری لکھتے ہیں۔

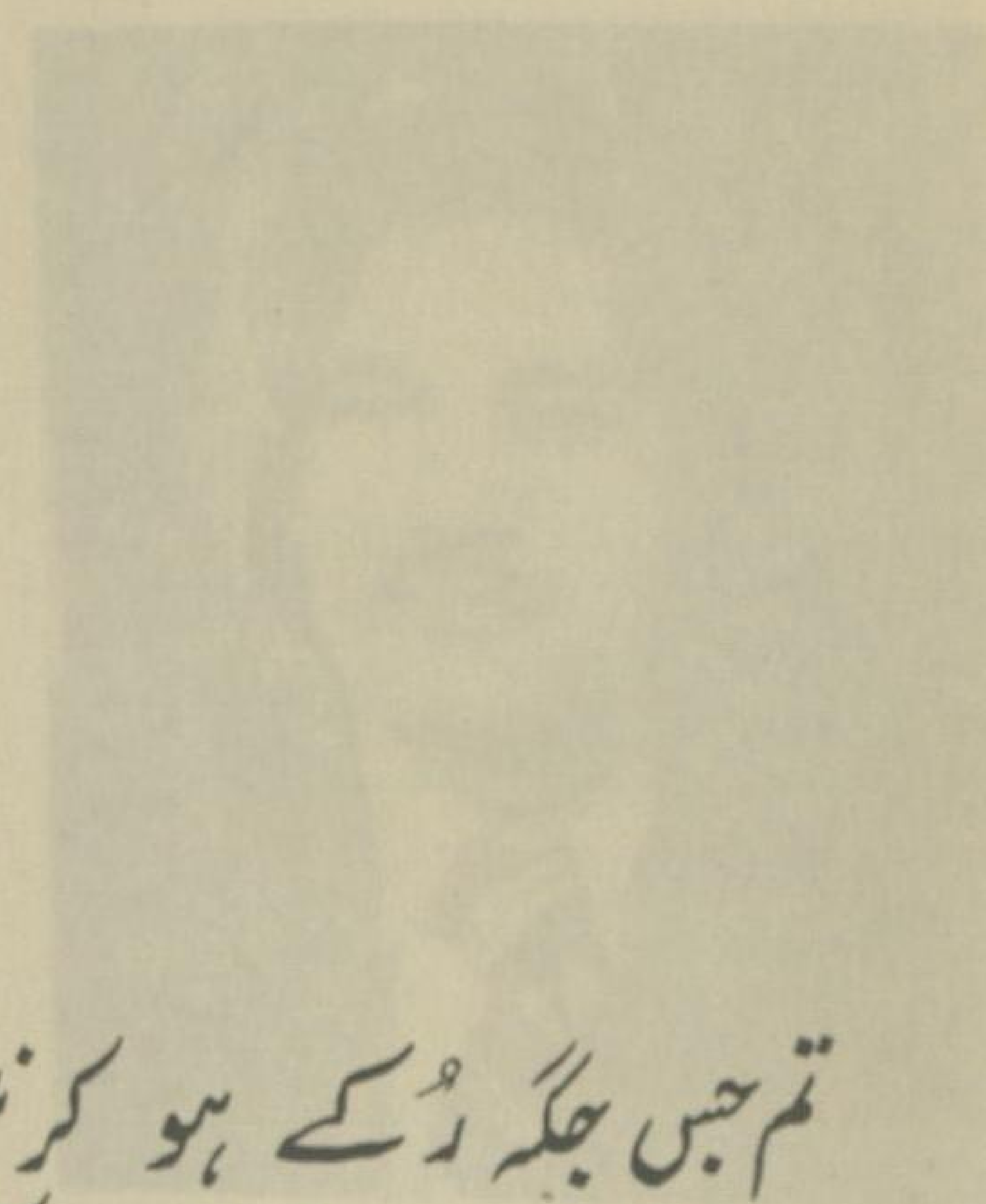
نازش حیدری یکم جنوری ۱۹۱۴ء کو دہلی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔

آپ نے مختلف محکموں میں ملازمت کی اور بہ سلسلۂ ملازمت کچھ مدت برصغیر سے باہر ایران، عراق اور فلسطین میں بھی گذاری۔

حضرت بیخوؔد دہلوی، پنڈت امرناتھ ساحؔر اور حیدؔر دہلوی جیسے معروفِ زمانہ شعراء سے آپ نے فیضِ سخن حاصل کیا ہے۔

۱۹۴۱ء میں آپ نے سی پی برار کے لئے اردو کا پرائمری نصاب لکھا جو چوبیس برس تک وہاں پڑھایا جاتا رہا۔ علم العروض پر بھی دو مختصر رسالے "تعلیم شاعری" اور "رہنمائے شاعری" کے نام سے سپردِ قلم کئے۔ متعدد انگریزی ناولوں کے تراجم کے علاوہ یونیورسٹی اور کالج کے لئے بھی کئی کتابیں لکھیں۔

آپ کا مجموعۂ کلام "صدیوں کا سفر" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔



نازش حیدری دہلوی

تم جس جگہ رُکے ہو کرنیں بکھر گئی ہیں
راتوں سے دُور ہو کر صُبحیں ٹھہر گئی ہیں

تیرے جمال سے ہے یہ حال بے خودی میں
ہم آگے بڑھ گئے ہیں نظریں ٹھہر گئی ہیں

نظروں میں تیرتی ہیں پرچھائیاں جہاں کی
آنکھوں میں عمر بھر کی نیندیں ٹھہر گئی ہیں

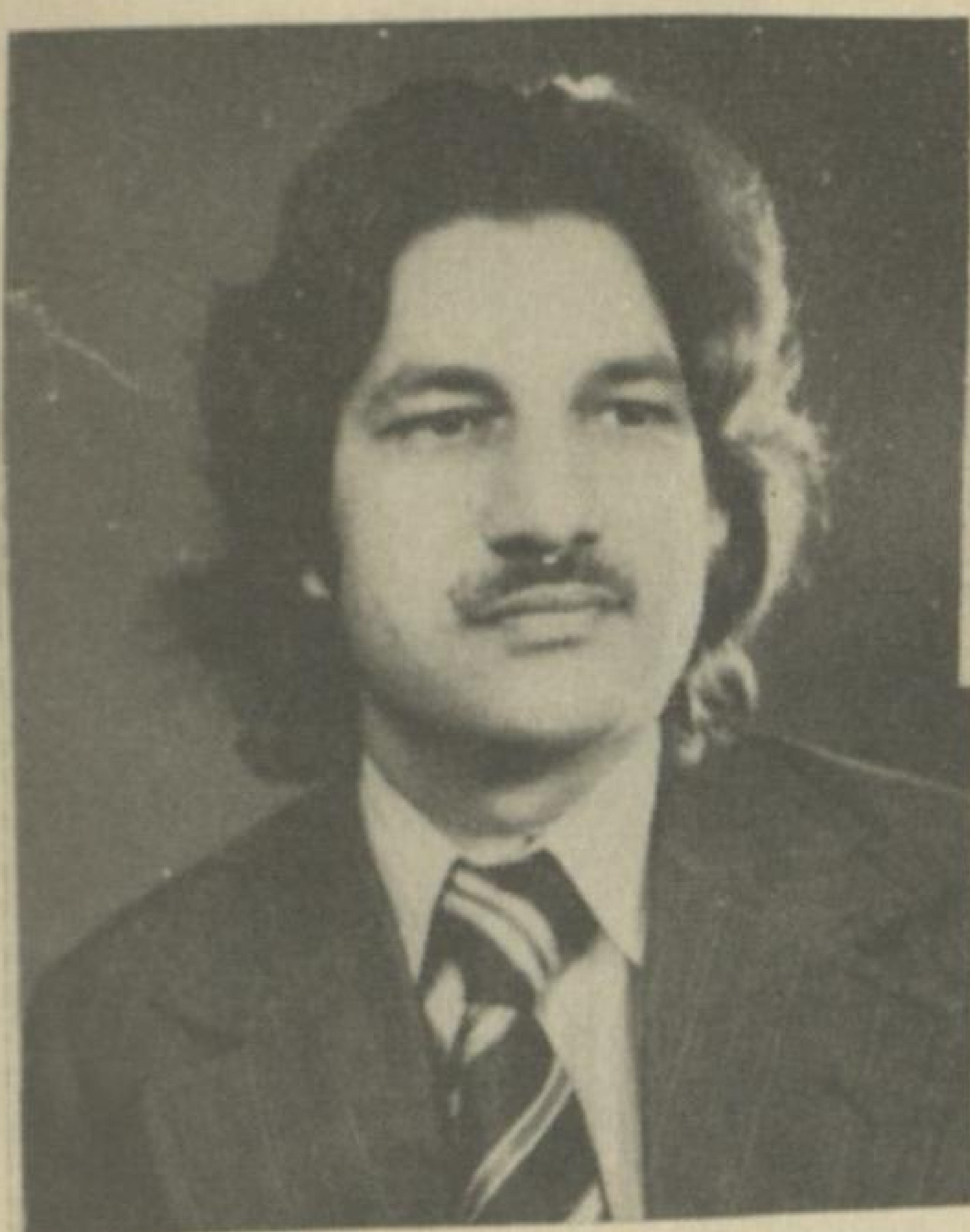
گزرا وہ زندگی سے کس پیار میں تڑپ کر
جس کے گلے میں غم کی باہیں ٹھہر گئی ہیں

شکوہ تھا ہم کو تم سے بے اعتنائیوں کا
لیکن وہ اس جہاں کی رسمیں ٹھہر گئی ہیں

اربابِ حُسن کی یہ اللہ رے لطافت
اجسام سے نکل کر رُوحیں ٹھہر گئی ہیں

محسوس ہو رہا ہے طوفان میں پہنچ کر
ہے رقص میں کنارہ لہریں ٹھہر گئی ہیں

نازشؔ ہیں نقش دل پر رعنائیاں کسی کی
کاغذ پہ جیسے آکر غزلیں ٹھہر گئی ہیں



ناصر زیدی

پورا نام سید ناصر رضا زیدی ہے۔ اپریل کی آٹھویں تاریخ کو ۱۹۴۳ء میں مظفر نگر (یو۔ پی) کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں پلے بڑھے، تعلیم پائی اور جوان ہوئے اسی شہر میں ان کا ذوقِ شعری پروان چڑھا۔ صحافت کا شوق بھی ہے۔ چنانچہ ہفت روزہ "حمایتِ اسلام" سے کالم نویسی کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے روزنامہ "امروز" میں "سامع بصری" کے قلمی نام سے کالم لکھتے رہے ہیں۔ پندرہ روزہ "آہنگ" کراچی میں گذشتہ پانچ برس سے لاہور کی ادبی ڈائری لکھ رہے ہیں۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے قدیم رکن ہیں اور ۱۹۷۰ء سے برابر کسی نہ کسی عہدہ سے وابستہ رہے ہیں۔ متعدد ادبی، نیم ادبی، مذہبی، عورتوں اور بچوں کے رسائل کی ادارت کے فرائض بھی سر انجام دیتے رہے ہیں۔ گذشتہ چودہ برس سے مشہور ادبی ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور کے مدیر ہیں۔

ناصر زیدی کے دو شعری مجموعے "ڈوبتے چاند کا منظر" اور "وصال" اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ لگ بھگ ڈیڑھ درجن مختلف کتب کے مصنّف، مولّف اور مرتب ہیں جن میں حضرت قائداعظم سے متعلق "وہ رہبر ہمارا، وہ قائد ہمارا" اور علامہ اقبال کے بارے میں "بیادِ شاعرِ مشرق" بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

ناصر زیدی

جو میری آخری خواہش کی ترجماں ٹھہری
وہ ایک غارتِ جاں ہی متاعِ جاں ٹھہری

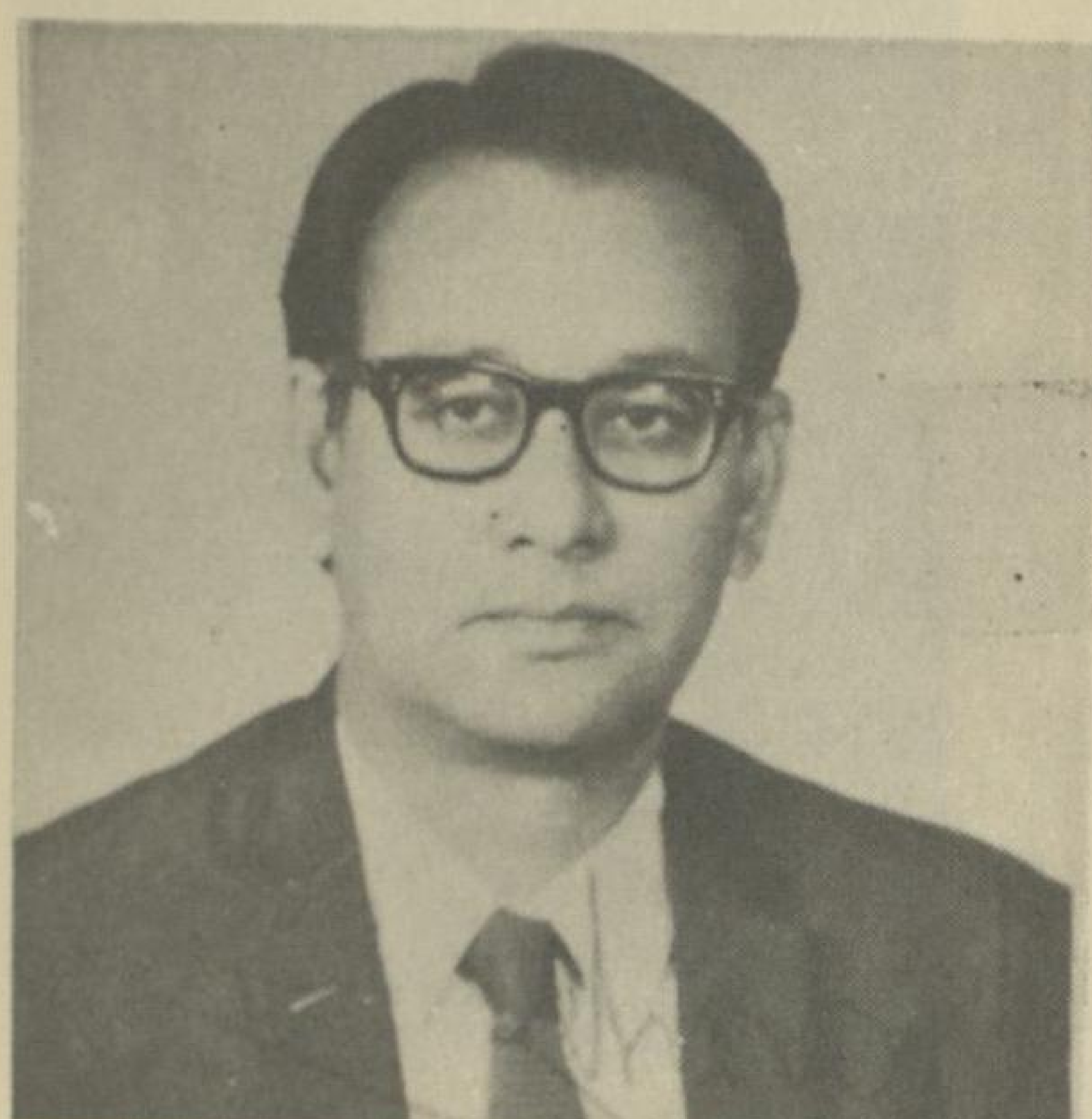
یہ غم نہیں کہ میرا آشیاں رہا نہ رہا
خوشی یہ ہے کہ یہیں برقِ بے اماں ٹھہری

وہ تیری چشمِ فسوں ساز تھی کہ موجِ کرم
وہیں وہیں پہ میں ڈوبا جہاں جہاں ٹھہری

کبھی تھے اس میں مری زندگی کے ہنگامے
وہ اک گلی جو گزرگاہِ دشمناں ٹھہری

وہی تھی زیست کا حاصل وہی تھی لطفِ حیات
وہ ایک ساعتِ رنگیں جو بیکراں ٹھہری

میں اس کو بھول بھی جاؤں تو کس طرح ناصؔر
جو شرطِ خاص مرے ان کے درمیاں ٹھہری



ناصر کاسگنجوی

۱۰؍اکتوبر ۱۹۲۸ء کو بمقام کاسگنج ضلع ایٹہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ نام ناصر محمود خاں اور تخلص ناصر ہے۔ والد کا نام احمد خاں صاحب تھا جو پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے۔ احمد خاں صاحب بھی شاعر تھے اور کیفی تخلص کرتے تھے۔ کیفی کے فانی بدایونی اور جگر مراد آبادی سے قریبی دوستانہ مراسم تھے۔ یہ شعراء اکثر کاسگنج آتے اور کیفی کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ ناصر کو ابتدائے عمر ہی میں ان باکمال شعراء کو بڑے قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا۔ جس کا اثر ان کے کلام اور ان کے لہجے میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ناصر کے خاندان میں علم و ادب کا چرچہ عام تھا چنانچہ ان کے دادا بھی شاعر تھے اور خستہ تخلص تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مشاہیر شعراء سے خاص ربط وضبط رکھتے تھے۔

ناصر کاسگنجوی فلمی صنعت سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے پاکستان کی اولین سینما اسکوپ فلم "جان پہچان" کے گانے لکھے۔ مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

ناصر کاسگنجوی

ڈھل گئی شام تو اکثر یہی دھوکا گزرا
جیسے آہٹ ہوئی تیری ترا سایا گزرا

ابرِ آوارہ کا ٹکڑا سرِ صحرا گزرا
یا غمِ دوست میں تسکین کا لمحہ گزرا

شکرِ محرومی بھی کیا چیز ہے اللہ اللہ
دل پہ جو وقت بُرا وقت تھا اچھا گزرا

دست در دست رواں اہلِ طلب ہیں جس پر
دل اُسی جادۂ بےنام سے تنہا گزرا

خامشی نے بھی سنائے ہیں بہت افسانے
خشک آنکھوں سے بھی طوفانِ تمنّا گزرا

تیری راہوں پہ تجھے کیسے بتاؤں اے دوست
آج کیا گزری ہے مجھ پر جو اکیلا گزرا

اک کرن بھی نہ ملی میرے سیہ خانے کو
میری راتوں سے دبے پاؤں سویرا گزرا

نیند کچھ ہم کو ہی آتی نہیں ناصؔر ورنہ
اپنی قسمت کو تو سوتے ہوئے عرصہ گزرا

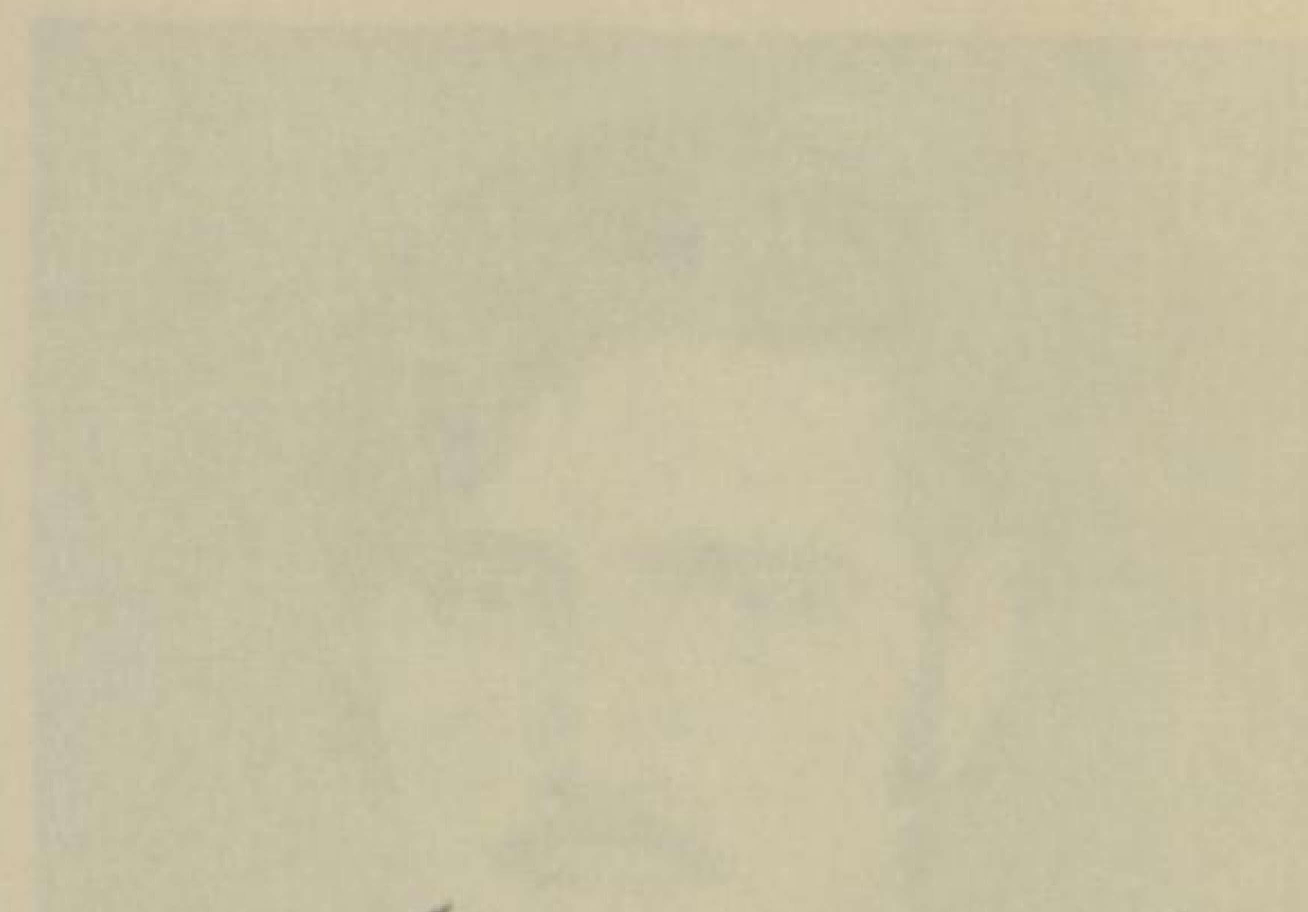


نثار ناسک

اصل نام محمد نثار ہے۔ نثار ناسک سیالکوٹ کی ایک تحصیل ڈسکہ میں ۱۵ فروری ۱۹۴۳ء کو پیدا ہوئے۔ نثار کے نانا امام مسجد تھے اور والد ایک چھوٹے سے کسان — زیادہ تر تعلیم مسجد میں حاصل کی۔ ان کے والد باقاعدہ تعلیم کے خلاف تھے، اس کے باوجود نثار ناسک بی اے (سال اوّل) تک زیرِ تعلیم رہے۔ کچھ گھریلو حالات اور کچھ اپنی افتادِ طبع کے باعث وہ باقاعدہ تعلیم مکمل نہ کر سکے۔

باقاعدہ شاعری کا آغاز ۱۹۶۴ء سے ہوا۔ ملازمت کا آغاز صحافت سے کیا اور مختلف اخبارات سے وابستہ رہے۔ ان دنوں ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے منسلک ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے:۔

"اب تک لکھتا چلا جا رہا ہوں۔ لیکن جو کچھ اب تک لکھا ہے، اسے شاعری تو نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ وہ شاعری کی تلاش کے امکانات میں ایک دھندلی اور بے نام سی کوشش ضرور ہے۔"



نثار ناسک

آج بھی میرے رگ و پے میں ہیں تعزیریں تری
سانس لیتا ہوں چھنک اٹھتی ہیں زنجیریں تری

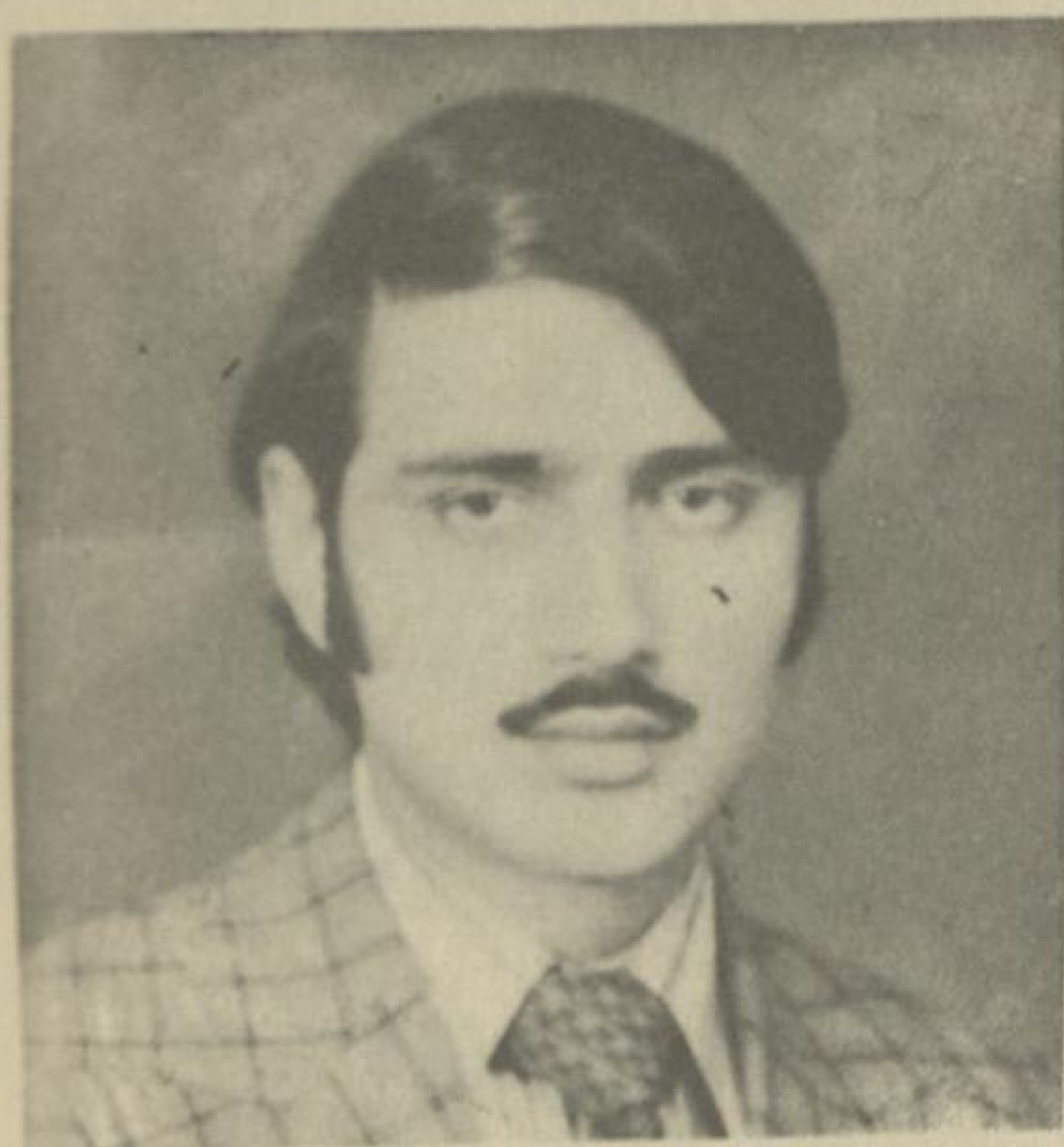
میں بھی استحصال کی مٹّی میں بوتا ہوں لہو
چاٹتی رہتی ہیں میری قبر، جاگیریں تری

رکھ ذرا سب سے الگ میری عبادت کا حساب
بھوک کے صفحوں پہ میں لکھتا ہوں تفسیریں تری

بانسری کی لے سسکتی ہے ملوں کے شور میں
دیکھ ایندھن بن گئے رانجھے ترے، ہیریں تری

اس کے دروازے کو چھونے سے بھی گھبراتا ہے دل
گھر کے جس کمرے میں آویزاں ہیں تصویریں تری

آخری خط میں بھی ناسک! اس نے لکھا تھا یہی
میرے اشکوں سے ہی تابندہ ہیں تحریریں تری



نجیب احمد

آپ ۸۔ اگست ، ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار اُن جدید شاعروں میں ہوتا ہے جو ان دنوں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ آپ ایک اشاعتی ادارہ چلا رہے ہیں۔ جس کے تحت ادبی کتابوں کی اشاعت ہوتی رہتی ہے۔ نجیب احمد اردو کے علاوہ پنجابی زبان میں بھی شعر کہتے ہیں ۔ آپ کا پہلا مجموعۂ کلام "عبارتیں" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔

نجیب احمد

یقیں نے مجھ کو اسیرِ گماں نہ رہنے دیا
کہ اس نے ربط کوئی درمیاں نہ رہنے دیا

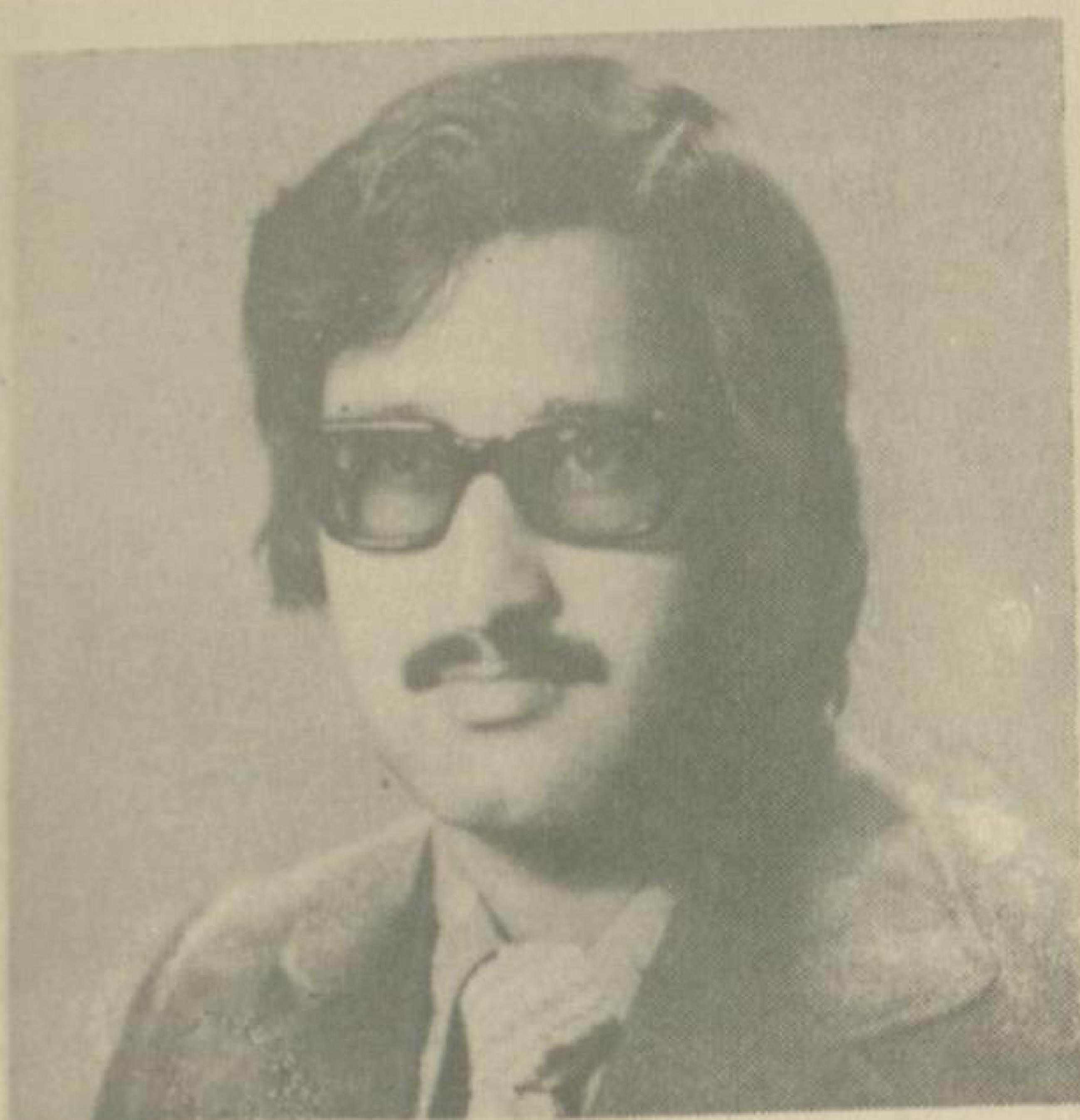
مری نظر ہی سمندر کی آخری حد تھی
مری تھکن نے مجھے پر فشاں نہ رہنے دیا

کسی نے کشتی اتاری تو تھی سمندر میں
مگر ہوا نے کوئی بادباں نہ رہنے دیا

کوئی تو برف بہ کف دشت کی طرف آیا
کسی نے بحر میں پانی رواں نہ رہنے دیا

ہر ایک لفظ میں یوں کر دیا لہو شامل
کہ داستاں کو فقط داستاں نہ رہنے دیا

نجیبؔ کس طرح جاگیں کہ ان اندھیروں نے
سحر کا تارا سرِ آسماں نہ رہنے دیا



نذیر تبسّم

۴ جنوری ۱۹۵۰ کو پشاور میں ولادت ہوئی۔ نذیر احمد نام تجویز کیا گیا۔ جب شاعری کا آغاز ہوا تو ادبی حلقوں میں نذیر تبسّم کے نام سے متعارف ہوئے۔

پشاور سے میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج پشاور سے ۱۹۷۲ میں بی اے اور ۱۹۷۴ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم، اے اردو کا امتحان پاس کیا۔

شاعری کا آغاز کالج کے زمانے ہی سے ہو چکا تھا۔ یونیورسٹی کی ادبی فضا اور پھر پشاور کے ادبی حلقوں کی پذیرائی نے ان کی شاعری کو مزید نکھارا۔ نذیر تبسّم نے چند افسانے بھی لکھے ہیں۔ لیکن بنیادی رجحان شاعری اور شاعری میں بھی غزل کی طرف ہے ستمبر ۱۹۷۵ء میں فیڈرل گورنمنٹ کالج اسلام آباد میں لیکچرر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا اور جون ۱۹۷۸ء میں پشاور یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ جہاں فی الحال شعبۂ اردو میں درس و تدریس کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔

مجموعۂ کلام "خراشیں" کے نام سے زیر ترتیب ہے۔

نذیر تبسّم

کلی کلی میں نہاں ، ہچکچاہٹیں پہچان
تو شاخِ گل پہ گلِ نو کی آہٹیں پہچان

لہو کی آنکھ سے پڑھ میرے ضبط کی تحریر
لبوں پہ لفظ نہ گن ، کپکپاہٹیں پہچان

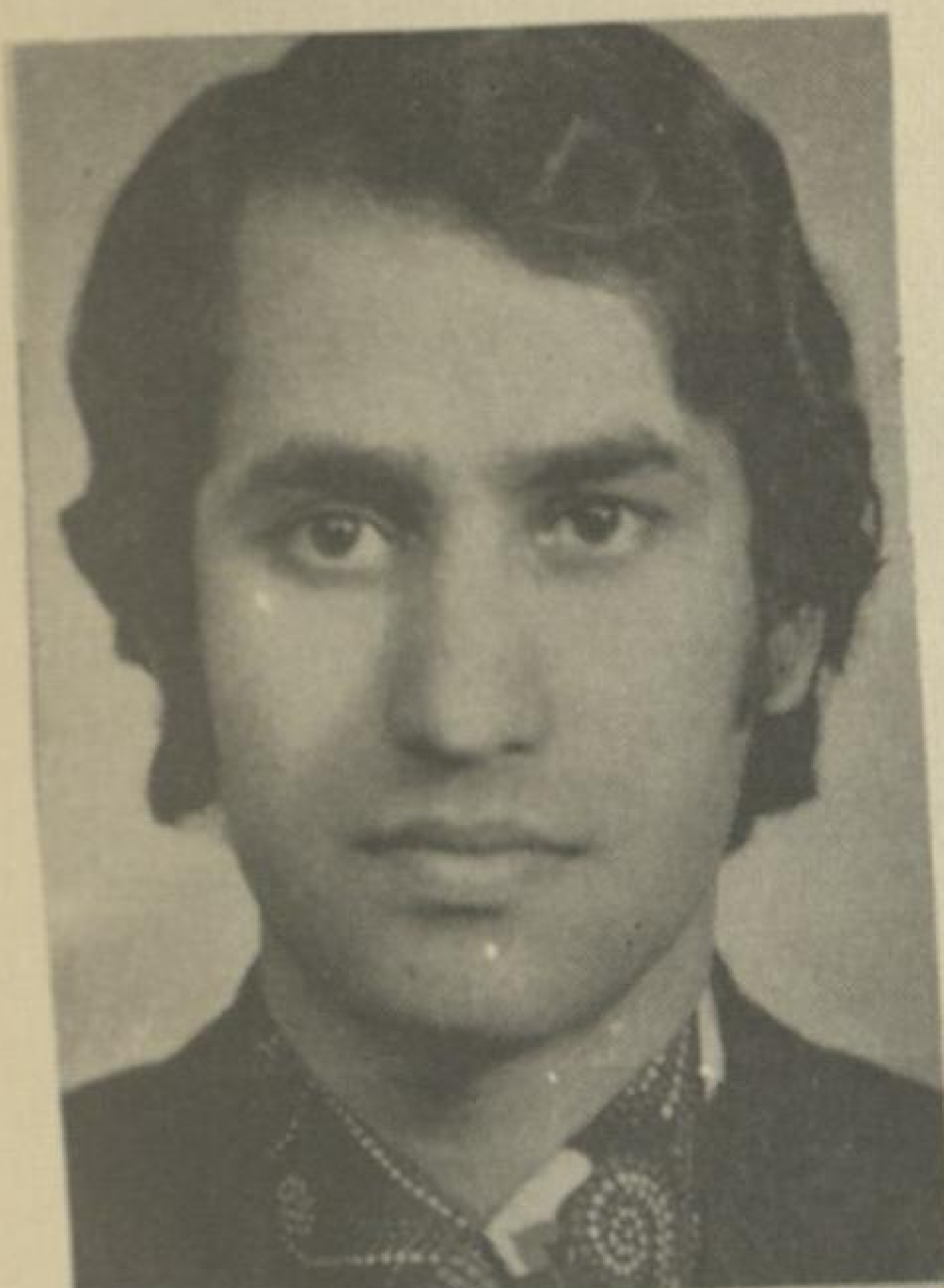
میں پنکھڑی کی طرح اپنے ہونٹ وا کردوں
تو تتلیوں کی طرح گنگناہٹیں پہچان

محاذ کھول دیا ہے ، تو گہری نیند نہ سو
ہوا کے بھیس میں ہیں سنسناہٹیں پہچان

یہ جھوٹے نگ ہیں مگر حسن سے تراشے ہیں
تو جوہری ہے اگر ، جگمگاہٹیں پہچان

وہ کالا سانپ ہے ، تجھ کو نظر نہ آئے گا
تو جھاڑیوں میں چھپی سرسراہٹیں پہچان

نذیرؔ لوگ تو چہرے بدلتے رہتے ہیں
تو اتنا سادہ نہ بن ، مسکراہٹیں پہچان



نذیر قیصر

نذیر قیصر کی پیدائش ۱۹۴۲ء کے لگ بھگ ہوئی۔ ولادت کے چند یوم بعد ماں کا انتقال ہو گیا جس کے نتیجے میں ایک احساسِ محرومی و تنہائی بچپن ہی سے آپ کی زندگی پر چھا گیا۔ بچپن کا زمانہ معاشی پریشانی اور دربدری کا زمانہ تھا جس میں آپ، اپنے والد کے ہمراہ مسلسل ہجرتوں میں رہے۔ شہر بہ شہر زندگی بسر کرنے کے سبب، باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ آپ کی تعلیم آپ کے ذاتی مطالعہ، کوشش اور مشاہدے کی مرہونِ منت ہے۔

نذیر قیصر اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ آپ کا اولین مجموعۂ کلام "آنکھیں، چہرہ، ہاتھ" کے نام سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ دس برس بعد پنجابی شاعری کا مجموعہ "زیتون دی پتّی" چھپا جس پر آدم جی ایوارڈ ملا۔ ۱۹۷۹ء میں اردو نظموں کا انتخاب "تیسری دنیا" طبع ہوا۔

فی الحال آپ کی شاعری کے تین اور مجموعے زیرِ ترتیب ہیں جن کے نام "گنبدِ خوف سے بشارت"۔ "آندھی کا سناٹا" اور "نفی اثبات" ہیں۔

نذیر قیصر

آسماں آسماں بھٹکتا ہوں
میں زمیں کا سوتیلا بیٹا ہوں

بے ہنر بے صفات ہاتھوں سے
شمعیں بو کر اندھیرے کاٹتا ہوں

ہر طرف دشمنوں کے لشکر ہیں
میں بہادر ہوں پر اکیلا ہوں

تو ثبات اور میں نفی تیری
تو بھی سچا ہے میں بھی سچا ہوں

خوں میں بھیگی ہوئی فصیلوں پر
جو نہ لکھا گیا وہ نوحہ ہوں

کیا سمیٹو گے تم مجھے، کہ میں
ٹوٹتے آئنوں کا سایا ہوں



نظیر صدیقی

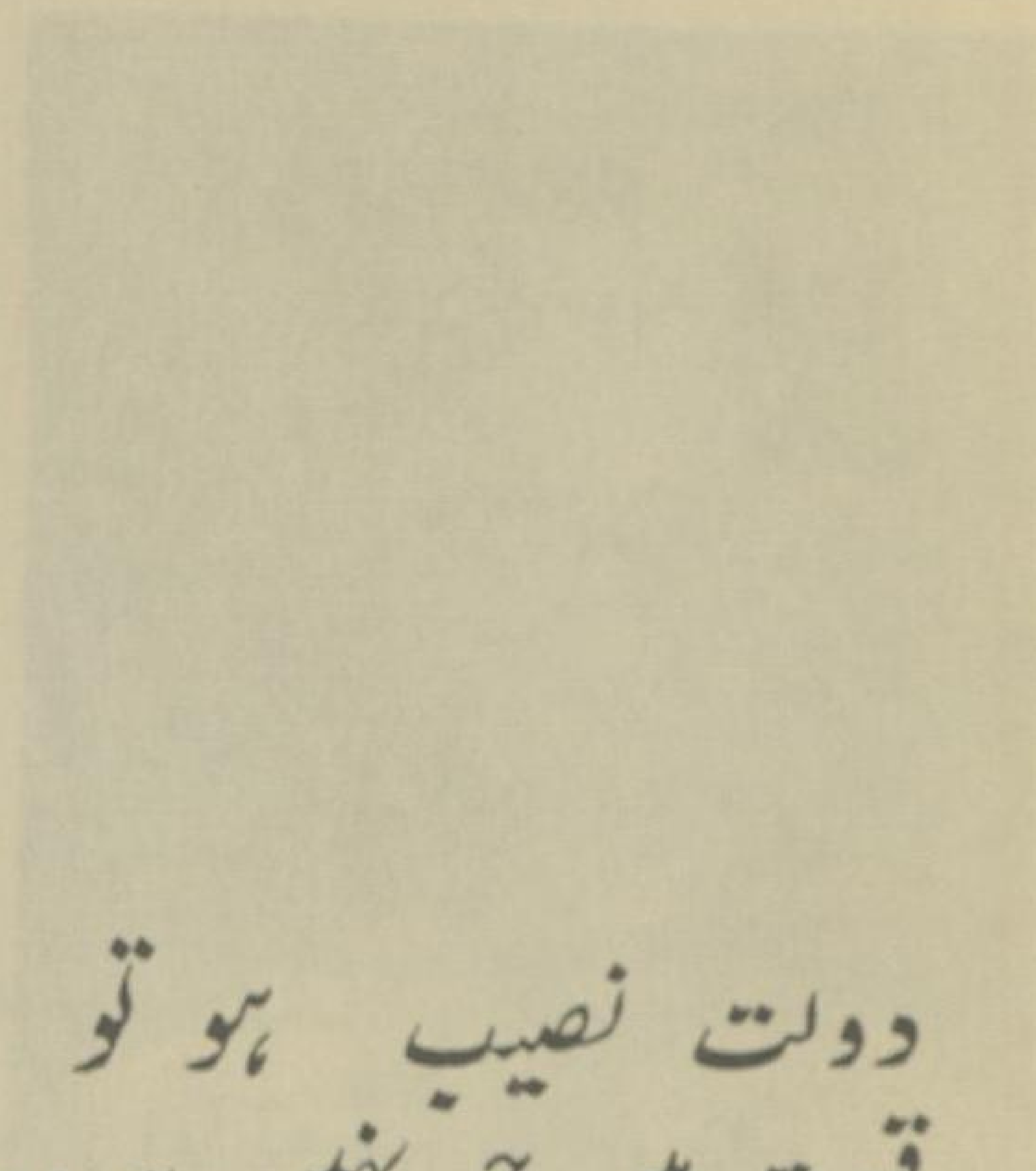
نظیر صدیقی ۷ نومبر ۱۹۳۰ء کو صوبۂ بہار کے ضلع چھپرا میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ دسمبر ۱۹۵۴ء سے قائدِ اعظم کالج ڈھاکہ میں لیکچرار کی حیثیت سے تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ نومبر ۱۹۶۹ء تک نوٹرے ڈیم کالج ڈھاکہ، مدرسۂ عالیہ ڈھاکہ اور شعبۂ صحافت ڈھاکہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ سیاسی حالات کی روزافزوں خرابی کے باعث دسمبر ۱۹۶۹ء میں اردو کالج کراچی آ گئے۔ ستمبر ۱۹۷۱ء میں فیڈرل گورنمنٹ کالج برائے طلبہ اسلام آباد سے منسلک ہوئے۔ مارچ ۱۹۷۶ء سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔

۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۷ء کی درمیانی مدت میں درج ذیل تصانیف آپ کے قلم سے نکلی ہیں:۔

شہرت کی خاطر (انشائیے)، تاثرات و تعصبات۔ میرے خیال میں (تنقیدی مضامین)، حسرتِ اظہار (مجموعۂ کلام)، جان پہچان (شخصی خاکے)، یگانہ چنگیزی (انتخاب کلام مع مقدمہ) نقش ہائے رنگ رنگ، جلد اوّل (رشید احمد صدیقی کے غیر مدون مضامین کا مجموعہ مع مقدمہ)

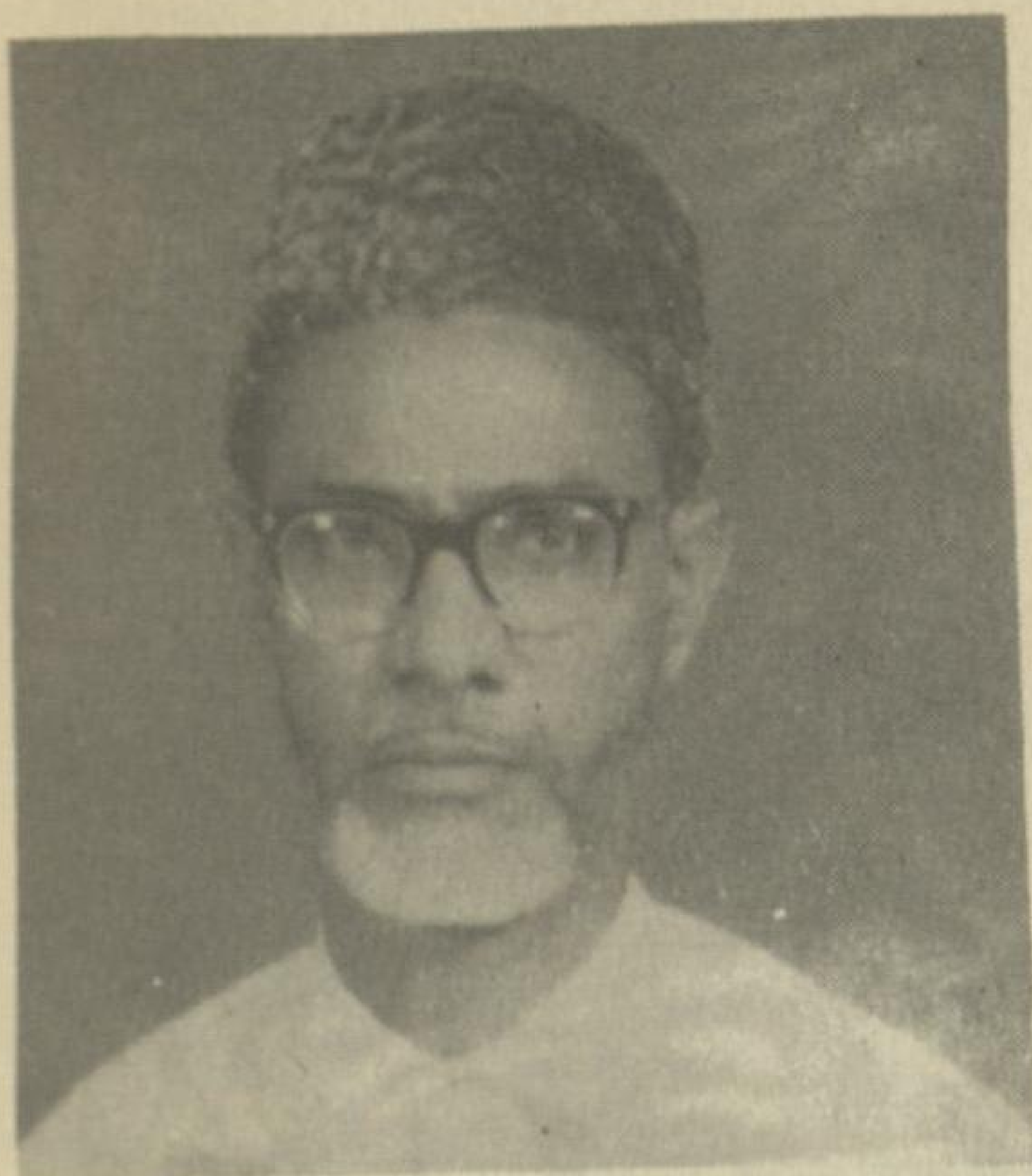
زیرِ طبع تصانیف یہ ہیں :۔

"اردو ادب کے مغربی دریچے" (تنقید) "تفہیم و تعبیر" (تنقیدی مضامین) اور "عندلیب شادانی"۔



نظیر صدیقی

دولت نصیب ہو تو محبت خریدیئے
قسمت میں جو نہیں ہے وہ نعمت خریدیئے
بن جائیے کسی کی ضرورت تو خیر ہے
ورنہ پھر آپ اپنی ضرورت خریدیئے
مہلت ملی جو موت سے ہے وہ تو زندگی
اب زندگی سے مرنے کی مہلت خریدیئے
گر چاہتے ہیں آپ محبت ہو شاد کام
مرنے کا شوق، جینے کی تہمت خریدیئے
بے سود ہے یہ کام بھی لیکن مفر کہاں
عبرت سرائے دہر میں عبرت خریدیئے
آتی نہیں ہے راس اگر دل کو بے حسی
پھر دل کو خون کیجئے، حسرت خریدیئے
یہ کیا کہ دوستوں کی عداوت خرید لی
جینا ہے، دشمنوں کی محبت خریدیئے
دامن سے ہاتھ، ہاتھ سے دامن چھٹا نظیر
قربت کی آرزو میں مسافت خریدیئے



نعیم صدیقی

آپ ۴ جون ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ ایک طویل عرصے سے شعبۂ صحافت سے منسلک ہیں۔ شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید میں بھی ایک مقام رکھتے ہیں۔
آپ "سیارہ" لاہور کے مدیر اعلیٰ ہیں۔
ذہنی زلزلے، ٹھنڈی آگ، محسن انسانیت (سیرت رسول پاکؐ)، شعلۂ خیال، دفترِ بے معنی (طنزیات)، بارود اور ایمان، پھر ایک کارواں لٹا، امریکہ کا صدارتی نظام، معرکۂ دین و سیاست، عباسی دور کی تاریخ کا ایک جائزہ، آپ کی مطبوعہ کتب ہیں۔

نعیم صدیقی

سبک سبک کبھی گزرے ہیں وہ صبا کی طرح
کبھی برس گئے جذبوں پہ وہ گھٹا کی طرح

اذیتوں کا تسلسل، عقوبتوں کا سموم
یہ زندگی ہے کسی جرم کی سزا کی طرح

قصورِ وارِ محبت ہیں ہم، ہمارے لئے
کوئی سزا نہیں اس ترکِ اعتنا کی طرح

ہمیشہ ڈرتے، سکڑتے، جھجکتے رہتے رہے
نباہی ہم نے شرافت، مگر خطا کی طرح

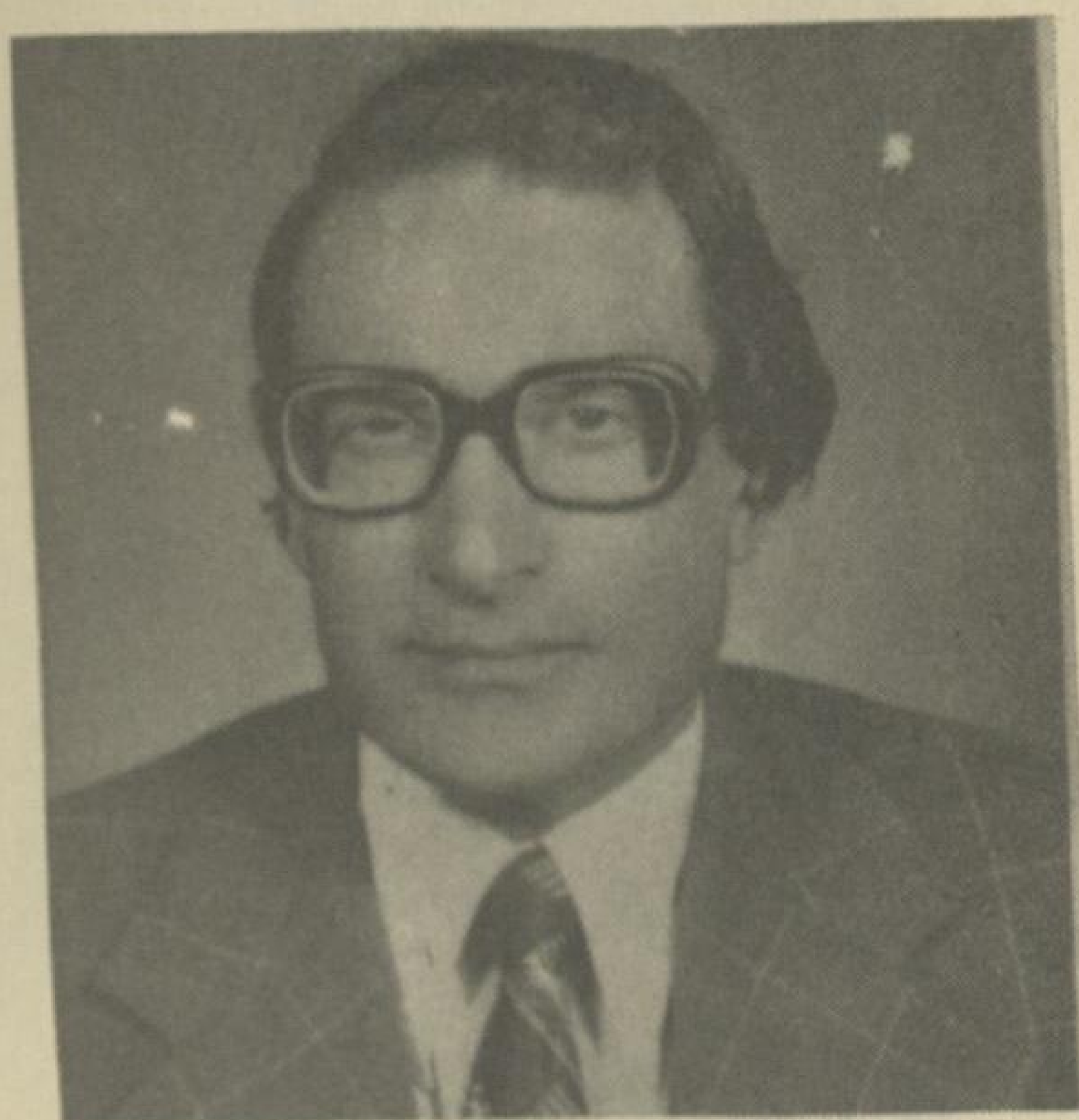
تمہارے ہاتھ کی شمشیر، یا عدو کے ہوں تیر
کسی کی ضرب نہیں ہے مری دعا کی طرح

ہم اپنی ایک جبیں کو کہاں کہاں بانٹیں
ہر ایک سجدہ طلب ہم سے ہے خدا کی طرح

بغور لرزشِ برگِ سمن کو دیکھتا ہوں
کہ اس میں بات ہے کوئی تری ادا کی طرح

گواہ اوس کے قطرے ترے تقدّس پر
تبسّمِ گلِ تر ہے تری حیا کی طرح

بھٹک رہی ہیں نوائیں بہ شوقِ اہلِ نظر
مرا تمام سخن آہِ نارسا کی طرح



نور بجنوری

نور الحق صدیقی نام اور نور تخلص۔ آپ کی پیدائش ۲۴ جنوری ۱۹۲۴ء کو بمقام بجنور (بھارت) ہوئی۔

بی اے (آنرز) کرنے کے بعد ملازمت اختیار کی۔ گذشتہ چالیس برس سے لکھ رہے ہیں۔ آپ کی نگارشات برصغیر کے مقتدر ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

"ہائے محبت، ہائے زمانے" اور "جگمگ" کے نام سے آپ کی دو کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ "زلف و دار" کے عنوان سے شعری مجموعہ زیرِ اشاعت ہے۔

نورؔ بجنوری

سمندر پی کے بھی پیاسا رہوں گا
میں تشنہ لب سدا تشنہ رہوں گا

کوئی منزل، میری منزل نہیں ہے
جیوں گا جب تلک چلتا رہوں گا

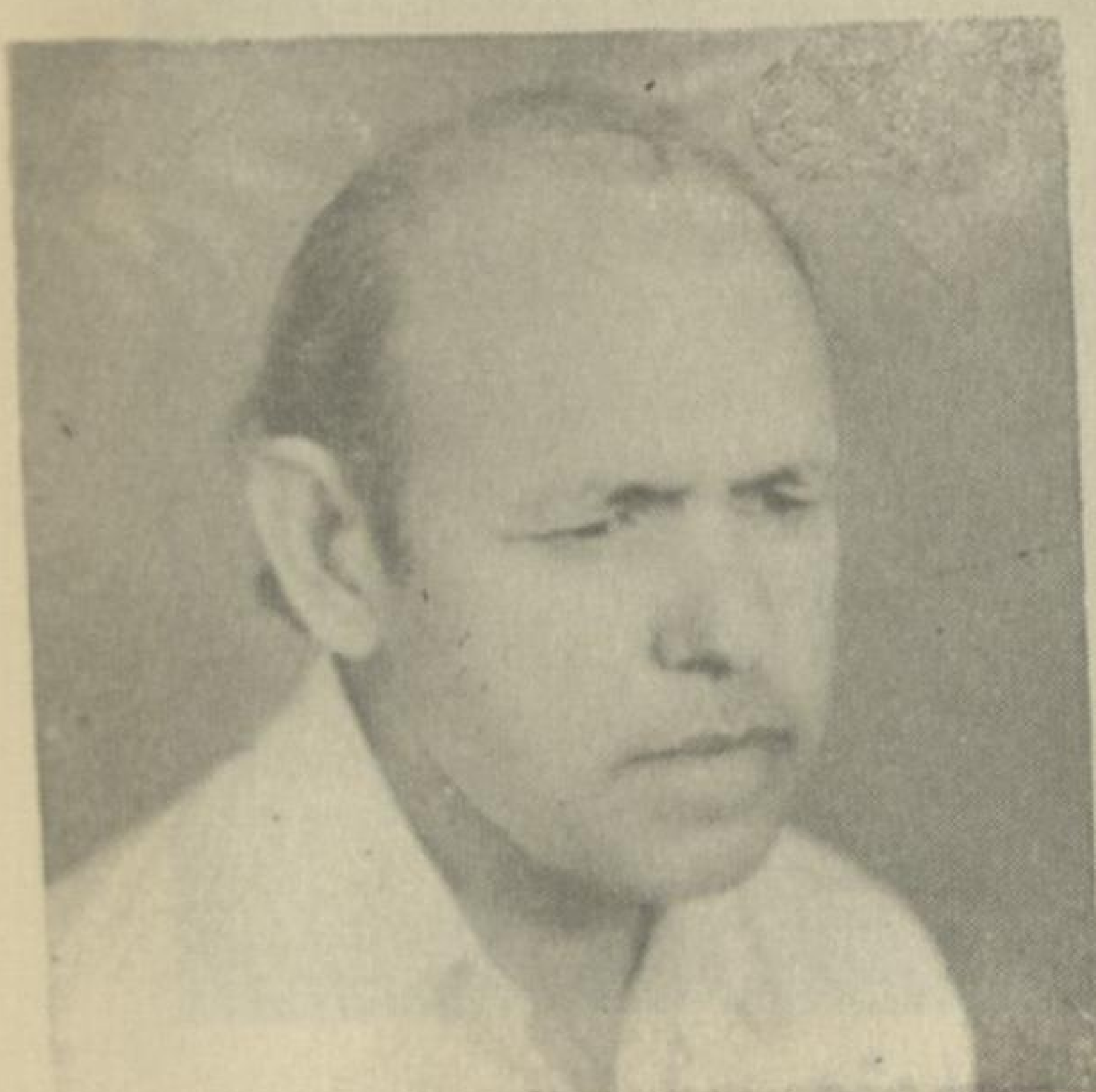
ہوا کے ساتھ بھٹکوں گا بنوں میں
خرد مندوں سے رم خوردہ رہوں گا

تلوّن سے مرے جوہر کھلیں گے
کبھی ذرّہ کبھی صحرا رہوں گا

اُڑے گا لاکھ رہوارِ زمانہ
میں اس کی پشت پر بیٹھا رہوں گا

مرا مقسوم ہے مرگِ مسلسل؟
تو میں ہر دور میں زندہ رہوں گا

رہوں گا اس چمن میں نورؔ جب تک
مثالِ برگِ آوارہ رہوں گا



وزیر آغا

۱۹۲۲ء میں وزیر کوٹ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں ایم اے (اقتصادیات) کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں "اردو ادب میں طنز و مزاح" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء میں مولانا صلاح الدین احمد کے ساتھ کچھ عرصہ تک "ادبی دنیا" نکالتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں اپنا ادبی مجلّہ "اوراق" کے نام سے نکالا۔ جو اب تک شائع ہو رہا ہے۔

وزیر آغا نے شاعری، تنقید اور انشائیہ غرض بہت کچھ لکھا ہے۔ نظم و نثر کی اب تک سولہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں: مسرّت کی تلاش، نظم جدید کی کروٹیں، شام اور سائے، دن کا زرد پہاڑ، اردو شاعری کا مزاج، چوری سے یاری تک، اور نردبان، وغیرہ۔ منتخب نظموں کے انگریزی تراجم پر مشتمل ایک کتاب —— SELECTED POEMS کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

وزیر آغا

وہ برنگِ دگر ہی جائے گا
بن کے خوشبو بکھر ہی جائے گا

ایک لمحہ اگر گزر جائے
دوسرا تو گزر ہی جائے گا

خوگرِ تیرگی! اگر تو نے
شمع دیکھی تو ڈر ہی جائے گا

اب خوشی بھی تو دل پہ وار کرے
غم تو یہ کام کر ہی جائے گا

میں مُصر ہوں کہ ہم سفر ہو مرا
وہ بضد ہے کہ گھر ہی جائے گا

قیدِ مژگاں سے کر اسے آزاد
ورنہ آنسو تو مر ہی جائے گا

ضبط کرتا رہا اگر یوں ہی
یہ شجر بے ثمر ہی جائے گا

نور، میراث آنکھ والوں کی
بے بصر، بے بصر ہی جائے گا



یاورعبّاس

ڈاکٹر سیّد یاور عبّاس، ۱۹۱۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، آپ کے والد سیّد ناصر عبّاس بھی پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ آپ نے اپنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم دہلی اور لاہور میں حاصل کی۔ عثمانیہ میڈیکل کالج حیدرآباد دکن سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کر کے ۱۹۴۴ء میں دہلی میں پریکٹیس کا آغاز کیا۔

آپ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے، ان دنوں کراچی میں قیام پذیر ہیں۔

یاور عبّاس نے پہلا شعر اس وقت کہا جب آپ کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی۔ اب تک آپ کم و بیش تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ غزل کے علاوہ مرثیہ بھی خوب کہتے ہیں۔

یاور عباس

کچھ لوگ جو نخوت سے مجھے گھور رہے ہیں
ماحول سے شاید یہ بہت دور رہے ہیں

کیا کہئے کہ کیا ہو گیا اس شہر کا عالم
جس شہر میں الفت کے بھی دستور رہے ہیں

مجبور کسے کہتے ہیں یہ کون بتائے
پوچھے کوئی اُن سے کہ جو مجبور رہے ہیں

کچھ لوگ سرِدار رہے ہوں تو رہے ہوں
ہم ہیں کہ بہرحال سرِطور رہے ہیں

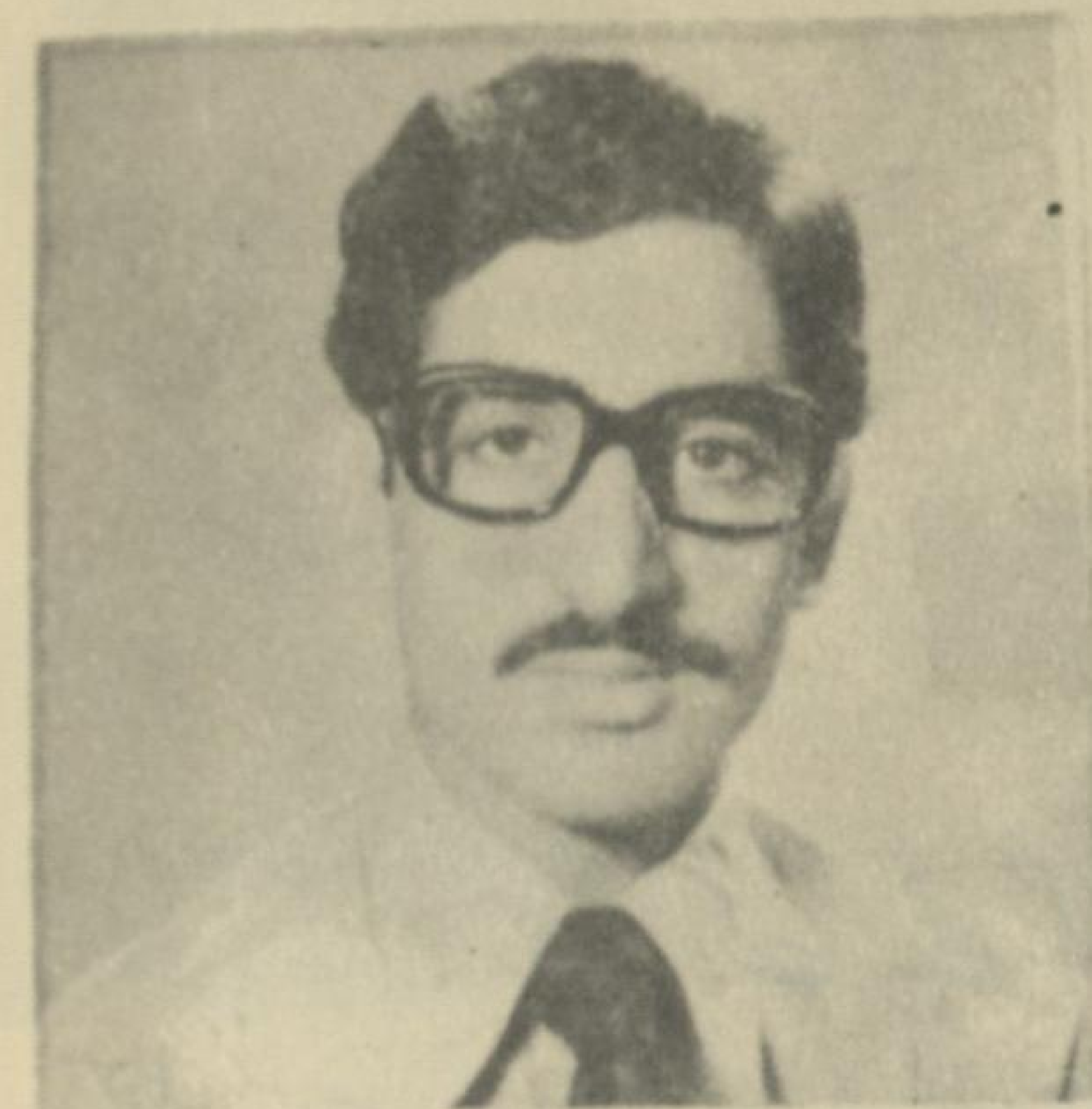
ہنستے ہوئے چہروں پہ نہ جا سینوں میں ان کے
حالات کے ٹکراؤ سے ناسُور رہے ہیں

اے شیخ غنیمت ہے اگر ہم کو سمجھ لو
ہم منصبِ تصدیق پہ مامور رہے ہیں

اک تم کہ خدائی کے بھی دعوے رہے تم کو
اک ہم کہ اس اقرار سے معذور رہے ہیں

سُکّانِ حرم کیا ہیں یہ مجھ سے کوئی پوچھے
اللہ کے گھر میں بھی یہ مغرور رہے ہیں

احسان بڑا بوجھ ہے اس خوف سے یاوؔر
دیوار کے سائے سے بھی ہم دُور رہے ہیں



یوسف حسن

اصل نام محمد یوسف، قلمی نام یوسف حسن - والد کا اسمِ گرامی محمد حسن ہے۔
آپ ۱۹۴۸ء میں بمقام کالا گوجراں (ضلع جہلم) پیدا ہوئے۔ اردو میں ایم اے کرنے کے علاوہ آپ نے بی ایڈ کا امتحان بھی پاس کیا اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج، اصغر مال راولپنڈی میں شعبۂ اردو سے متعلق ہیں۔
یوسف حسن اردو کے علاوہ پنجابی میں بھی لکھتے ہیں۔
مجموعۂ کلام ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔

یوسف حسن

اِسی حریف کی غارت گری کا ڈر بھی تھا
یہ دل کا درد مگر زادِ رہگزر بھی تھا

اِسی پہ شہر کی ساری ہوائیں برہم تھیں
کہ اِک دیا مرے گھر کی منڈیر پر بھی تھا

یہ جسم و جان تری ہی عطا سہی، لیکن
ترے جہان میں جینا مرا ہنر بھی تھا

مجھے کہیں کا نہ رکھا سفید پوشی نے
میں گرد گرد اٹھا تھا تو معتبر بھی تھا

اِسی کھنڈر میں مرے خواب کی گلی بھی تھی
گلی میں پیڑ بھی تھا پیڑ پر ثمر بھی تھا

میں سرخرو تھا خدائی کے رو برو یوسفؔ
کہ اُس کی چاہ کا الزام میرے سر بھی تھا



یوسف رجا چشتی

اصل نام ارباب محمد یوسف، قلمی نام یوسف رجا چشتی۔ ۶ ستمبر ۱۹۲۸ء کو پشاور کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں بدھائی کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے اردو فارسی درساً پڑھی اور عربی، بنگلہ شوقیہ اور پھر عربی کے فیض سے قرآن کریم، حدیث و فقہ کا مطالعہ کیا اور اپنی عمر کے سات سال اس اخذ تقدس میں صرف کئے۔ ۴۶-۱۹۴۵ء میں شعر کہنے شروع کئے۔ کچھ دوستوں کے تعاون سے مجلس اردو سرحد کی بنیاد رکھی، لیکن ۱۹۴۹ء میں فوج میں کمیشن مل گیا۔ اور یوں احباب سے بچھڑ گئے۔ دوران ملازمت "ادب" سے زیادہ "آداب" سے واسطہ رہا۔ ۲۷ سال کی ملازمت کے بعد فارغ ہوئے تو پھر شعر و ادب کی طرف رخ کیا۔ آج کل ادارۂ علم و فن پشاور کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مجموعہ کلام جنگ کے دوران ضائع ہو گیا۔ "آنکھوں کی زبان" مجموعہ کلام زیر ترتیب ہے۔ فارسی، پشتو، ہندکو اور اردو میں شعر کہتے ہیں۔

<u>یوسف رجا چشتی</u>

وہ برہمی نہ لگی اب یہ آشتی نہ لگے
کہ سادگی بھی تری اب تو سادگی نہ لگے

جراحتوں نے مجھے اتنا کر دیا محتاط
جو پہلی بار ملے وہ بھی اجنبی نہ لگے

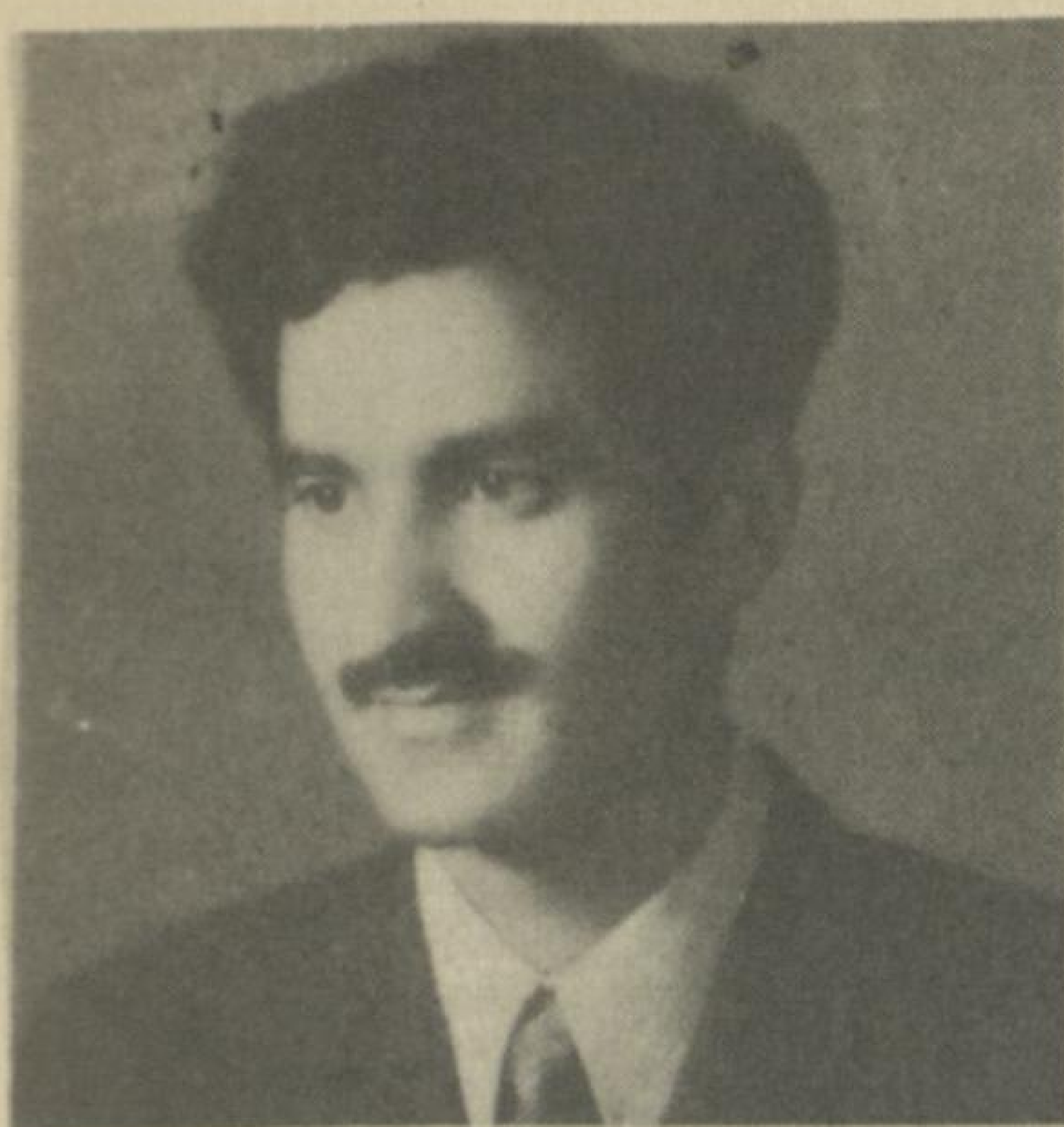
کچھ اس سلیقے سے تم دل پہ داغ دیتے ہو
دعا ہے تم کو کسی کی نظر کبھی نہ لگے

ترے خیال میں خود سے مکالمے بولوں
پر اپنی بات بھی اب اپنی بات ہی نہ لگے

نہ جانے رفعتِ معیار ہے کہ شدّتِ یاس
کہ آدمی نظر آئے تو آدمی نہ لگے

میں تیرے عدل کے بھی خواب دیکھ ہی لیتا
برا ہو ڈر کا، کہ اک ڈر سے آنکھ ہی نہ لگے

رجاؔ یہ دھوپ نگل لو تو سائے بھی اگلو
کہ زندگی تو بغیر اس کے زندگی نہ لگے



یوسف عزیز

آپ کا پورا نام محمد یوسف عزیز ہے۔ ابتدائی تعلیم سالار والا میں حاصل کی۔ ۱۹۶۸ء میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے ادبیات اردو میں ایم اے کیا۔

کچھ عرصہ پنجاب لوکل کونسل سروس کی ملازمت میں گزارا۔ جس کے بعد آپ تدریس کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ اور میانوالی، بھکر اور فیصل آباد کے کالجوں میں درس دیتے رہے۔ اسی دوران آپ نے ادبیاتِ فارسی اور علومِ اسلامیہ میں بھی ایم اے کر لیا۔ آپ ان دنوں پاکستان نیشنل سینٹر اسلام آباد میں ڈائریکٹر مالیات ہیں۔

میرِ کارواں، رہبرِ فرزانہ اور شعاعِ اقبال، آپ کی اہم تصانیف ہیں۔

یوسف عزیز

پرندے، پیڑ، شاخیں سب جدا ہیں
کڑے موسم، ہوائیں بے ردا ہیں

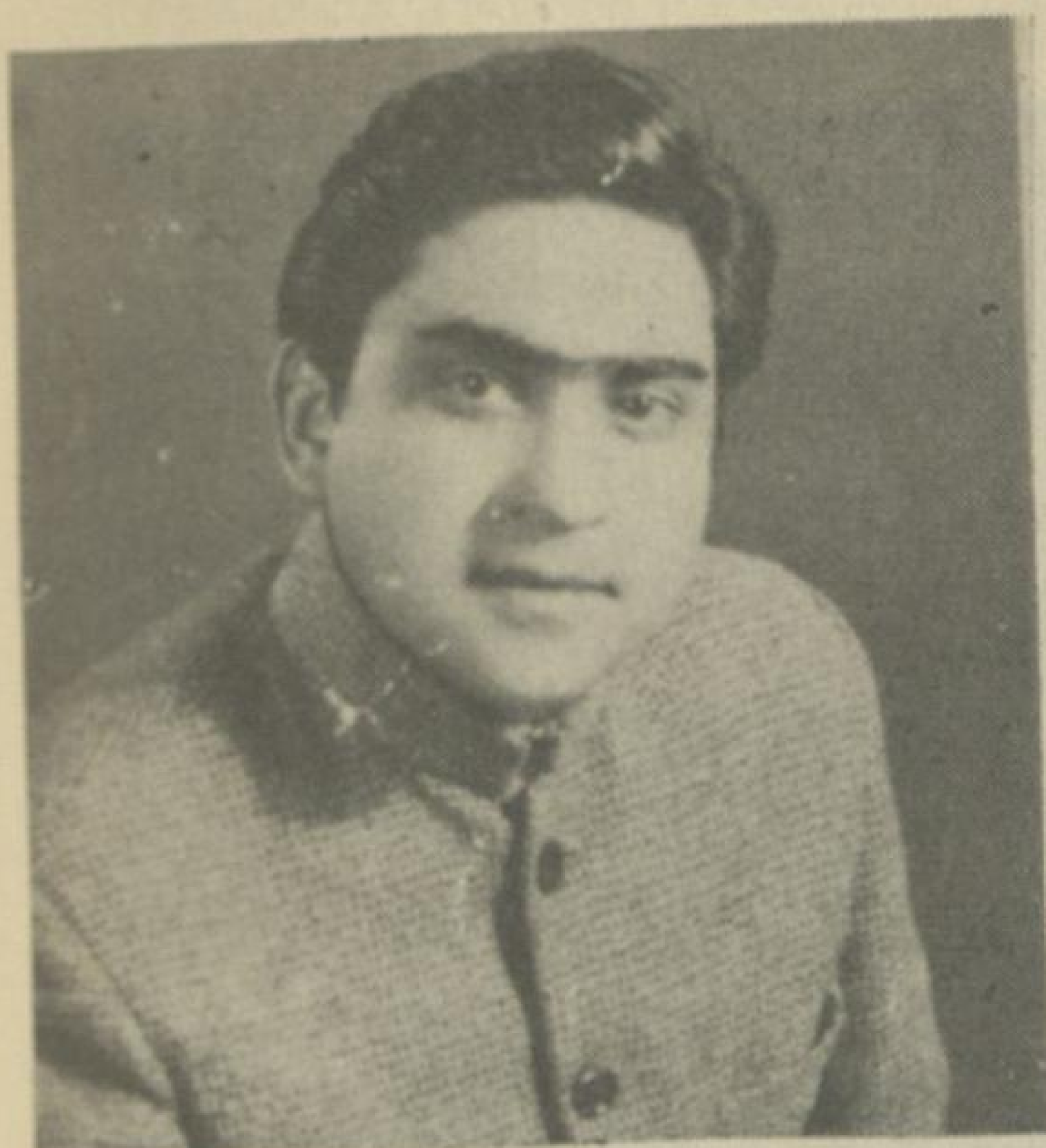
ستم ایجاد، تیرا دم سلامت!
روا اکثر تجھی سے ناروا ہیں

محبت کے زمانے لد گئے ہیں
دلوں میں رنجشیں پیہم سوا ہیں

نئے موسم قرینے لے کے آئیں
رتوں کے قافلے تو کج ادا ہیں

الٰہی خیر ہو اہلِ چمن کی
گلوں کی پتیاں سب ہم نوا ہیں

کرن نیزے تک آتی جا رہی ہے
مگر باندھے ہوئے دستِ دعا ہیں



یونس شررؔ

یونس شرر، بھارت کے قصبہ اول کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ آگرہ سے اٹھارہ اور متھرا سے آٹھ میل پر واقع ہے۔ آپ کے والد جناب یعقوب آثر خود بھی اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

یونس شررؔ نے رواج کے مطابق پہلے پہل عربی، فارسی اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ اپنے قصبہ کے مدرسے اور پھر آگرہ میں شعیب محمدیہ ہائی اسکول میں پڑھتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں والدین کے ساتھ پاکستان آگئے اور حیدرآباد سندھ میں میٹرک سے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۶ء میں جامعہ کراچی سے ایم اے اردو کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ اور تدریس کے پیشے سے منسلک ہوگئے، آپ ان دنوں اردو کالج میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔

یونس شرر، شاعری کے علاوہ، افسانے اور ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔ افسانوں کا مجموعہ "پیاسا سمندر" شائع ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ مختلف اخباروں میں کالم بھی لکھتے رہے ہیں جن کا انتخاب "اداریئے اور حاشیے" کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ مجموعہ کلام "زرد موسم کی ہوا" اشاعت کے مراحل میں ہے۔

یونس شرر

ہر طرف دھول سے اٹ گئے راستے، تھک کے سب ناقہ و ساربان سو گئے
واپسی کا سفر بھی تو ممکن نہیں، راہ چلتے ہوئے کارواں سو گئے

دُکھ بھرے موسموں کی یہ رُت آگئی، ابر، سایہ، نہ خوشبو، سرِ شاخ گل
شام سے غم کی دہلیز پر، لوگ رکھے ہوئے اپنی پیشانیاں سو گئے

اِن منڈیروں پہ رستوں کے، بیساکھیاں لوگ کاندھوں پہ اپنے اٹھائے ہوئے
منتظر راہ میں ہم سفر کے رہے، ہمسفر رات جانے کہاں سو گئے

بانجھ منظر ہوئے، سانس رُکنے لگی، پیڑ کے سائے آسیب بنتے گئے
کن سرابوں میں خوابوں کے ہم آگئے، سُونی گلیوں سے پہلے مکاں سو گئے

سُوکھے پتّے ہواؤں میں اُڑتے رہے، وہم و اندیشے ہر گام بڑھتے رہے
مَوسمِ ابرِ باراں کی سازش سے سب، راہ تکتے ہوئے بے اماں سو گئے

آنگنوں میں برستے ہوئے خوف سے، لوگ سہمے ہوئے چُپ کھڑے سوگ میں
خلقتِ شہر گلیوں میں پھیلی ہوئی، شہرِ جاناں کے سب مہرباں سو گئے

نارسائی کے احساس سے ضبط کے حوصلے غم کے سیلاب میں بہہ گئے
آنکھیں پتھرا گئیں، پاؤں شل ہو گئے، جاگتے جاگتے جسم و جاں سو گئے

خشک سالی سے موسم کی اب کے برس، ساری فصلیں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں
کوئی بادل بھی اُڑ کر نہ آیا اِدھر، اوڑھ کر کھیت ویرانیاں سو گئے

اے ہم نفسانِ محفلِ ما

رفتید ولے نہ از دلِ ما



ابنِ انشا

ابنِ انشاء کا اصل نام شیر محمد خان تھا۔ آپ ۱۵ جون ۱۹۲۷ء کو مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ لدھیانہ سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور آگئے اور یہاں سے ۱۹۴۶ء میں بی اے کیا پھر ۱۹۵۳ء میں کراچی سے ایم اے (اردو) کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۴۶ء سے ملازمت کی ابتدا کی، پہلے آل انڈیا ریڈیو میں تھے، قیام پاکستان کے بعد لاہور آگئے، ۱۹۴۹ء میں ریڈیو کی ملازمت چھوڑ دی اور دستور ساز اسمبلی میں مترجم ہو گئے۔ ۱۹۵۶ء میں محکمہ دیہات سدھار کے رسالے "پاک سرزمین" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ۱۹۶۱ء میں پاکستان کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر مطبوعات مقرر ہوئے اسی سال بلجیم گئے اور واپسی پر نیشنل بک سینٹر کے ڈائریکٹر بنے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کی خدمات لندن کے سفارت خانہ کو منتقل کر دی گئیں جہاں ۱۲ جنوری ۱۹۷۸ء کو وفات پائی۔

شاعری کے علاوہ ان کے کالم بھی لوگ بہت شوق سے پڑھتے تھے۔

ان کے شعری مجموعے یہ ہیں: چاند نگر، اس بستی کے اک کوچہ میں، چینی نظمیں قصہ ایک کنوارے کا، بلو کا بستہ۔

دوسری مطبوعہ کتابوں میں: "آوارہ گرد کی ڈائری، چلتے ہو تو چین کو چلیے۔ ابن بطوطہ کے تعاقب میں اور اردو کی آخری کتاب کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

ابنِ انشا

ہم جنگل کے جوگی، ہم کو ایک جگہ آرام کہاں
آج یہاں، کل اور نگر میں صبح کہاں اور شام کہاں

ہم سے پیت کی بات کرو، ہم سے بھی لوگو پیار کرو
تم تو پشیماں ہو بھی سکوگے، ہم کو یہاں پہ دوام کہاں

سانجھ سے کچھ تارے نکلے، پل بھر چمکے، ڈوب گئے
انبر انبر ڈھونڈ رہا ہے، اب اُنہیں ماہِ تمام کہاں

دل پہ جو بیتے سہہ لیتے ہیں، اپنی زباں میں کہہ لیتے ہیں
انشاؔ جی ہم لوگ کہاں اور میرؔ کا رنگِ کلام کہاں



اطہر صدیقی

اطہر صدیقی، ۲۲ فروری ۱۹۳۳ء کو فیروز آباد (آگرہ، بھارت) میں پیدا ہوئے قیام پاکستان کے فوراً بعد اطہر اپنے اہل خاندان کے ہمراہ کراچی آگئے۔ یہیں انھوں نے ثانوی تعلیم حاصل کی، ۱۹۵۵ء میں سندھ مسلم کالج سے بی اے کیا اور پھر جامعہ کراچی سے اردو اور فارسی ادب میں ایم اے کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کئے۔ جس کے بعد آپ جناح کالج کراچی سے منسلک ہو گئے۔

۱۹۵۸ء میں کراچی سے انھوں نے ایک اعلیٰ پایہ کا ادبی رسالہ "سات رنگ" کے نام سے نکالا جو کئی برس تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔

اطہر صدیقی نے "طلسم ہوشربا کے مافوق الفطری عناصر" کے عنوان سے ایک مبسوط تحقیقی مقالہ تحریر کیا، جو باقاعدگی سے رسالہ "اردو" میں شائع ہوتا رہا۔

۱۹۸۰ء میں اپنی وفات سے قبل وہ پی ایچ ڈی کے لئے امیر خسرو پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے، مگر موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس کام کی تکمیل نہ ہونے دی۔

اطہر صدیقی

کونسی بزم ہے جس میں ترا چرچا نہ ہوا
روشِ اہلِ وفا تھی کہ تو رسوا نہ ہوا

اُڑ گئیں رونقیں دیوانے کے اُٹھ جانے سے
پھر کوئی بزم میں سرگرمِ تماشا نہ ہوا

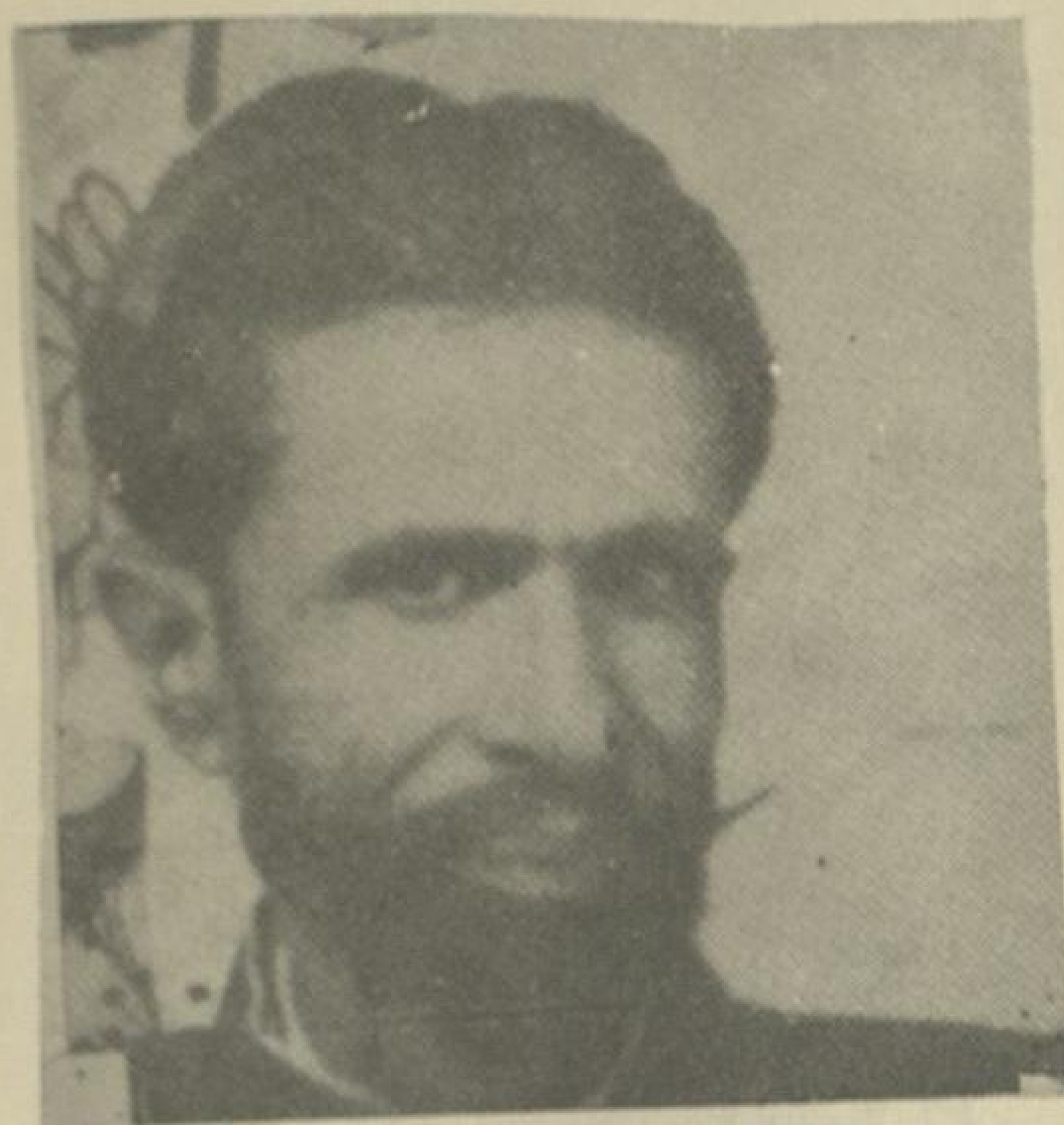
ہم کو منظور غمِ بے کسئِ دل لیکن
وہ ستمگر کسی انداز سے اپنا نہ ہوا

تیرے دم سے رہی آسودگئ قلب و نظر
ہم سے خود شکوۂ نیرنگئ دنیا نہ ہوا

کس محبت سے ترے درد کو چاہا ہم نے
جُز ترے غیر کا احسان گوارہ نہ ہوا

اک تری یاد سے قائم رہا شیرازۂ دل
ورنہ اس بیکسئِ شوق میں کیا کیا نہ ہوا

بندگی ان کی میسّر ہمیں آئی اطہرؔ
جن سے بیمارئ دل کا بھی مداوا نہ ہوا



جعفر طاہر

جعفر طاہر ۲۹ مارچ ۱۹۱۷ء کو، جھنگ کے ایک سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جھنگ شہر میں حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج جھنگ میں داخلہ لیا، مگر بی اے کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کیا۔ بی اے کرنے کے بعد سیّد جعفر طاہر فوج میں بھرتی ہو گئے دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ سنگاپور بھی گئے، ان کی مشہور نظم " واپسی" انہی دنوں کی یادگار ہے۔

۱۹۶۶ء میں فوج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے، کچھ دنوں کے بعد ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے وابستہ ہو گئے، جہاں آپ فوجی پروگرام پیش کرتے رہے۔ راولپنڈی ہی میں آپ کا انتقال ۲۵ مئی ۱۹۷۷ء کو ہوا۔

سیّد جعفر طاہر نے شاعری کا آغاز ۱۹۴۶ء میں کیا، آپ کی پہلی غزل " ادبی دنیا" میں شائع ہوئی، جس کا مطلع تھا :-

کوئے حرم سے نکلے ہے کوئے بتاں کی راہ
ہائے کہاں پہ آکے ملی ہے کہاں کی راہ

آپ ابتداً غزلیں اور نظمیں کہتے تھے، پھر انہوں نے اردو کو ایک نئی صنفِ شعر " کینٹو " سے متعارف کرایا۔ ان کے کینٹوز کا پہلا مجموعہ " ہفت کشور" کے نام سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ جس پر شاعر کو آدم جی انعام ملا۔ سیّد جعفر طاہر کے مذہبی قصائد کا ایک مجموعہ " سلسبیل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جعفر طاہر

نشّے میں چشمِ ناز جو ہنستی نظر پڑی
تصویرِ ہوشیاری و مستی نظر پڑی

لہرائی ایک بار وہ زلفِ خرد شکار
کوئی نہ پھر بلندی و پستی نظر پڑی

اٹھی تھی پہلی بار جدھر چشمِ آرزو
وہ لوگ پھر ملے نہ وہ بستی نظر پڑی

حسنِ بتاں تو آئینۂ حسنِ ذات ہے
زاہد کو اس میں کفر پرستی نظر پڑی

سوئے چمن گئے تھے بہاراں سمجھ کے ہم
دیکھا تو ایک آگ برستی نظر پڑی

کیسی صبا کہاں کی نسیمِ چمن نہ پوچھ
ناگن سی پھول پھول کو ڈستی نظر پڑی

مدت کے بعد اپنی طرف جو گیا خیال
تم کیا ملے کہ صورتِ ہستی نظر پڑی

شبنم کی بوند بوند نے ہنس ہنس کے جان دی
طاہرؔ کرن کرن بھی ترستی نظر پڑی



ساحر عباسی

آپ کا اصل نام معشوق علی اور قلمی نام ساحر عباسی تھا۔ آپ ۳۰ نومبر ۱۹۲۷ء کو امروہہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آزادی کے بعد آپ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آ گئے آپ نے قیام پاکستان کے سلسلے میں تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز رسالہ "ساون" سے بطور مدیر کیا۔ ماہنامہ "بربط" کے مدیر بھی رہے۔ بعد ازاں آپ نے اپنا ذاتی انگریزی اخبار "پائینیر ویکلی" نکالا۔ ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۸ء کراچی مائیکروفون اسٹیشن کے ڈائریکٹر رہے۔ قائداعظم اور قیام پاکستان سے متعلق بننے والی ایک دستاویزی فلم آپ کے تعاون سے تیار کی گئی۔ ۱۹۶۴ء میں آپ نے روس کے دورے پر صحافیوں کے ایک وفد کی قیادت کی۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۸ء کو آپ کراچی میں فوت ہوئے۔ وفات سے پہلے تک آپ پاک عریبین کوآپریٹو بینک لمیٹڈ کراچی کے مینیجنگ ڈائریکٹر تھے۔

آپ کا شعری مجموعہ "ابر صحرا" آپ کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

ساحر عباسی

کس طرح کہیں ہم برق تمہیں کیونکر یہ کہیں سیماب ہیں ہم
مضطر ہو مگر خاموش ہو تم ساکن ہیں مگر بے تاب ہیں ہم

دہرائیں کہانی کیا اپنی سمجھا نہ سمجھ سکتا ہے کوئی
تعبیر نہیں ملتی جس کی وہ ایک پریشاں خواب ہیں ہم

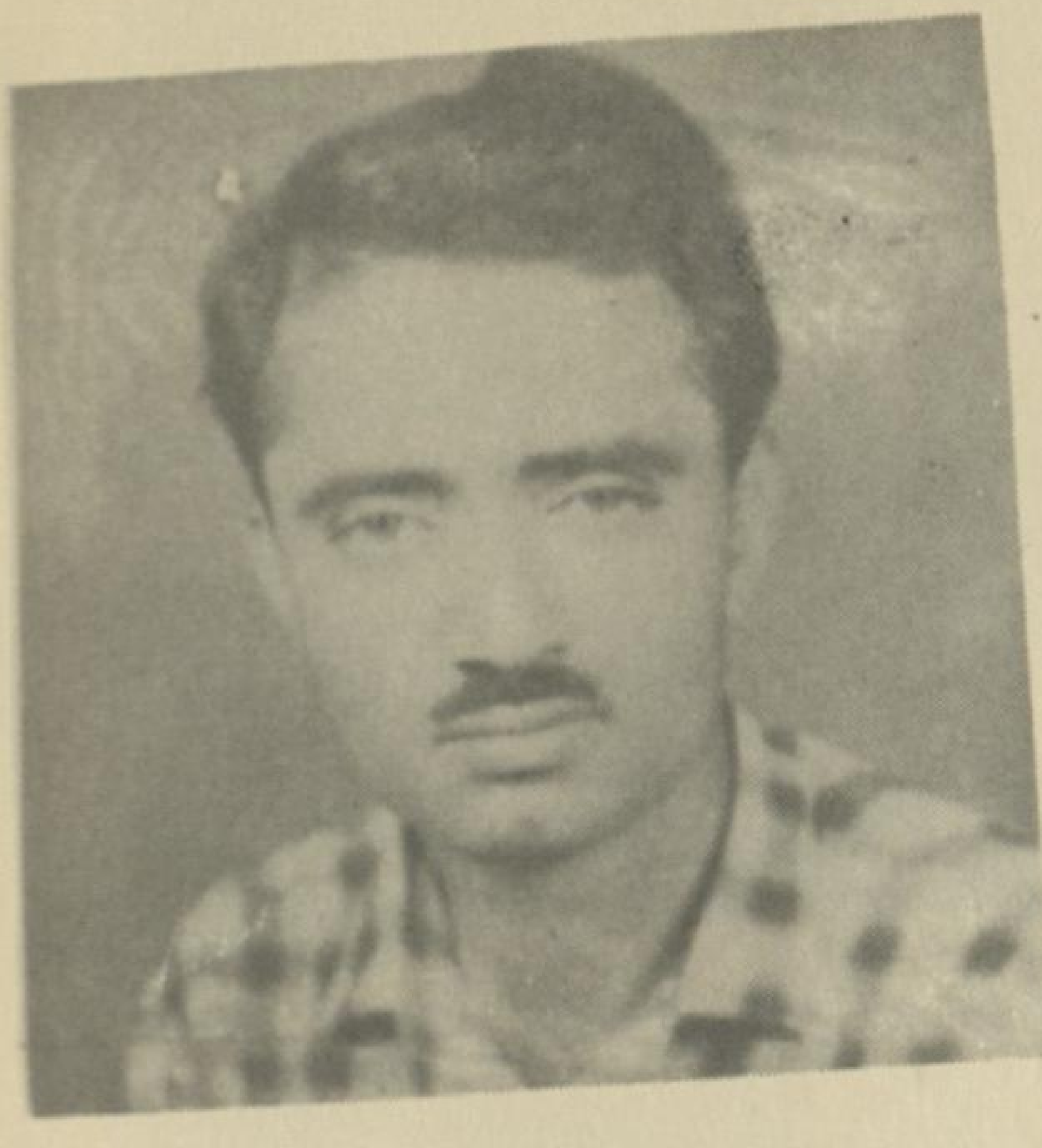
ہم رازِ نہاں ہیں سرتاسر، ہوں فاش زمانے پر کیونکر
ڈھونڈیں نہ ہمیں اربابِ نظر، کمیاب نہیں نایاب ہیں ہم

اللہ رے اپنی بے تابی، اللہ رے اپنی غرقابی!
طوفاں سے کبھی ہمدوش ہیں ہم ساحل پہ کبھی غرقاب ہیں ہم

روتا ہے کوئی رونے والا رہ رہ کے ہمارے پردے میں!
تم ہم کو ربابِ غم نہ کہو اس ساز کی اک مضراب ہیں ہم

دل ڈوب رہا ہے رہ رہ کر عالم ہے عجب کچھ شام و سحر
محسوس یہ ہوتا ہے اکثر جیسے کہ تہہِ گرداب ہیں ہم

آغازِ جنونِ الفت میں خود ہم نے جسے دُہرایا تھا
ساحرؔ اُسی رنگیں قصّے کا غمناک سا اب اک باب ہیں ہم

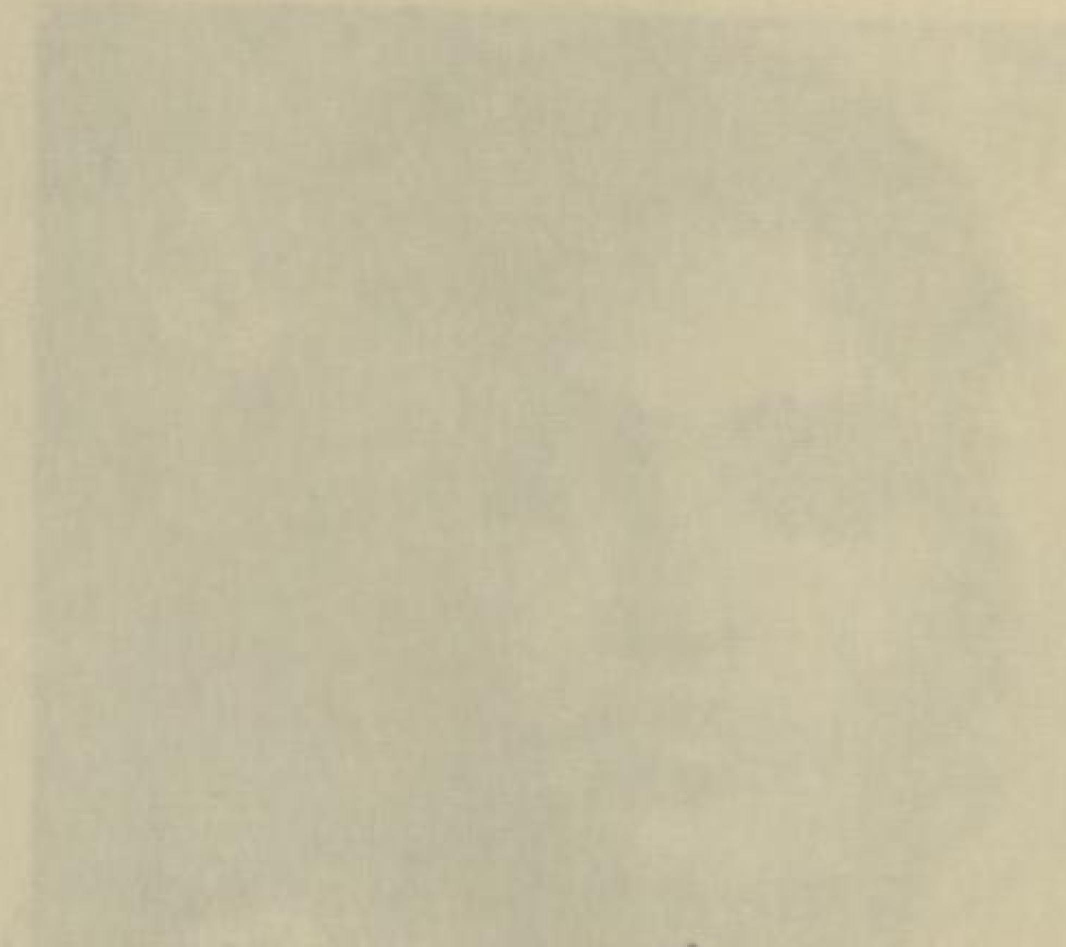


سبط علی صبا

آپ کا اصل نام سید سبط علی اور صباؔ تخلص۔ آپ ۱۱ر نومبر ۱۹۳۵ء کو کوٹلی لوہاراں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم رڑکی (بھارت) اور سیالکوٹ سے حاصل کی کچھ عرصہ تک ملٹری میں ملازمت کی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کھیم کرن کے محاذ پر دفاعی خدمات انجام دیں۔ آخری دنوں تک آپ پاکستان آرڈیننس فیکٹری واہ کینٹ میں ملازم تھے۔ ۱۴ر مئی ۱۹۸۰ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے آپ کا انتقال ہوا۔ جدید اردو شعرا میں صباؔ کا نام خاصا جانا پہچانا تھا۔ آپ کا کلام ملک کے تقریباً تمام ادبی جرائد میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ آپ کا یہ شعر زبانِ زدِ خاص و عام ہے ؎

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

سید سبطِ علی صباؔ



ملبوس جب ہوا نے بدن سے چُرا لئے
دوشیزگانِ صبح نے چہرے چھپا لئے

میں نے تو اپنے جسم پہ زخموں کے آئنے
ہر حادثے کی یاد سمجھ کر سجا لئے

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لئے

میزانِ عدل تیرا جھکاؤ ہے جس طرف
اس سمت سے دلوں نے بڑے زخم کھا لئے

لوگوں کی چادروں پہ بناتی رہی وہ پھول
پیوند اس نے اپنی قبا پر سجا لئے



سعیدہ عروج مظہرؔ

سعیدہ مظہر کا نام ان کے والد سید محمد مرتضیٰ حسین نے مظہر النساء رکھا تھا سعیدہ اُن کی عرفیت تھی۔ سعیدہ حیدر آباد دکن کے ایک علمی گھرانے میں یکم جنوری ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئیں۔ سعیدہ کے خاندان میں علم و ادب کا چرچا تھا چنانچہ آپ کے والد مشہور شاعر و ادیب اور مختلف درسی کتب کے مصنف و مولف تھے شاعری میں نہاںؔ تخلص کرتے تھے والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ آپ بھی شاعرہ تھیں اور کنیزؔ تخلص تھا۔

سعیدہ مظہرؔ نے ابتدائی تعلیم کے بعد نامپلی گرلز سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۹ء میں کالج میں داخلہ لیا۔ بی اے امتیازی نمبروں سے پاس کر کے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد پہنچیں اور فارسی میں ایم اے کا امتحان پاس کیا اور حیدر آباد کے زنانہ کالج میں فارسی کی استاد مقرر ہو گئیں۔

سعیدہ مظہر کی شادی ۱۹۴۷ء میں مشہور صحافی حسن محمود عروج سے ہو گئی اور یوں وہ سعیدہ مظہر سے سعیدہ عروج مظہر ہو گئیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد یہ خاندان کراچی آ گیا۔ سعیدہ مظہرؔ کو بسلسلہ ملازمت گجرات فیصل آباد، جہلم اور راولپنڈی میں بھی رہنا پڑا۔ آخری دنوں میں آپ گورنمنٹ کالج ناظم آباد کے شعبہ اردو سے متعلق تھیں۔ کراچی ہی میں ۲۵ مارچ ۱۹۷۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔

سعیدہ عروج مظہرؔ صرف ایک شاعرہ ہی نہ تھیں بلکہ ایک قابل مترجم، نقاد اور ادیب بھی تھیں۔ ان کی تصانیف میں اندھیرے اجالے، ضیغم، ضمیرِ لالہ، پل صراط نئی صبح، شیریں، افشاں، وحشتِ دل، عالیہ اور شفق سے آگے، کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مجموعۂ کلام ابھی تک طبع نہیں ہو سکا ہے۔

سعیدہ عروج مظہر

سیکڑوں سومنات ہیں مجھ کو نہ کہیے برہمن
خود ہی تراشے بُت پہ بت میری انا کے سوجتن

حاصلِ زندگی ہے کیا ؟ کیا ہے مآلِ فکروفن
روح فقط دُکھی نہیں، دل بھی دُکھی، دُکھی بدن

جن کی شعاعِ چشم سے جلنے لگے ہیں پیرہن
اُن سے زیادہ شہر میں اور ہے کون کم سخن!

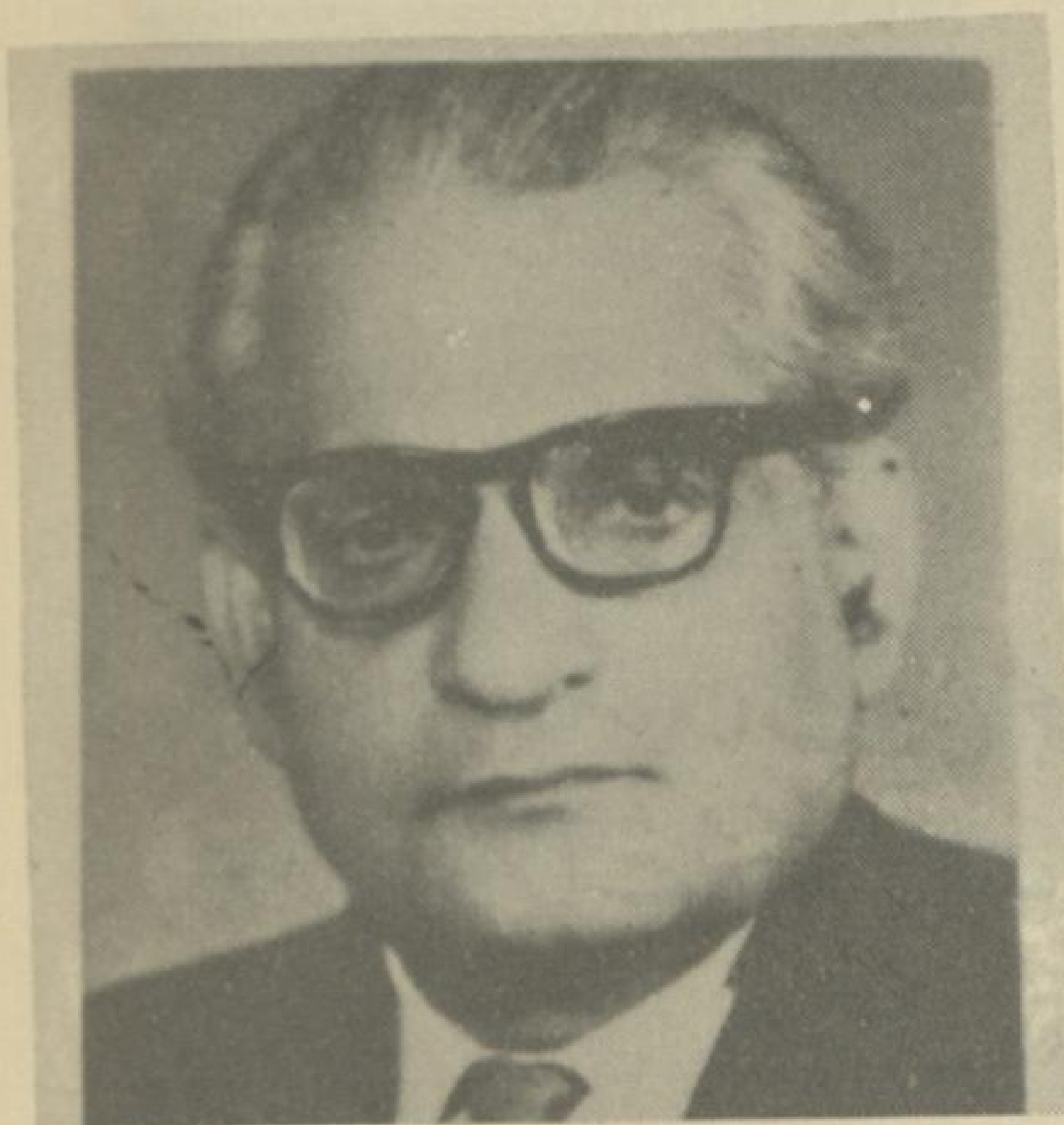
شہر کے اردگرد تو یونہی حصارِ خون ہے
کہیے کہاں کا قصد ہے، رُخ ہے کدھر جنابِ من

سبزۂ و گُل کہاں نہیں، صحرا ہے رشکِ گلستاں
لاکھ وطن سے دُور ہوں، حدِّ نظر میں ہے وطن

مرحلۂ نشاطِ جاں کون کرے گا طے کہو ؟
تم کو سکوت ہے پسند، اپنی تو جان ہے سخن

برق کی رہبری کرے، ہوش کو ہوش کیسے آئے
گردشِ جام بن گئی اُن کی نگاہِ پُر فتن

تیشۂ و سنگ نامُراد، ضبطِ الم ہے بزدلی
دار ہے منظہرِ جنوں، رہ گئی محترم رسن



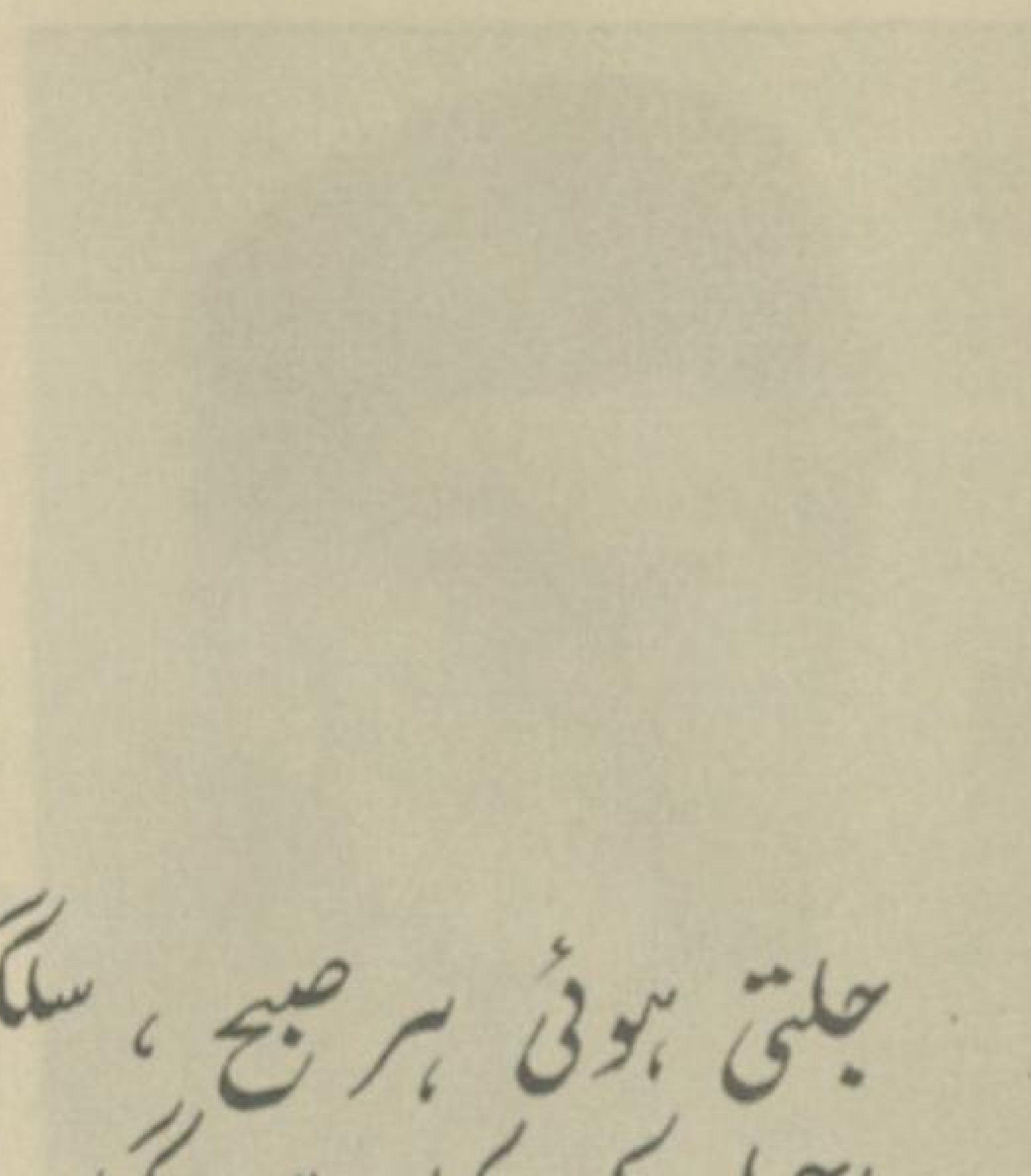
سلطان زبیری

پورا نام سلطان الزماں زبیری تھا مگر ادبی حلقے ان کو سلطان زبیری کے نام سے جانتے تھے، آپ کے والد کا نام عبدالقادر زبیری ہے۔ سلطان زبیری کا آبائی وطن مارہرہ (بھارت) ہے مگر آپ کی پیدائش یکم ستمبر ۱۹۱۹ء کو ریاست جاورہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مارہرہ اور اٹاوہ میں حاصل کی، اس کے بعد آپ علی گڑھ آ گئے جہاں سے آپ نے بی اے، ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کئے۔

سلطان زبیری نے ملازمت کا آغاز ۱۹۴۳ء میں محکمۂ ڈاک سے کیا۔ آپ کچھ عرصہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان پریس سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۷۷ء کو راولپنڈی میں انتقال ہوا۔

آپ کی تصنیف "اسلامی ثقافت اقبال کی نظر میں" آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ مجموعۂ کلام اپنی زندگی میں ترتیب دے دیا تھا جو تا حال اشاعت کا منتظر ہے۔

سلطان زبیری



جلتی ہوئی ہر صبح، سلگتی ہوئی ہر شام
ماحول کو کیا ہو گیا اے گردشِ ایّام

تنہائی سے گھبرا کے سجا لیتے ہیں دل میں
خود اپنے تصوّر کے تراشے ہوئے اصنام

احساس کی نس نس میں ہے تپتا ہوا صحرا
پیڑوں کی گھنی چھاؤں میں ملتا نہیں آرام

کیوں سہمے ہوئے بیٹھے ہیں دیوار کے سائے
کس سوچ میں ڈوبے ہیں مرے گھر کے در و بام

منزل پہ اڑا لایا ہمیں ذوقِ رسائی
راہوں کے خم و پیچ نے پھیلائے بہت دام

ویرانۂ مہتاب سے لوٹ آئے زمیں پر
مٹّی کی محبت سے مہکتے ہوئے اجسام

ساحل پہ خروشندہ رہیں تیز ہوائیں
ہم ریت پہ لکھتے رہے بھولا ہوا اک نام



سیّد آلِ رضا

سید آلِ رضا نام، رضا تخلص۔ آپ ۱۰ جون ۱۸۹۶ء کو قصبہ نیوتنی ضلع اناؤ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید محمد رضا تھے جو اودھ چیف کورٹ کے سنیئر جج تھے۔

آلِ رضا نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں سیتاپور سے انٹرمیڈیٹ کیا جس کے بعد آپ کیننگ کالج لکھنؤ آ گئے۔ ۱۹۱۶ء میں بی اے اور ۱۹۲۰ء میں الٰہ آباد سے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ قیام پاکستان سے قبل پرتاب گڑھ اور لکھنؤ میں پریکٹس کرتے رہے۔ تقسیم کے بعد کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

شعر و سخن کا آغاز پرتاب گڑھ کے قیام کے دوران ہو گیا تھا۔ اسی زمانہ میں خط و کتابت کے ذریعہ آرزوؔ لکھنوی سے تلمذ حاصل کیا۔

سید آلِ رضا کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "نوائے رضا" ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعۂ کلام "غزلِ معلیٰ" ۱۹۵۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد آپ نے بہت کم غزلیں کہیں اور تمام تر توجہ مرثیہ گوئی پر مبذول کر دی۔

۱۹۷۸ء میں کراچی ہی میں انتقال ہوا۔

سیّد آلِ رضا

کھلتے پھولوں کی یہ کہانی دل کو نہ کیوں تڑپائے بہت
شاخوں پر کم رہنے پائے، ہاتھوں میں کمہلائے بہت

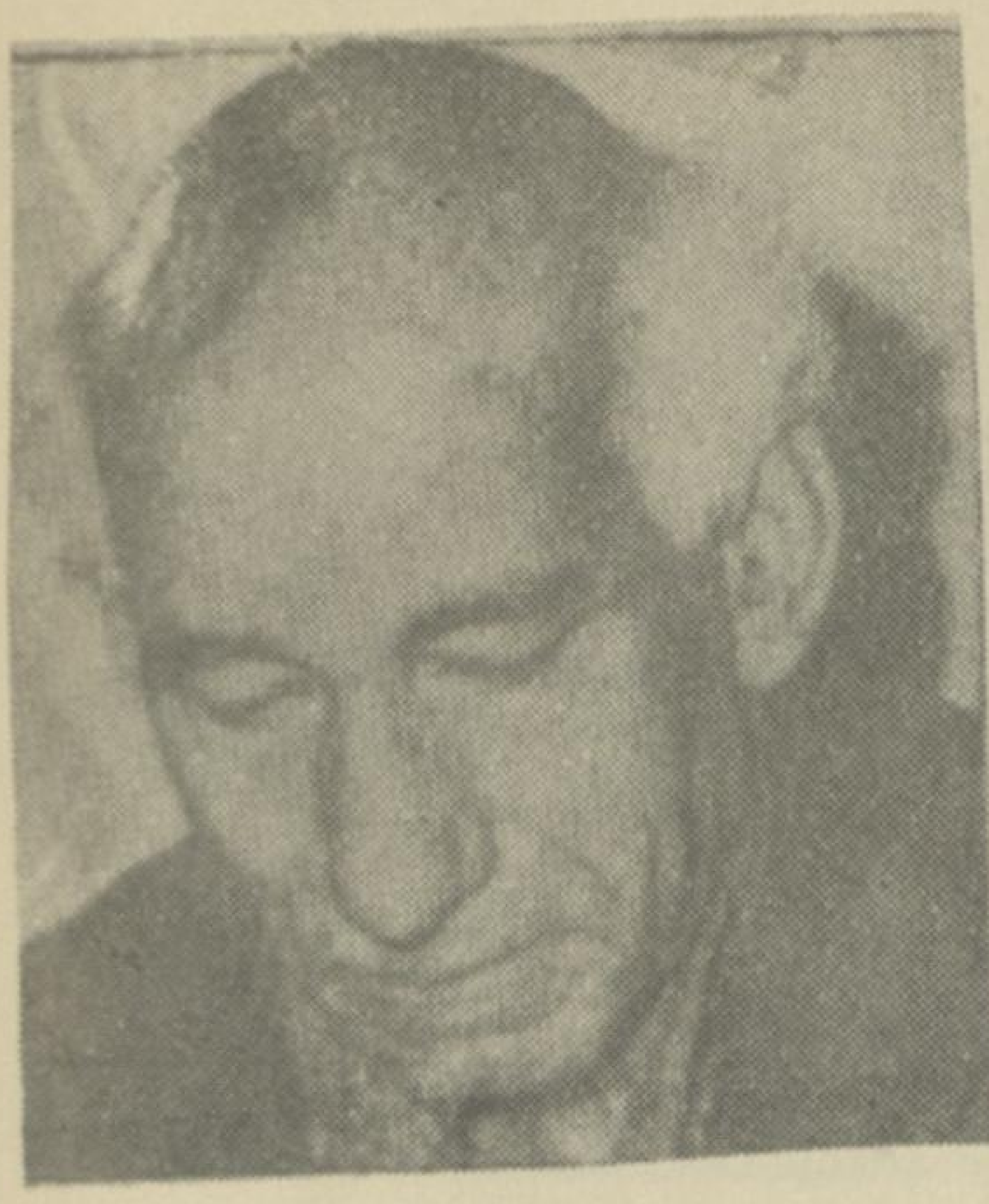
خیر ہمیں کو دل دوبھر تھا، آپ ہی جیتے ہم ہارے
اپنی بات تو اونچی رکھ لی، آپ مگر شرمائے بہت

قسمت کا یہ پھیر بھی دیکھا، بجھنے والی پیاس بڑھی
مٹی ترسی بوند نہ برسی، بادل گھر کر آئے بہت

اپنی اپنی وضع ہے اے دل، کون تنک ظرفوں سے کہے
چادر اور بھی چھوٹی ہوگی، پاؤں اگر پھیلائے بہت

واہ ری ان کی بزمِ حضوری، واہ رے اپنا پاسِ ادب
کہنے کو جائیں تھوڑی سی باتیں، کہنے کو رہ جائے بہت

انسانوں کا عجائب خانہ، ہے تو رضؔا دلچسپ مقام
جس سے بولو، جس کو دیکھو، سمجھے کم سمجھائے بہت



صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم

صوفی غلام مصطفےٰ نام، تبسّم تخلص۔ آپ ۱۹۰۰ء میں امرتسر کے ایک کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مشن ہائی سکول امرتسر میں حاصل کی۔ خالصہ کالج سے ایف اے کرنے کے بعد، آپ لاہور آگئے اور ایف سی کالج سے بی اے کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے (فارسی) کر کے سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی ملازمت اختیار کرلی۔ ۱۹۵۴ء تک صوفی صاحب درس وتدریس کے پیشہ سے وابستہ رہے۔ اس دوران ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے رہے۔

۱۹۵۵ء میں صوفی تبسّم نے ایرانی کلچر سنٹر قائم کیا۔ ۱۹۵۸ء میں آپ ہفت روزہ "لیل و نہار" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ "لیل و نہار" بند ہوا تو صوفی صاحب ریڈیو پاکستان میں اسکرپٹ ایڈوائزر ہو گئے۔ آپ پاکستان آرٹ کونسل کے چیئرمین بھی رہے۔ اور علامہ اقبال اکیڈمی کے نائب صدر بھی منتخب ہوئے۔

صوفی تبسّم کی غزلوں کا مجموعہ "انجمن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بچوں کے لئے جو نظمیں صوفی صاحب نے لکھی ہیں وہ "جھولنے" کے نام سے طبع ہوئی ہیں۔ "انتخابِ کلامِ اقبال" اور "نقشِ اقبال" آپ کے علمی و ادبی کارناموں میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ کا انتقال ۹ فروری ۱۹۷۸ء کو ہوا۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم

نہ رُوبرو کوئی دلبر ، نہ دِلربا منظر
تو پھر یہ کیسے دریچے، یہ کیسے بام ودر

بہک نہ جائے نگہ ، ڈگمگا نہ جائیں قدم
رہِ وفا ہے ، یہاں سے ذرا سنبھل کے گزر

ملیں گے جا کے خدا جانے کس مقام پہ دل
ابھی تو ان کی نظر سے نہیں ملی ہے نظر

ابھی تو دور بہت ہے تجلیٔ رخِ دوست
ابھی تو قدموں سے ابھرا ہے، دامنوں سے ابھر

کبھی جو جھانکنا چاہا، کسی گریباں میں
تو آ پڑی ہے نظر اپنے ہی گریباں پر

ملے گی اشکِ ندامت کی کیا نمی اس کو
کہ زہدِ خشک سے الجھا ہے میرا دامنِ تر

فغاں کی رسم یہاں عام ہو گئی یارو
کہیں سے ڈھونڈ کے لا دو مجھے حدیثِ نظر

یہ بات غم نے مرے کس طرح گوارا کی
طویل رات یہ فرقت کی کٹ گئی کیوں کر

گئے تھے کر کے تبسّم وہ مجھ سے وعدۂ صبح
نہ جانے کون سے لمحوں میں کھو گئی ہے سحر



عزیز احمد

عزیز احمد اردو کے معروف ناول نویس، افسانہ نگار، محقّق، نقاد اور مترجم ہیں۔ انہوں نے شعر بھی لکھے مگر ان کی شاعرانہ شخصیت اُن کے دوسرے ادبی کمالات کے سامنے زیادہ نمایاں نہ ہو سکی۔ عزیز احمد کی شعری کاوشوں کا سلسلہ ان کے دورِ طالب علمی سے کچھ پہلے شروع ہوا۔ جب آپ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پڑھتے تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ عثمانیہ یونیورسٹی ہی میں استاد ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں آپ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ولایت گئے۔ پاکستان آنے سے قبل آپ شہزادی دُرِّ شہوار کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ پاکستان آکر آپ محکمہ ایڈورٹائزنگ فلمز اینڈ پبلی کیشنز میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ عزیز احمد لندن چلے گئے اور وہاں اورنیٹل اسکول لندن یونیورسٹی میں پڑھانے لگے۔ کچھ عرصہ بعد آپ لندن سے کینیڈا چلے گئے۔

۱۹۴۳ء میں ان کی تین اہم منظومات پر مشتمل ایک مجموعہ منظرِ عام پر آیا جس کا نام "ماہِ لقا اور دوسری نظمیں" تھا۔ رحلت سے کچھ قبل عزیز احمد فکرِ سخن میں اپنی جگر کاوی کے باعث ادبی حلقوں میں ایک مرتبہ پھر توجہ کا مرکز بن گئے، اور اِن کے کلامِ آخرِ عمر" بہ سلسلۂ آغوشِ مرگ" کے موضوعات و مضامین مقبولِ خاص و عام ہوئے۔ اس درمیانی مدت میں بھی عزیز احمد کا شعری سفر جاری رہا ہوگا مگر اس زمانہ کی شعری تخلیقات ابھی تک سامنے نہیں آئی ہیں۔

آپ کی اہم تصانیف و تراجم یہ ہیں :-

بوطیقا (ارسطو کی POETICS کا ترجمہ)، رومیو جولیٹ (۱۹۴۱ء)، انتخاب جدید ۱۹۴۳ء کے مقدمات، ترقی پسند ادب (۱۹۴۵ء) اقبال، نئی تشکیل (۱۹۵۰ء) (تنقید) ایسی بلندی ایسی پستی - گریز (ناول)۔

عزیز احمد

چھلکی جو مے تو بن کے شرر گونجتی رہی
مینا سے تا بہ ساغرِ زر گونجتی رہی

بادل کی سی گرج تھی یہ دنیا کہیں جسے
جو درمیانِ شمس و قمر گونجتی رہی

تھی جو دعا وہ ابر کے دامن میں چھپ گئی
جو بد دعا تھی بن کے اثر گونجتی رہی

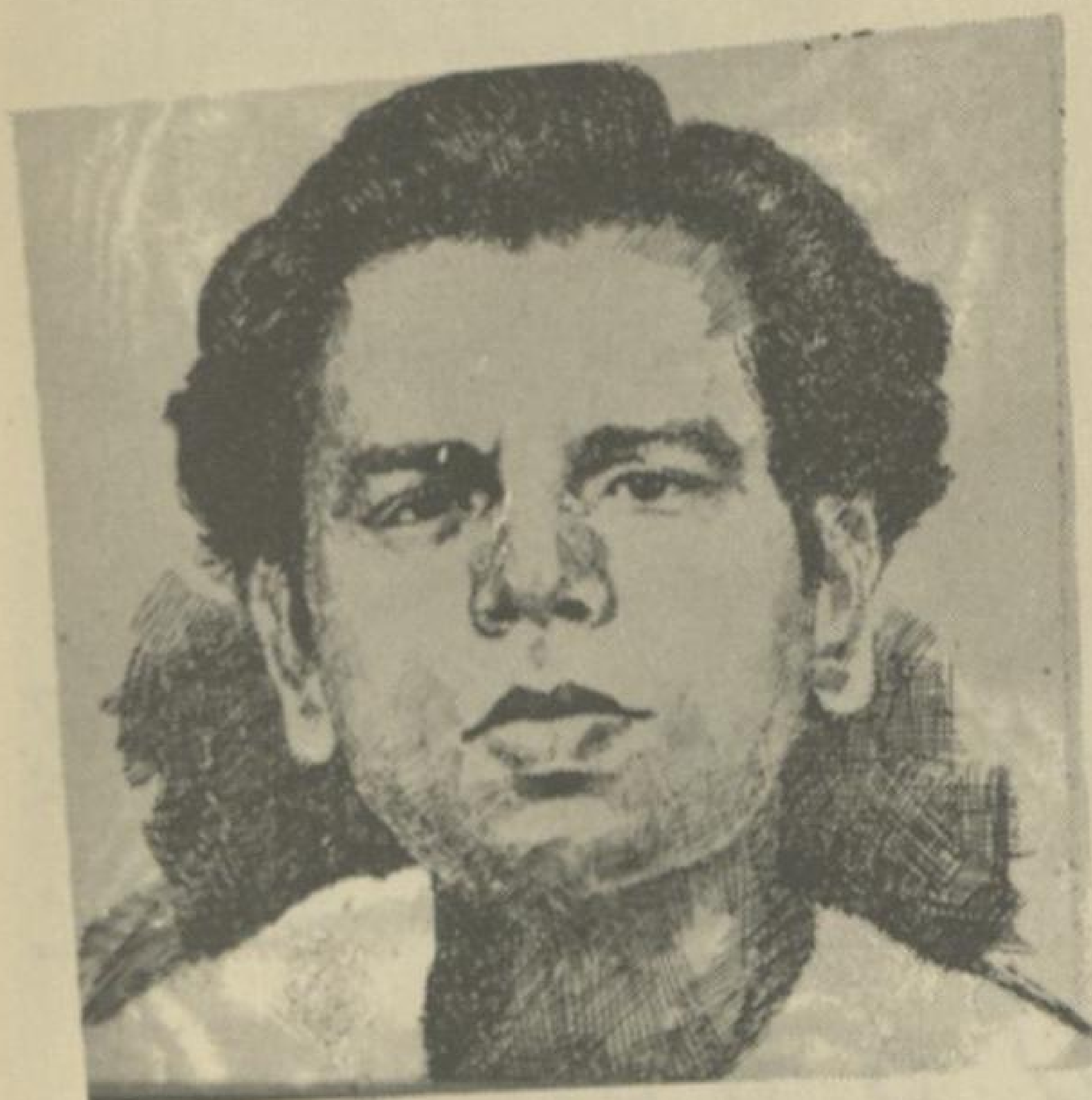
آئی خزاں، طیور تو جتنے تھے اڑ گئے
نغموں سے پھر بھی شاخِ شجر گونجتی رہی

آغوشِ شب میں پھول تو مرجھا کے گر گئے
صحنِ چمن میں بادِ سحر گونجتی رہی

تھا کون اجنبی کہ جو آیا چلا گیا
صدیوں تلک اسی کی خبر گونجتی رہی

فریادِ دل کسی کے دبائے نہ دب سکی
جب کٹ گئی زباں تو نظر گونجتی رہی

سمجھے تھے ہم خموش تھی اپنے قدم کی چاپ
کیا جانے کیوں یہ راہ گزر گونجتی رہی



فرید جاوید

فرید جاوید کا پورا نام فرید الدین تھا۔ آپ کے والد مجید الدین کا تعلق سہارن پور (بھارت) سے تھا۔ فرید جاوید ۱۹۲۷ء میں وہیں پیدا ہوئے اور قیامِ پاکستان کے بعد اپنے اہلِ خاندان کے ہمراہ یہیں آبسے۔

فرید جاوید تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے۔ انتقال کے وقت آپ گورنمنٹ کامرس کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدہ پر کام کر رہے تھے۔

آپ کی وفات بمقام کراچی، ۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء کو ہوئی۔

فرید جاوید

ناشگفتہ کلیوں میں شوق ہے تبسّم کا
بار سہہ نہیں سکتیں دیر تک تلاطم کا

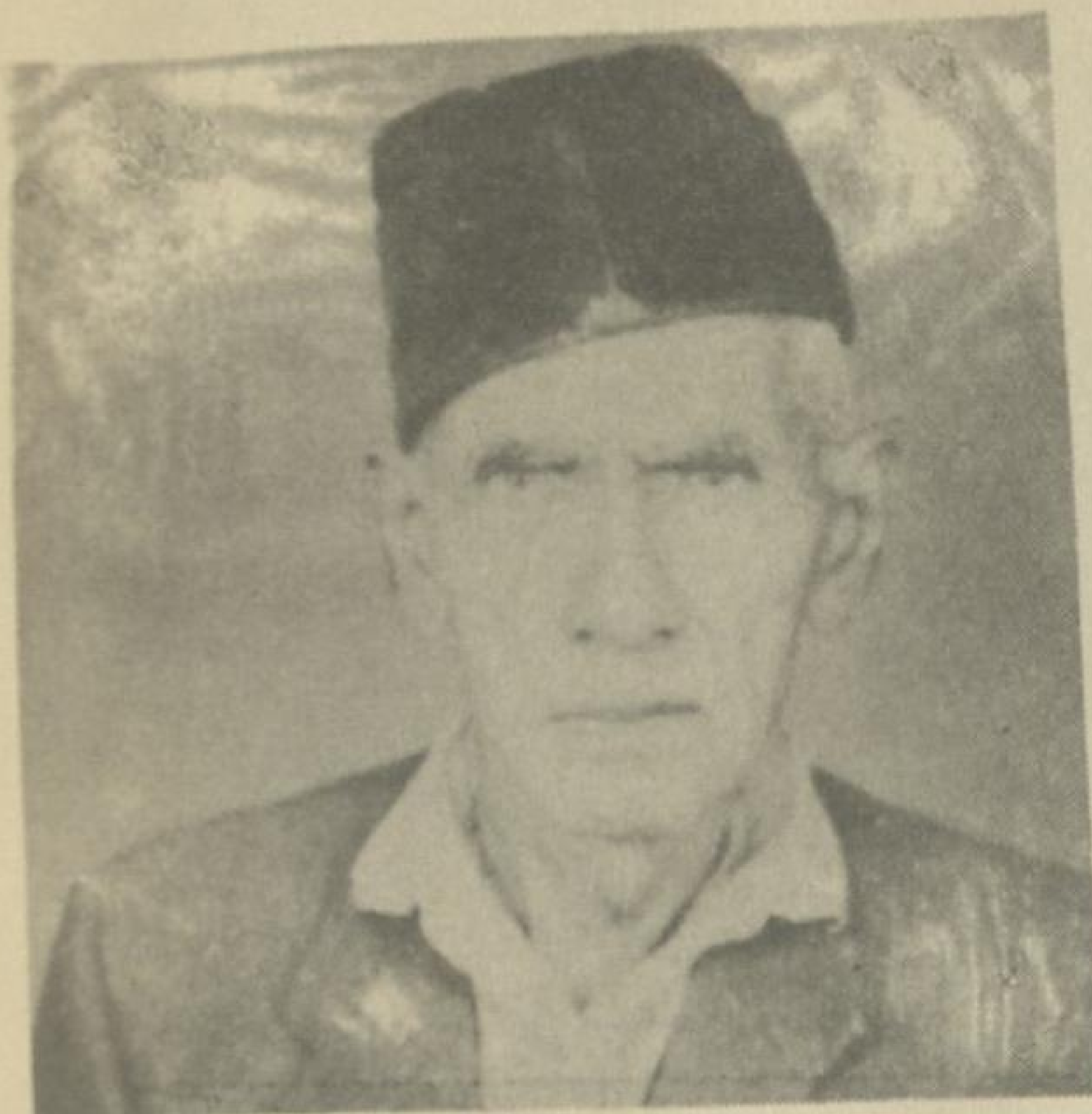
جانے کتنی فریادیں ڈھل رہی ہیں نغموں میں
چھڑ رہی ہے دکھ کی بات نام ہے ترنّم کا

کتنے بے کراں دریا پار کر لئے ہم نے
موج موج میں جن کی زور تھا تلاطم کا

اے خیال کی کلیو اور مسکرا لیتیں
کچھ ابھی تو آیا تھا رنگ سا تبسّم کا

گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلّم کا

حسرت و محبت سے دیکھتے رہو جاویدؔ
ہاتھ آ نہیں سکتا حسن ماہ و انجم کا



کلیم جلیسری

اصل نام کلیم اللہ۔ کلیمؔ جلیسری کے نام سے شہرت پائی۔ جلیسر ضلع ایٹہ (بھارت) آپ کے بزرگوں کا وطن ہے مگر کلیمؔ ایک مدّت سے نوشہرہ میں قیام پذیر تھے اور سرحد میں کلاسیکی شاعری کے نمائندہ سمجھے جاتے تھے۔ کلیمؔ جلیسری نے اپنی عمر کے پچاس برس شعرگوئی میں صرف کئے۔ ۱۹ جون ۱۹۸۰ء کو نوشہرہ ہی میں انتقال ہوا۔

کلیمؔ ایک قلندر صفت انسان تھے، ساری زندگی عسرت میں گذاری مگر کسی کے ہاتھ اپنے فن کو فروخت نہیں کیا۔ مرحوم نواب محمدؐ فرید خاں، والئی امبؔ نے بارہا دربار میں طلب کیا اور خلعت سے نوازا۔ اس کے علاوہ کئی ممتاز صنعت کار حضرات نے ان کو اپنے ہاں بلانے کی پیش کش کی مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔

نوشہرہ میں ان کی چھوٹی سی تمباکو کی دکان برسوں شاعروں کا مرکز بنی رہی، جہاں علاّمہ سیماب اکبرآبادی، جگر مرادآبادی، علاّمہ تاجور نجیب آبادی، رسؔا بریلوی، حفیظ جالندھری، احسان دانش اور عبدالحمید عدمؔ جیسے مشاہیر شعراء بار بار قدم رنجہ فرماتے رہے۔

آپ نے اپنی دفات سے قبل، اپنے بعض احباب کے کہنے پر اپنے کلام کا انتخاب "چراغِ طور" کے نام سے کیا تھا۔ جو تاحال شائع نہیں ہوا ہے۔

کلیم جلیسری

نئی دُنیا نئے مہمان ہوں گے ہم نہیں ہوں گے
ہزاروں عیش کے سامان ہوں گے ہم نہیں ہوں گے
کچھ ایسے بھی یہاں انسان ہوں گے ہم نہیں ہوں گے
نہ ثابت جیب نے دامان ہوں گے ہم نہیں ہوں گے

ہماری قبر پر رونق رہے گی بعدِ مردن بھی
ہزاروں حسرتیں ارمان ہوں گے ہم نہیں ہوں گے

دعائے مغفرت کو آئیں گے احباب میّت پر!
یہ ان کے کس قدر احسان ہوں گے ہم نہیں ہوں گے

برا وہ بھی کہیں گے پھر جو اب اچھا سمجھتے ہیں
کچھ ایسے بھی یہاں نادان ہوں گے ہم نہیں ہوں گے

ہمارے ایک اٹھ جانے سے رونق اٹھ نہیں سکتی
کسی کے سینکڑوں دربان ہوں گے ہم نہیں ہوں گے

ہزاروں زندگی پر موت کی بازی لگائیں گے
ہزاروں موت پر قربان ہوں گے ہم نہیں ہوں گے

کہیں گے بعد مردن مجھ کو اچھا تھا خدا بخشے
کچھ ایسے صاحبِ ایمان ہوں گے ہم نہیں ہوں گے

کہیں گے دور سے وہ ہے کلیمؔ زار کی تربت!
کچھ ایسے صاحبِ عرفان ہوں گے ہم نہیں ہوں گے



ماہرالقادری

ماہرالقادری کا تاریخی نام منظور حسین ہے جس سے آپ کا سن پیدائش ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء برآمد ہوتا ہے۔ ماہر کے والد کا نام محمد معشوق علی تھا جو اپنے گاؤں کے پہلے شاعر، نثرنگار اور انگریزی داں تھے۔ آپ کا تخلص ظریف تھا۔ ماہرالقادری کا آبائی وطن کیسر کلاں ضلع بلند شہر ہے جو علی گڑھ سے تیس میل دور ہے۔

مولانا ماہر کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں ہوئی۔ فارسی کی تعلیم انہوں نے اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ ماہر نے ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں عربی ادب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کیا۔ ماہر نے شاعری کا آغاز ۱۹۲۲ء میں کیا۔ ان کی پہلی غزل کا مطلع یہ تھا:

نالے جو سُنے میں نے گلشن میں عنادل کے
پھر زخم ہوئے تازہ ارمان بھرے دل کے

ماہر نے اپنی ادبی زندگی کا اہم زمانہ حیدرآباد میں بسر کیا جہاں آپ کی ادبی صلاحیتوں کی بڑی قدر ہوئی۔ مولانا کو حکومتِ دکن کے مختلف محکموں میں کام کرنے کے مواقع بھی میسر آئے۔ اس دوران آپ نے اپنے شعری ذوق کو جاری رکھا۔ ۱۹۳۳ء میں آپ بجنور چلے گئے۔ اور وہاں روزنامہ "مدینہ" کی مجلسِ ادارت میں شامل ہوگئے۔ کچھ عرصہ بجنور مقیم رہنے کے بعد مولانا دوبارہ حیدرآباد دکن آگئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ماہرالقادری ۱۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو کراچی آئے اور یہاں سے اپنا علمی و ادبی ماہنامہ "فاران" جاری کیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء کو مولانا ماہرالقادری نے وفات پائی۔

شاعری میں غزل کے علاوہ ماہرالقادری نے نعت کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے مولانا کی نعتیں، اردو کی نعتیہ شاعری میں مستقل قدر و قیمت کی حامل ہیں۔

ماہرالقادری

اُن کی خوشی یہی ہے تو اچھّا یونہی سہی
اُلفت کا نام آج سے دیوانگی سہی

ہر چند نامراد ہوں پھر بھی ہوں کامیاب
کوشش تو کی ہے کوششِ برباد ہی سہی

غنچوں کے دل سے پُوچھئے لُطفِ شگفتگی
بادِ صبا پہ تہمتِ آوارگی سہی

جب چھڑ گئی ہے کاکُلِ شب رنگ کی غزل
ایسے میں اک قصیدۂ رخسار بھی سہی

ماہر سے اجتناب نہ فرمائیں اہلِ دل
اچھّوں کے ساتھ ایک گنہگار بھی سہی